پروفیسر ڈاکٹر دلدار احمد قادری

پیراماؤنٹ پبلیشنگ انٹرپرائز
۱۵۲/او، بلاک نمبر۲، پی۔ای۔سی۔ایچ۔ایس، کراچی ۷۵۴۰۰
فون: ۴۳۱۰۰۳۰ فیکس: ۴۵۵۳۷۷۲
ای میل: paramount@cyber.net.pk

قرآن کے سائنسی معجزے

مصنف : پروفیسر ڈاکٹر دلدار احمد قادری

اشاعتِ اوّل : اکتوبر ۲۰۰۲ء

پیش کش : اقبال صالح محمد

تعداد : ایک ہزار (۱۰۰۰)

کمپوزنگ : عمران خان

ناشر و طابع : پیراماؤنٹ پبلیشنگ انٹرپرائز، کراچی

تقسیم کار : پیراماؤنٹ پبلیشنگ انٹرپرائز

۱۵۲/او، بلاک نمبر۲، پی۔ای۔سی۔ایچ۔ایس، کراچی ۷۵۴۰۰

فون: ۴۳۱۰۰۳۰ فیکس: ۴۵۵۳۷۷۲

ای میل: paramount@cyber.net.pk

آئی۔ایس۔بی۔این : 969-494-122-9

فہرست

دیباچہ

قرآن مجید سائنس کی کتاب نہیں بالکل اُسی طرح جس طرح یہ مثلاً قانون یا تاریخ کی کتاب نہیں ہے۔ لیکن اس میں کثرت سے ایسی آیات موجود ہیں جس میں سائنسی معنویّت (Scientific connotation) پائی جاتی ہے۔

زیرِ نظر کتاب ''قرآن کے سائنسی معجزے'' میں اسی نوعیّت کی تقریباً ساڑھے تین سو آیات کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ جیسا کہ اوپر اشارہ ہوا ہے، قرآن مجید میں سائنسی معنویت کی حامل آیات کی تعداد بہت زیادہ ہے (ایک حساب کے مطابق ساڑھے سات سو سے زیادہ)۔ تاہم میں نے اپنی تحقیق کے لئے صرف انہی آیات کا انتخاب کیا ہے جن کی سائنسی معنویت بہت واضح ہے اور جو کسی بہت گہرے غور و فکر کے بغیر ہی ایک سرسری مطالعے سے آنکھوں کے سامنے آجاتی ہیں۔

قرآن کتابِ ہدایت ہے اور چاہتا ہے کہ انسان اپنے خالق کو پہچانے، اس کی معرفت حاصل کرے اور اپنے فکروعمل کو اُس کی منشاء کے مطابق ترتیب دے۔ لیکن انسان کی مجبوری یہ ہے کہ اُس کے پاس جو ذرائعِ علم موجود ہیں یعنی حواس، عقل اور وجدان۔ وہ کسی بھی طور پر ذاتِ باری تعالیٰ کا ادراک، تعقل اور احساس نہیں کرسکتے لہٰذا انسان جو کچھ کرسکتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ کائنات (اور اس کے مظاہر :Phenomena) کا مشاہدہ و مطالعہ کرے اور چونکہ کائنات اللہ کی تخلیق ہونے کی نسبت سے اُس کی صفات کی مظہر ہے لہٰذا کائنات کے مطالعے کا معنی ہے اس کے خالق کی صفات کی جلوہ گری کا مشاہدہ، اور یہ وہ چیز ہے جو اپنے دیکھنے والے کی توجہ خود خالق کی طرف لے کر جاسکتی ہے۔ ٹھیک یہی منشاء ہوتا ہے قرآنِ مجید کا جب وہ جگہ جگہ مختلف کائناتی مظاہر کو خالقِ کائنات کی ہستی اور قدرت کی نشانیاں قرار دیتا ہے اور چاہتا ہے کہ لوگ ان میں غور و فکر کریں اور بالآخر اس نتیجہ پر پہنچیں کہ کوئی ہے جو اس کارخانۂ قدرت کے پیچھے کارفرما ہے۔

دوسرے یہ کہ قرآنِ مجید کا طریقۂ کار یہ ہے کہ وہ اپنی بات زبردستی مسلط نہیں کرتا بلکہ دلیل سے سمجھاتا ہے۔ جب وہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس کائنات کا ایک خُدا ہے تو اپنے اس دعوے کی حقانیت کے ثبوت میں وہ کائنات اور

کائناتی مظاہر کو دلیل کے طور پر پیش کرتا ہے:

> ''کیا یہ لوگ اونٹوں کی طرف نہیں دیکھتے کہ کیسے پیدا کئے گئے ہیں۔ اور آسمان کی طرف کہ کیسا بلند کیا گیا ہے۔ اور پہاڑوں کی طرف کہ کس طرح کھڑے کئے گئے ہیں۔ اور زمین کی طرف کہ کس طرح بچھائی گئی ہے۔ پس آپ نصیحت کرتے رہیں۔ بے شک آپ نصیحت کرنے والے ہی ہیں، آپ ان پر داروغہ نہیں ہیں۔'' (الغاشیہ، 88:17-22)

چنانچہ، قرآن مجید کا طریقہ زور زبردستی سے نہیں بلکہ دلیل سے منوانا ہے اور ظاہر ہے کہ دلیل وہی دی جاتی ہے جو مخاطب کے لئے قابلِ فہم ہو۔ چونکہ کائنات اور اس کے مظاہر ایسی چیزیں ہیں جو ہر ایک کے لئے یکساں طور پر کھلے ہوتے ہیں کہ وہ ان کا مشاہدہ اور مطالعہ کر سکے، لہٰذا قرآن مجید کثرت سے ان سے استدلال کرتا ہے۔ لہٰذا قرآن کا قاری اس میں کثرت سے ایسی آیات پاتا ہے جن میں انسان کو کائنات اور اس کے مظاہر میں غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے۔ یہ وہ چیز ہے جو قرآنی آیات کے سائنسی مطالعے کی بنیاد ہے۔

قرآنی آیات میں موجود سائنسی معنویت (Scientific connotation) کو سمجھنے کی کوشش کرنا نہ صرف علمی و تحقیقی اعتبار سے بہت اہم ہے بلکہ اس سے کہیں بڑھ کر اس کی دعوتی اور تبلیغی اہمیت ہے۔ جدید سائنسی پیش رفتوں نے دینِ حق کے لئے امکانات و مواقع کا ایک نیا میدان کھول دیا ہے، دُنیا سکڑ کر گویا ایک ہی گھر کے صحن کا نقشہ پیش کر رہی ہے، تہذیبیں بڑھتی ہوئی شدت سے ایک دوسرے کے ساتھ باہمی عمل (Interaction) کر رہی ہیں۔ مکالمے کا ایک وسیع ماحول موجود ہے۔ ان حالات میں انتہائی ضروری ہے کہ قرآنِ مجید کو وقت کی بلند ترین علمی سطح پر سمجھا جائے اور دُنیا کے سامنے اُس کے ذہنی معیار اور سطح کے مطابق پیش کیا جائے۔

قرآن مجید اتنے گونا گوں علوم و موضوعات کو touch کرتا ہے کہ کسی ایک انسان کے لئے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ پورے قرآن کی یکساں علمی و تحقیقی معیار پر تشریح کر سکے۔ خصوصاً آج کے دور میں جب کہ علم ایک زبردست سیلاب کی طرح بڑھ اور پھیل رہا ہے۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ مختلف علوم (مثلاً سائنس، عمرانیات، معاشیات، سیاسیات، انسانیات (Anthropology)، اثریات (Archeology)، اخلاقیات، فلسفہ، تاریخ، قانون وغیرہ وغیرہ اور ان کی ذیلی شاخوں اور مزید ذیلی شاخوں) کے ماہرین اپنے اپنے تخصص (specialization) اور مہارت کے شعبوں کے لحاظ سے قرآن مجید کے متعلقہ مقامات پر گہری تحقیق کریں۔ یہی وہ کام ہے جس کی اس وقت شدید ضرورت ہے مگر افسوس کہ یہی کام نہیں ہو رہا۔

اس کتاب میں آیات کی جو تشریح کی گئی ہے وہ ایک ابتدائی نوعیت کا کام ہے جو آئندہ تحقیق کرنے والوں کے لئے بنیاد کا کام دے سکتا ہے۔ کسی آیت کی ایسی تشریح کرنا جسے ہر اعتبار سے مکمل اور حتمی کہا جاسکے، ظاہر ہے کہ ممکن نہیں ہے۔ ''پھر قرآن وہ کتاب ہے جس کی تفسیر خود وقت اور زمانہ کرتا ہے'' (حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ) لہٰذا وقت گزرنے کے ساتھ جیسے جیسے علم میں اضافہ ہوتا جائے گا قرآنی آیات کی معنویت کے نئے نئے پہلو نگاہوں کے سامنے آتے جائیں گے۔

میں نے آیات کے مفہوم کے تعین میں اپنی بساط کے مطابق کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی لیکن بہر حال یہ ایک انسانی کاوش ہے اور انسانی کام میں غلطی اور کمی کا امکان ہر وقت رہتا ہے۔ لہٰذا قارئین سے یہ درخواست کی جاتی ہے کہ وہ اپنی آراء سے نوازنے میں وسعتِ قلبی کا مظاہرہ کریں اور اپنے قیمتی وقت میں سے کچھ لمحات اس مقصد کے لئے ضرور نکالیں۔

کتاب کا اسلوب یہ ہے کہ اسے سورت وار طور پر ترتیب دیا گیا ہے۔ ہر آیت کا سادہ ترجمہ کیا گیا ہے اور اس میں موجود سائنسی اعتبار سے نمایاں نکات کی مختصر تشریح دی گئی ہے۔ کتاب کی تحریر کے دوران فہم عامہ کو مدنظر رکھتے ہوئے دقیق سائنسی مباحث اور علمی تفصیلات سے احتراز کیا گیا ہے۔ کتاب کا یہ مقصد بھی نہیں تھا کہ کسی آیت کی مکمل تشریح و تفسیر کی جائے اور نہ یہ ممکن تھا۔

میں اُمید کرتا ہوں کہ اُن لوگوں کے لئے جو اس موضوع پر آئندہ کام کریں گے یا جو قرآن مجید کو سائنسی طور پر سمجھنا چاہتے ہیں ان کے لئے یہ کام ایک ''حوالے کی کتاب'' (Reference Book) کا کام کرے گا۔

آخر میں میں محترم حاجی اقبال صالح محمد صاحب کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جن کی ذاتی دلچسپی سے یہ کتاب آپ کے ہاتھوں میں پہنچ سکی ہے۔ اقبال صاحب ایک خدا ترس، علم دوست اور دردِ دل رکھنے والے انسان ہیں اور جدید ترین علمی، سائنسی اور فکری سطح پر قرآن مجید کے فہم کو عام کرنے کی شدید تڑپ رکھتے ہیں۔

اس موقع پر سلیم بھائی، (ڈیزائنر،کمپوزر) عمران خان، اور دیگر رفقائے کار کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری ہے جن کی محنت سے یہ کتاب اتنے عمدہ گیٹ اپ میں شائع ہوئی ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ وہ اس کام کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے اور اسے میرے لئے اور ان تمام دوستوں کے لئے جنھوں نے اس پر کسی نہ کسی اعتبار سے کام کیا ہے، اُخروی نجات کا ذریعہ بنائے۔

وما توفیقی الا باللہ

پروفیسر ڈاکٹر دلدار احمد قادری

اَلَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّکُمْ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○ (2:22)

وہی جس نے تمہارے لئے زمین[1] کو بچھونا[2] اور آسمان کو چھت[3] بنایا، اور آسمان[4] سے پانی اُتارا اور اس سے تمہارے لئے پھل پیدا کئے[5]۔ پس نہ ٹھہراؤ اللہ کے لئے مدِمقابل اس حال میں کہ تم جانتے ہو۔

1۔ ارض و سما کا معنیٰ:

''زمین'' کے لئے عربی میں لفظ ''ارض'' استعمال ہوتاہے۔مگر''ارض'' کے معنی میں بڑی وسعت ہے۔ بنیادی طور پر''ارض'' کا معنی ہے ہر وہ چیز جو انسان کے قدموں کے نیچے ہے، یا کسی چیز کا نیچے کا حصہ۔

اسی طرح ''سماء'' جس کا ہم عام طور پر معنی ''آسمان'' کرتے ہیں اپنے معنی میں بہت وسعت رکھتا ہے۔ اس کا بنیادی معنی ہے ہر وہ چیز جو انسان کے سر کے اوپر ہو،یا کسی چیز کا اوپر کا حصہ۔''ارض''اور''سماء'' ایک دوسرے کے مقابل استعمال ہوتے ہیں۔ ''ارض'' میں بنیادی تصور ''پستی'' کا ہے جبکہ ''سماء'' میں بنیادی تصور بلندی کا ہے۔

''سماء'' اسم جنس ہے جو واحد اور جمع دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔بعض کے نزدیک یہ''سماء ۃ'' کی جمع ہے جس کے معنی چھت کے ہیں۔

''سماء'' کا لفظ کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً ہمارے سروں کے اوپر کی ''فضا (atmosphere)''، بادل،افق، وہ نیلی ''چھت'' جو زمین سے نظر آتی ہے، (گھر کی) چھت، کائناتی خلاء (cosmic space)، سماوی اجرام (Heavenly bodies) وغیرہ۔

قرآن مجید میں یہ اُن معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے جن معنوں میں آج ہم لفظ کائنات (universe) استعمال کرتے ہیں۔ یہ روحانی یا ما بعد الطبیعاتی دنیا (Spiritual or Metaphysical world) کے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے۔ بنیادی تصور وہی بلندی کا ہے چاہے طبیعاتی بلندی ہو یا روحانی، معنوی اور ذہنی۔

آیت کے سیاق و سباق (context) سے بہ آسانی پتہ چل جاتا ہے کہ وہاں لفظ ''سماء'' کس مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔

2۔''فراش'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کا معنی ہے ''بچھونا''، وہ چیز جو اس لئے بچھائی جائے کہ اس پر آرام کیا جائے۔ اس کا مطلب ہے کہ زمین کو ایسا بنایا گیا ہے کہ اس پر انسان اور دوسرے جاندار زندگی گزار سکیں۔ مثلاً اس کو نرمی اور سختی کے درمیان ایک اعتدالی کیفیت پر رکھا گیا ہے، نہ بہت سخت، پتھریلی اور سنگلاخ ہے اور نہ بہت نرم اور دلدلی ہے۔

زمین خلاء میں تیزی کے ساتھ مختلف قسم کی حرکات (محوری حرکت، مداری حرکت اور دوسری اقسام کی حرکتیں)جاری رکھے ہوئے ہے مگر اس انداز سے کہ ہمیں اس کا احساس بھی نہیں ہوتا۔

زمین کی ساخت و بناوٹ ، اس کا سورج سے فاصلہ غرض اس کی ہر چیز ایسی ہے کہ اس پر انسان آرام سے رہ سکتا ہے۔

زمین کی اوپری سطح(قشرارض، Earth Crust)حقیقتاً ایک فرش اور بچھونے کی طرح بچھی ہوئی ہے۔ زمین کا اندرونی حصہ سخت گرم اور پگھلے ہوئے مادے کا بنا ہوا ہے، جس میں حملی روئیں (Convectional Current s) چلتی رہتی ہیں۔

ارضیاتی عمل(Geological process) سے زمین کی اوپری سطح ٹھوس ہوگئی اور ایک طرح سے فرش کی طرح بچھ گئی اور رفتہ رفتہ اس قابل ہوگئی کہ جاندار اس پر زندگی بسر کرسکیں۔

زمین کے فرش کی طرح بچھے ہوئے ہونے کا یہ تقاضا نہیں کہ وہ چپٹی ہو بالکل اُسی طرح جس طرح اس پر بلند و بالا پہاڑوں کا ہونا اُس کے کروی(گول) ہونے کے منافی نہیں۔

3۔''بناء'' کا معنی ہے جو چیز کہ تعمیر کی جائے۔ یہ عمارت، چھت، اور خیمہ وغیرہ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ یہاں یہ لفظ''فراش'' کے مقابل استعمال ہوا ہے۔''فراش'' نیچے بچھی ہوئی چیز کو کہتے ہیں لہٰذا ''بناء'' کا معنی ہوگا وہ چیز جو ہمارے سروں پر چھائی ہوئی ہو جیسے چھت یا خیمہ وغیرہ۔

یہاں ''سماء'' (آسمان) فضائے آسمانی یعنی کرۂ ہوائی (Atmosphere) کے معنی میں معلوم ہوتا ہے جو کہ ایک غلاف کی طرح زمین کو گھیرے ہوئے ہے اور زمین کے لئے بمنزلہ چھت کے ہے اور جو زمین کو بیرونی آفات، آسمانی پتھروں (شہابیوں، Meteorites)، خطرناک شعاعوں (مثلاً بالا بنفشی شعاعیں، (Ultravoilet rays) اور کائناتی شعاعیں،(Cosmic rays)سے بچاتی اور سورج کے مقناطیسی اثرات سے تحفظ دیتی ہے۔

اس کے لئے قرآن پاک نے ایک اور مقام پر''محفوظ چھت'' کے لفظ استعمال کئے ہیں۔(سورہ انبیا،21:23)

نرم اور پُرسکون بچھونے اور محفوظ چھت کی تعبیر کتنی عمدہ اور کتنی غور طلب ہے۔ ان کے بغیر یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ انسان زمین پر اطمینان سے زندگی بسر کرسکے۔ لہٰذا انسان کے لئے ضروری ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اس نعمت پر شکر بجالائے۔ انسانوں میں اللہ کی معرفت اور احساس تشکر کا فروغ قرآن کا بنیادی مقصد ہے۔

4۔یہاں ''سماء'' (آسمان)، بادل، اوپر کی سمت، یا بلندی یا ہمارے سروں پر موجود اُس فضا کے معنوں میں ہے جہاں بادل اُڑتے پھرتے ہیں اور جہاں سے بارش ہوتی ہے۔ زیادہ امکان یہی ہے کہ یہاں بادل ہی مراد ہیں۔ ایسی صورت میں معنی ہوگا۔''بادل سے بارش برسائی''

قرآن چاہتا ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی قدرت کی معرفت حاصل کرے اور ان نعمتوں کو پہچانے جو اللہ تعالیٰ نے اُسے عطا کی ہیں۔
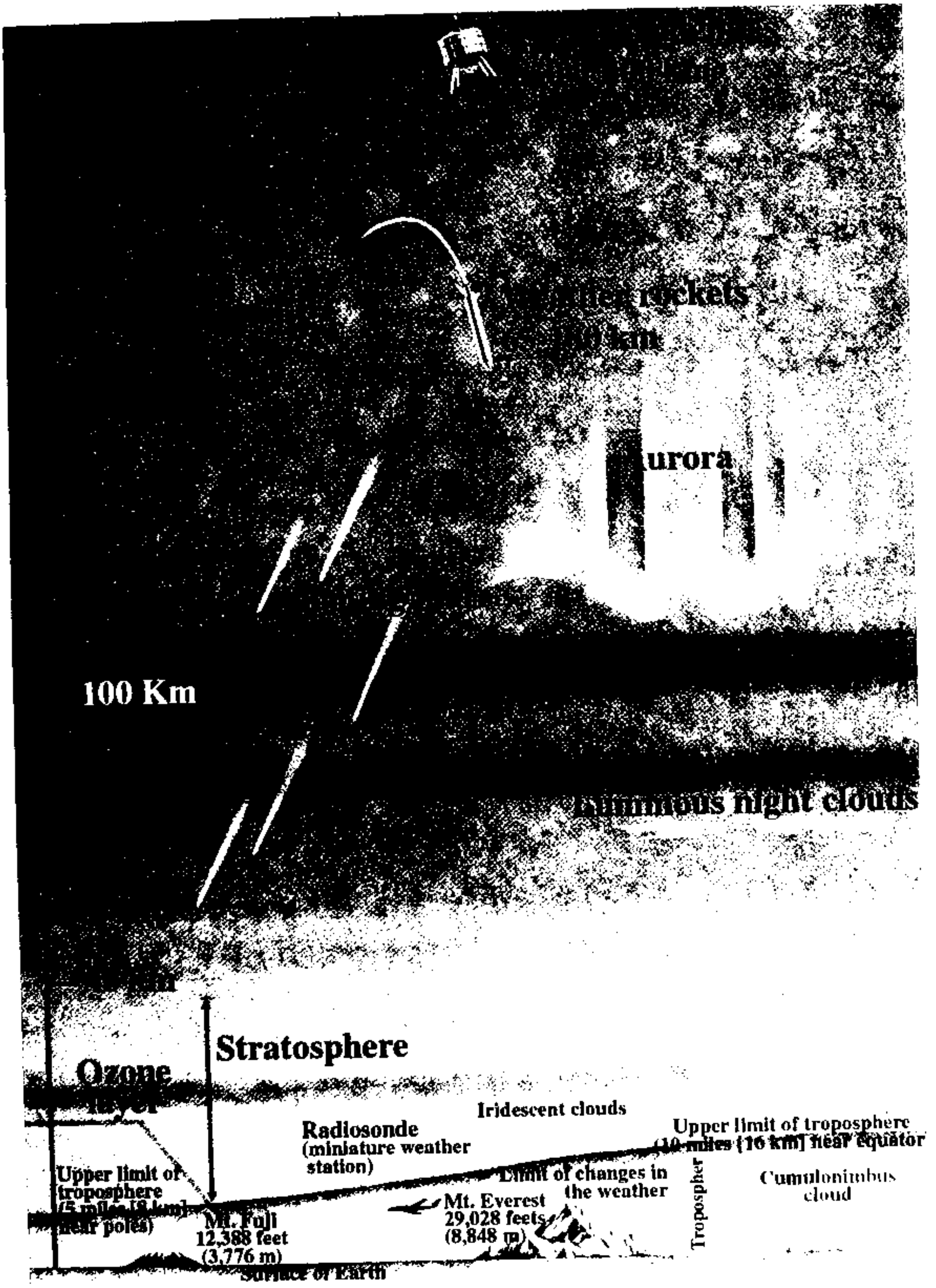
زمین کے کرّہ ہوائی کی مختلف پرتیں۔

یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا کرشمہ ہے کہ اُس نے زمین پر بسنے والے جانداروں (انسان،حیوانات، نباتات) کے لئے میٹھے پانی (Fresh water) کی فراہمی کا عظیم نظام قائم کیا ہے۔

سورج کی روشنی جب سمندروں(اور دوسرے آبی ذخیروں) کی سطح پر پڑتی ہے تو پانی بخارات میں تبدیل ہوکر اوپر اُٹھتاہے۔ (اس عمل کو

تبخیر(Evaporation) کہتے ہیں۔ پانی کے بخارات فضا میں جمع ہوتے ہیں اور بالآخر بادل بنادیتے ہیں۔ بادل ہواؤں کے نظام کے ذریعے ایک جگہ سے دوسری جگہ حرکت کرتے ہیں اور عمل ترسیب (Precipitation) کے ذریعے بارش یا برف وغیرہ کی شکل میں برستے ہیں۔ ان سب مظاہر میں خالق کائنات کی قدرت کی عظیم نشانیاں موجود ہیں۔

5۔ پانی زندگی کی بنیادی شرط ہے۔ یہ نباتات(طرح طرح کے پودے، یعنی فصلیں، سبزیاں اور پھل وغیرہ) کے اُگنے کا ذریعہ بنتا ہے۔
جن سے انسان(اور حیوانات) غذا حاصل کرتے ہیں۔
غذا کے علاوہ پودے انسان کی بہت سی دوسری ضروریات کو بھی پورا کرتے ہیں۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًاۗ ثُمَّ اسْتَوٰۤی اِلَی السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍؕ (2:29)

وہی[1] ہے جس نے زمین کی ساری چیزیں تمہارے لئے پیدا کی ہیں۔ مزید براں[2]، آسمانوں (کی تخلیق) کا قصد کیا(اپنے ارادہ سے)[3] تو بہترین طور پر[4] انھیں سات[5] آسمان بنایا۔

1۔ آیت کریمہ میں اللہ کی قدرت کا بھی اظہار ہے اور انسان پر اللہ کی نعمتوں کا بھی، اللہ ہی ہے جس نے زمین کی تمام چیزیں انسان کے لئے پیدا کی ہیں اور اسی نے آسمانوں کو تخلیق کیا ہے۔

2۔ اصل میں لفظ ''ثم'' استعمال ہوا ہے۔ جو کبھی زمانی ترتیب کے اظہار کے لئے استعمال ہوتا ہے (یعنی تراخیِ زمان کے لئے)، کبھی ترتیب بیان کے لئے، کبھی کسی بات پر زور دینے کے لئے وغیرہ۔

اردو میں عام طور پر ثم کا معنی ''پھر'' کیا جاتا ہے لیکن یہ ثم کی معنویت کو پوری طرح بیان نہیں کر پاتا اور بعض اوقات تو مفہوم کچھ سے کچھ ہوجاتا ہے۔(تفصیل کے لئے دیکھیں راقم کی کتاب ''کائنات قرآن اور سائنس'')۔

قرآن مجید کی دیگر آیات سے مقابلہ کرنے سے بخوبی واضح ہوجاتا ہے کہ یہاں ''ثم'' یہ بیان کرنے کے لئے استعمال ہوا ہے کہ زمین کی ساری چیزیں بھی اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہیں اور آسمانوں کی تخلیق بھی اُسی نے کی ہے۔ (مثال کے طور پر دیکھیں بیضاوی، تفسیر کبیر زیر نظر آیت کے ذیل میں)۔ اس مفہوم کو اردو میں ''مزید براں''، ''پھر یہ کہ'' یا ''مزید یہ کہ'' وغیرہ کے لفظوں سے بیان کیا جاسکتا ہے۔ ہم نے عبداللہ یوسف علی کے '' Moreover'' کی پیروی میں ''مزید براں'' کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔

3۔''استویٰ الیٰ'' کے الفاظ قصد کرنے، اور متوجہ ہونے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ لہٰذا یہاں لفظی مطلب ہے آسمانوں کی تخلیق کا قصد اور اللہ کا قصد کرنا اُس کے ارادہ سے ہے لہٰذا معنی ہوگا:

''اُس نے آسمانوں پر اپنے ارادۂ تخلیق کا اطلاق کیا''۔

یعنی آسمانوں کی تخلیق کے اپنے ''منصوبہ'' کو عملی شکل دی، انھیں تخلیق کیا۔

4۔اصل میں لفظ استعمال ہوئے ہیں''فسوّٰھن'' :''سویٰ'' کا معنی ہے کسی چیز کو ٹھیک ٹھیک ایسا بنانا جیسا کہ اُسے اُس کے مقصدِ تخلیق کے اعتبار سے ہونا چاہئے۔ یعنی موزوں، مناسب اور ہر قسم کی کجی سے پاک بنانا۔ آیت کا معنی ہوگا:

آسمانوں کو ہر قسم کی کجی سے پاک ٹھیک ٹھیک ایسا بنایا جیسا کہ انھیں بنایا جانا چاہیے تھا۔

ترجمہ میں یہ بات پوری طرح منعکس نہیں ہورہی، ہم نے اس کا مفہوم ادا کرنے کے لئے''بہترین طور پر بنایا'' کے لفظ استعمال کئے ہیں۔

5۔''سات آسمان'' کا لازمی معنی یہ نہیں کہ آسمان گنتی کے لحاظ سے سات ہیں۔ کیونکہ عربی زبان میں''سبع ''(سات) کا عدد کثرت کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ (یعنی عددِ تکثیری کے طور پر)۔ اس اعتبار سے معنی ہوگا۔

''کئی آسمان''،''بہت سے آسمان'' وغیرہ۔

اور ممکن ہے کہ یہ کائنات کی وسعتوں کے لئے کنایہ ہو۔

بَدِيۡعُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ وَ اِذَا قَضٰۤى اَمۡرًا فَاِنَّمَا يَقُوۡلُ لَهٗ كُنۡ فَيَكُوۡنُ ○ (2:117)

وہ آسمانوں اور زمین کا وجود میں لانے والا ہے[1]۔اور جب وہ کسی امر کا فیصلہ کرلیتا ہے تو بس اُس کے لئے فرما دیتا ہے کہ ''ہو جا'' تو وہ ہوجاتا ہے[2]۔

1۔''بدیع'' ،''بدع'' کے مادے سے ہے اس کا معنی ہے:کسی شے کو عدم سے وجود میں لانا اور بغیر کسی مادہ اور مثال کے ایجاد کرنا۔ اسی سے بدعت کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں دین میں کوئی ایسی چیز ایجاد کرنا جس کے لئے کوئی نظیر اور کوئی ماخذ و مصدر نہ ہو۔

یہ آیت اس حقیقت کا اظہار کر رہی ہے کہ کائنات عدم سے وجود میں آئی ہے۔ ماضی میں ایک خاص لمحے یہ وجود میں آئی اس سے پہلے یہ نہیں تھی۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کے جدید دور میں سائنسی سطح پر بھی شواہد مل رہے ہیں۔

جدید دور میں سائنسی سطح پر یہ حساب لگایا گیا ہے کہ تقریباً 15 ارب سال پہلے یہ کائنات وجود میں آئی۔ اس تصور کو عظیم انفجار کا نظریہ یعنی (Big Bang Theory) کا نام دیا جاتا ہے۔

الغرض، کائنات کا ایجاد ہونا، یعنی ایک وقت خاص پر وجود میں آنا ایک سائنسی حقیقت ہے جس کا انکشاف قرآن مجید نے چودہ سو سال پہلے کیا۔

2۔اللہ تعالیٰ کے ''ہوجا'' کہنے کا معنی:

اللہ تعالیٰ کے ''کن'' (ہوجا) کہنے کا یہ مطلب نہیں کہ یہ حکم ''لفظوں'' میں دیا گیا ہے۔ بلکہ یہ ایک ایسا حکم جسے اصطلاح میں تکوینی حکم یعنی Creational Command کہا جاتا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا کسی چیز کو وجود میں لانے کا ارادہ کرنا اور اس چیز کا اللہ کے ارادہ کے مطابق بالکل اُس طرح وجود میں آنا جس طرح کہ اللہ کا ارادہ چاہتا ہے۔

اس کا یہ معنی نہیں کہ اللہ کے ارادہ سے لازماً کوئی چیز یک لخت آناً فاناً وجود میں آتی ہے۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جیسا ارادہ کرتا ہے شے اُسی طرح وجود میں آتی ہے اور اُتنے ہی وقت میں وجود میں آتی ہے جتنے وقت میں اللہ کا ارادہ اُسے وجود میں لانا چاہتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر وہ یہ ارادہ فرمائے کہ کائنات (آسمان و زمین) چھ ادوار میں تدریجی طور پر وجود میں آئے تو بغیر کمی بیشی کے وہ اُسی مدت میں وجود میں آئے گی۔

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۪ وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ۝ (2:164)

بے شک[1] آسمانوں[2] اور زمین[3] کی خلقت اور رات اور دن کے ایک دوسرے کے پیچھے چلے آنے[4] اور اُن کشتیوں[5] میں جو لوگوں کے لئے سمندر میں نفع بخش سامان لے کر چلتی ہیں، اور اس پانی میں جو اللہ نے بادل سے اُتارا[6] اور جس سے زمین کو اُس کے مردہ ہوجانے کے بعد زندگی بخشی اور جس سے اُس میں ہر قسم کے جاندار پھیلائے[7] اور ہواؤں کی گردش میں[8] اور اُن بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے

درمیان مسخر ہیں[9]، اُن لوگوں کے لئے بہت سی
نشانیاں ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں[10]۔

1۔ یہ آیت کریمہ قرآن مجید کی اُن بہت سی نمایاں آیتوں میں سے ایک ہے جن میں اُن لوگوں کو جو ''عقل سے کام لیتے ہیں'' قرآن یہ دعوت دے رہا ہے کہ وہ کائنات اور اس کے مظاہر میں موجود اللہ کی قدرت کی نشانیوں پر توجہ دیں۔ قرآن وہ کتاب ہے عقل کو دباتی نہیں بلکہ اُبھارتی ہے، اور جو سوچنے سمجھنے اور غور وفکر کرنے کی صلاحیت کو سلاتی نہیں بلکہ جگاتی ہے۔ قرآن یہ چاہتا ہے کہ لوگ ذہنی صلاحیتوں کا پورا پورا استعمال کریں۔ یہ وہ حقیقت ہے جس پر حدیث میں بھی بہت زور دیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے:

العقل اصل دینی (عقل میرے دین کی جڑ ہے)

اس آیت کریمہ میں کم از کم آٹھ کائناتی نشانیوں کی طرف انسان کی توجہ واضح طور پر مبذول کرائی گئی ہے۔

(الف) کائنات (آسمانوں اور زمین) کی تخلیق
(ب) رات اور دن کی گردش کا نظام
(پ) کشتیوں کا چلنا (بحری سفر)
(ت) بارش کا برسنا
(ٹ) مردہ زمین کا زندہ ہونا (بنجر اور بے آب و گیاہ زمین سے نباتات کا اُگنا)
(ث) جانداروں کی تخلیق اور اُن کا بکثرت پھیلاؤ
(ج) ہواؤں کی گردش
(چ) بادلوں کا فضا میں معلق ہونا اور حرکت کرنا

2۔ ''آسمانوں اور زمین'' کے الفاظ وہ مفہوم دے رہے ہیں جس میں آج ہم لفظ کائنات (Universe) استعمال کرتے ہیں جو کہ کہکشاؤں، ستاروں اور دیگر اجرام پر مشتمل ہے۔

کائنات میں انگنت کہکشائیں ہیں، ہر کہکشاں میں ان گنت ستارے ہیں۔ ہم جس کہکشاں میں ہیں اُسے انگریزی میں ''ملکی وے'' (Milky
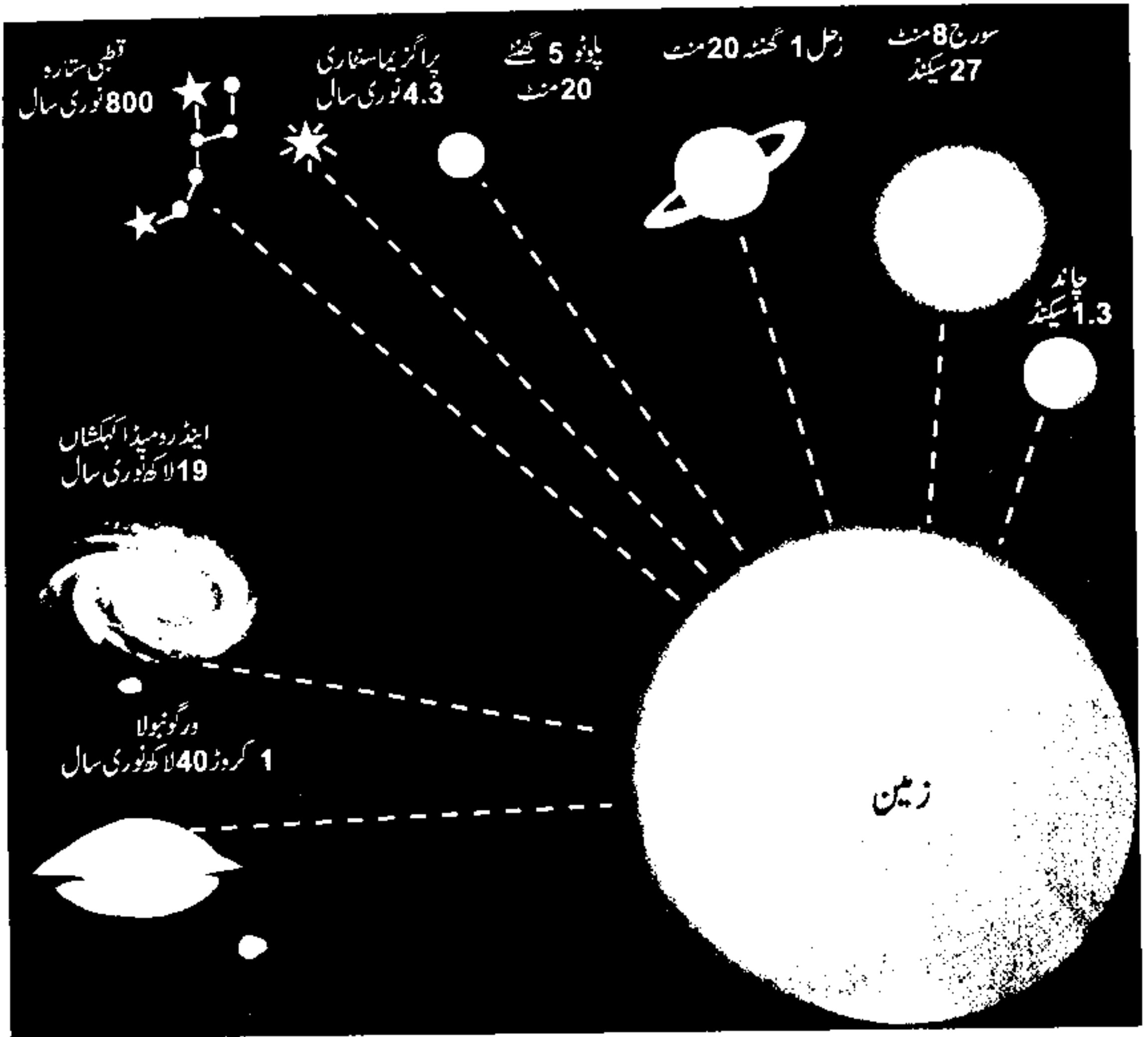
زمین سے فاصلے (روشنی کی رفتار کے لحاظ سے)

Way، دودھیا راستہ، راہ شیری) کہا جاتا ہے۔ اس میں تقریباً چار ارب ستارے ہیں۔ ہمارا سورج اپنی جسامت کے اعتبار سے ایک درمیانے درجے کا ستارہ ہے۔ اس کے گرد نو سیارے (Planets) گردش کررہے ہیں۔

کسی کہکشاں میں ستارے ایک دوسرے سے بہت طویل فاصلوں پر ہوتے ہیں۔ جن کی پیمائش کے لئے نوری سال (Light Year) کی اکائی بھی چھوٹی پڑجاتی ہے (ایک نوری سال وہ فاصلہ ہے جو روشنی ایک سال میں طے کرتی ہے جبکہ روشنی کی رفتار تین لاکھ کلو میٹر فی سیکنڈ ہے)

ہماری اس گفتگو سے کائنات کی وسعت کا ہلکا سا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

3۔زمین کی ساخت و بناوٹ، اس کی کمیّت (مقدارِ مادہ، Mass) اس کی جسامت، اس کا سورج سے فاصلہ، اس کی مداری (یعنی سورج کے گرد) گردش، اس کا محوری (یعنی اپنے محور کے گرد) گردش، اس کی اپنے مدار پر 23 درجے کا

جھکاؤ، اس پر موجود وہ تمام حالات جن کے نتیجے میں اس پر زندگی کی بقا اور نشوونما کا دارومدار ہے، یہ تمام تر پہلو اہل فکر کے لئے اپنے اندر غور و فکر کا وسیع سامان رکھتے ہیں۔

4۔ رات اور دن کی گردش کا نظام اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمتوں میں سے ایک ہے۔''اختلاف'' کا لفظ ''خلف'' سے بنا ہے اس کا معنی ہے پیچھے آنا، جانشین ہونا وغیرہ۔ رات اور دن مسلسل طور پر ایک دوسرے کے پیچھے لگے آتے ہیں۔ رات دن کی جانشین بنتی ہے اور دن رات کا جانشین بنتا ہے۔

اگر یہ رات اور دن کا نظام نہ ہوتا تو زمین پر زندگی قائم نہ رہ سکتی بلکہ وجود میں ہی نہ آسکتی۔ اگر صرف رات ہوتی اور دن نہ ہوتا تو زمین کا درجہ حرارت اتنا کم ہوتا کہ اس کی سطح یخ ٹھنڈی ہوتی اور زمین کا سارا پانی برف کی شکل میں ہوتا۔ اور اگر زمین پر صرف دن ہوتا، رات نہ ہوتی تو زمین کا درجہ حرارت بہت زیادہ ہوتا اور یہ امکان ہی نہ ہوتا کہ اُس پر زندگی وجود میں آئے۔ پانی بخارات کی شکل میں ہوتا۔ زمین کی سطح بری طرح تپ رہی ہوتی۔

یہ اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ، علم محیط اور حکمتِ بالغہ کا کرشمہ ہے کہ نہایت موزوں طور پر رات اور دن کا یہ نظام قائم کیا ہے جو جانداروں کی بقا اور نشوونما کے ساتھ مکمل مناسبت رکھتا ہے۔

زمین پر رات اور دن کا نظام
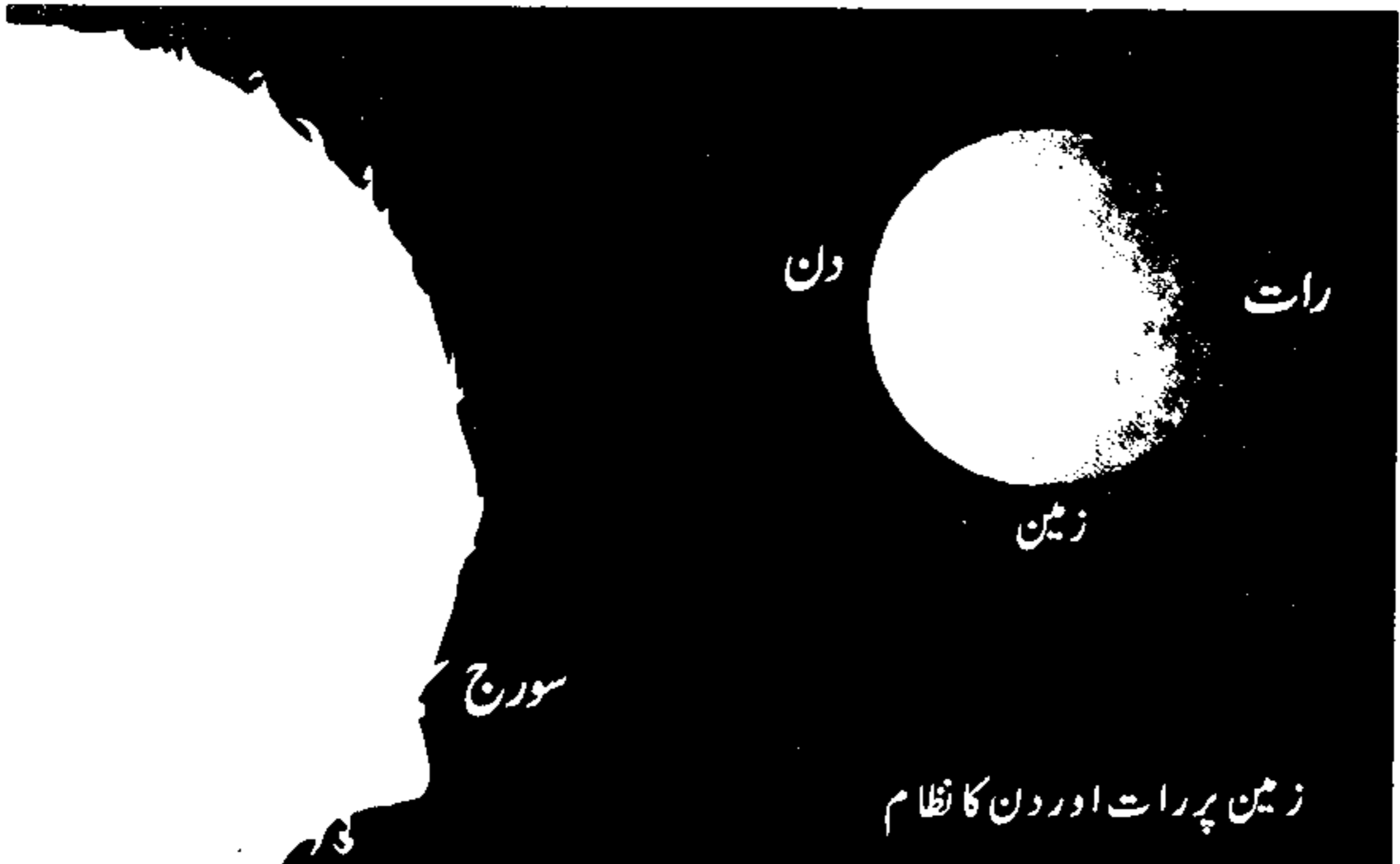
رات اور دن کا نظام زمین کی محوری گردش سے تعلق رکھتا ہے۔ زمین جب اپنے محور پر گردش کرتی ہے تو اس کا وہ حصہ جو سورج کے سامنے آتا ہے وہاں

روشنی ہوتی ہے اور وہ دن کہلاتا ہے۔ اور جو حصہ مخالف سمت میں ہوتا ہے وہاں اندھیرا ہوتا ہے اوراُسے رات کہتے ہیں۔ زمین چونکہ ایک تسلسل کے ساتھ محوری گردش کررہی ہے لہٰذا رات اور دن تسلسل کے ساتھ ایک دوسرے کے آگے پیچھے چلتے چلے جاتے ہیں۔ رات آہستہ آہستہ غائب ہوتی جاتی اور اُس کی جگہ دن آہستہ آہستہ نمودار ہوتا جاتا ہے۔

علاوہ ازیں، زمین کی محوری گردش کی رفتار ایسی ہے کہ رات اور دن کا دورانیہ زمین کے جانداروں کے حسبِ حال ہے۔ یہ نہ بہت لمبے ہیں اور نہ بہت چھوٹے۔

5۔کشتیوں کا پانی کی سطح پر چلنا بھی اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت ہے۔

انسان کو اللہ تعالیٰ نے تخلیقی صلاحیت دی ہے کہ جس کی بنا پر اُس نے یہ سیکھا کہ سمندروں (اوردریاؤں وغیرہ) کو آمدورفت اور نقل و حمل (Transportation) کے لئے کس طرح بروئے کار لایا جاسکتا ہے۔

پانی کی خصوصیات [مثلاً سیالیّت،(Fluidity)، اُس کی کثافت (Density) وغیرہ] پانی کو اس قابل بناتی ہیں کہ اُس پر چیزیں تیر سکیں۔ (جن چیزوں کی کثافت پانی سے کم ہوگی وہ اس پر تیریں گی)۔ اس طرح، انسان نے کشتی (چھوٹے بڑے بحری جہاز) بنائی اور پانی کی سطح پر اُس کو چلانے کے لئے مختلف طریقے سوچے اور کام میں لائے۔

دورِ جدید میں بحری سفر کی اہمیت میں بہت اضافہ ہوگیا ہے۔ چھوٹی کشتیوں کے علاوہ بہت بڑے جہاز، بحری بیڑے اور آبدوزیں وغیرہ لاکھوں کی تعداد میں سمندروں میں چل رہی ہیں اور انسانوں اور اُن کے سامان کو ایک مقام سے دوسرے مقام پر پہنچانے کا کام کررہی ہیں۔

بعض جہاز اور بحری بیڑے اتنے بڑے ہیں کہ اُن پر گویا بڑے بڑے شہر آباد ہیں، اُن پر ہوائی اڈے بنے ہوئے ہیں، ہوائی جہاز اُڑتے اور اترتے ہیں۔

''جو لوگوں کے لئے نفع بخش سامان لے کر چلتی ہیں'' کے الفاظ بحری تجارت اور مال برداری کی اہمیّت کو اجاگر کررہے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ قرآن کا قاری ان آیات کی صرف ''تلاوت'' کرتا ہے یا اُن سے اپنی زندگی کے لئے راہنمائی بھی لیتا ہے۔

6۔بارش اللہ تعالیٰ کی قدرت کی گواہی دیتی ہے۔

دیکھیں2/22 نوٹ (4)۔

7۔بے آب و گیاہ اور بنجر زمین پانی ملنے پر سرسبز و شاداب ہوجاتی ہے۔

زمین میں پودوں کے باریک باریک بیج بکھرے ہوتے ہیں(یا بعض پودوں جیسے گھاس کی جڑیں وغیرہ موجود ہوتی ہیں جن میں اُگنے اور نشوونما پانے کی صلاحیت ابھی باقی ہوتی ہے) مگر پانی نہ ملنے کے باعث اُگ نہیں سکتے۔ یہ خوابیدہ (Dormant)حالت میں ہوتے ہیں۔ زمین ویران پڑی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت کے مطابق جب انھیں پانی ملتا ہے تو یہ اُگنے لگتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ زمین جو بنجر پڑی ہوئی تھی ہری بھری ہوجاتی ہے۔

پانی کے بغیر زمین سوکھی پڑی ہوتی ہے،جب بارش ہوتی ہے تو (براہ راست طور پر یا دریاؤں اور نہروں کے ذریعے) اسے پانی ملتا ہے اور کسان فصلوں، اور سبزیوں وغیرہ کی بوائی کرتا ہے۔ یوں ہر طرف پر ہرے بھرے کھیت اور باغات نظر آتے ہیں۔

یہ بات بھی توجہ طلب ہے کہ انسان اور حیوانات کی غذا کا بنیادی ذریعہ پودے ہیں۔ مثلاً انسان سبزی بھی کھاتا ہے اور گوشت بھی۔ سبزی تو براہ راست پودوں سے حاصل ہوتی ہے مگر گوشت جانوروں سے حاصل ہوتا ہے یہ جانور بھی براہ راست یا بالواسطہ طور پر اپنی غذا کے لئے پودوں پر انحصار رکھتے ہیں۔مزید دیکھیں 2/22نوٹ (5)۔

8۔ہواؤں کی گردش (تصریف الریاح):ہوا کا ایک دبیز غلاف ہے جس نے زمین کو ہر طرف سے گھیرا ہوا ہے اُسے کرۂ ہوائی (Atmosphere) کہتے ہیں۔ درجۂ حرارت کی کمی بیشی سے ہوا کے دباؤ میں فرق پیدا ہوتا ہے جس کے باعث ہوا میں حرکت پیدا ہوتی ہے اور ہوا چلتی ہے۔ زمین پر ہواؤں کی گردش ایک مربوط اور باقاعدہ نظام کے مطابق ہوتی ہے۔

ہواؤں کی گردش کے ان گنت فائدے ہیں۔ یہ ماحول کے تعفن کو ختم کرکے اُسے تروتازہ بناتی ہیں، آکسیجن کو پودوں سے حیوانوں تک اور کاربن ڈائی آکسائیڈ کو حیوانوں سے پودوں تک پہنچاتی ہیں۔ کسی مقام پر ہوا میں گیسوں کے تناسب کو قائم رکھتی ہیں۔

یہ بادلوں کو حرکت دیتی اور ایک مقام سے دوسرے مقام پر لے جاتی ہیں۔کشتیوں کو چلاتی ہیں۔ زمین کے درجۂ حرارت کو معتدل رکھنے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں، سرد علاقوں کی سردی گرم علاقوں میں اور گرم علاقوں کی تپش سرد علاقوں

میں منتقل کرتی ہیں۔

ہوائیں پودوں کی زیرگی (Pollination) میں بھی اہم کردار ادا کرتی ہیں(یعنی پودوں میں نر تولیدی مادے یعنی زیرہ دانوں (Pollen grains)کو مادہ تولیدی حصوں تک پہنچاتی ہیں۔) اس کے علاوہ یہ بیجوں کے انتشار(Dispersion of Seeds) یعنی اُن کی ایک مقام سے دوسرے مقام تک منتقلی میں بھی حصہ لیتی ہیں۔

9۔بادل کیا ہیں، آبی بخارات کا وسیع خزانہ ہیں۔ سمندروں (اور محدود پیمانے پر دریاؤں اور جھیلوں وغیرہ اور پودوں کے پتوں) سے پانی شمسی توانائی کے ذریعے بخارات میں تبدیل ہوتا ہے۔ بادل انہی آبی بخارات سے مل کر بنتا ہے۔

توجہ طلب بات یہ ہے کہ بادل زمین کی کششِ ثقل (تجاذبی قوت) کے خلاف فضا میں معلق رہتے ہیں اور ہوا کے دوش پر سوار ہوکر ایک مقام سے دوسرے مقام پر حرکت کرتے ہیں (ان کا بلندی پر رہنا اس لئے ہے کہ یہ ہوا سے ہلکے ہوتے ہیں)

یہ سارا نظام اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا کرشمہ ہے۔ بادل اربوں ٹن پانی ایک مقام سے دوسرے مقام پر پہنچاتے ہیں۔ اگر یہ نظام نہ ہوتا تو انسان (اور دوسرے جانداروں کو) میٹھا پانی نہ مل سکتا اور وہ زندہ نہ رہ سکتے۔

[پانی کے مالیکیول ہوا کی بنیادی گیسوں نائٹروجن اور آکسیجن کے مالیکیولوں کے مقابلے میں ہلکے ہوتے ہیں لہٰذا آبی بخارات اوپر اُٹھتے ہیں اور بلندی پر پہنچ جاتے ہیں۔باقی تمام عوامل کو تھوڑی دیر کے لئے نظر انداز کرکے اسی ایک نقطے پر سوچیں کہ اگر ہوا بخارات سے ہلکی ہوتی مثلاً ہوا میں اکثریت ہائیڈروجن گیس یا ہیلیم گیس کے مالیکیولوں کی ہوتی تو پانی کے بخارات اوپر نہ اٹھ سکتے اور بادلوں کے بننے اور ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقل ہونے کا نظام قائم نہ ہوسکتا۔]

بادلوں کا بلندی پر پہنچنا اور سفر کرنا اپنے اندر اللہ تعالیٰ کی قدرت اور حکمت کی بہت سی نشانیاں رکھتا ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ ہم سوچیں!۔

10۔ قرآن انسان کو ترغیب دیتا ہے کہ وہ خود کو توہم پرستی، دیومالیّت، تقلید جامد، ناروا آباء پرستی، ذہنی غلامی، اور فکری تعصبات سے آزاد کرکے عقلِ خالص کو کام میں لائے اور کائنات میں موجود اس کے خالق کی ہستی اور وحدانیت اور کاریگری کی گوناں گون نشانیوں کی طرف متوجہ ہو۔

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَخْفٰى عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ ۝ هُوَ الَّذِي يُصَوِّرُكُمْ فِي الْأَرْحَامِ كَيْفَ يَشَآءُ ۚ لَآ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝
(3:5-6)

اللہ سے کوئی چیز بھی چھپی ہوئی نہیں ہے، نہ زمین میں اور نہ آسمان میں[1]۔ وہی ہے جو (ماؤں کے) رحموں میں تمہاری صورت گری کرتا ہے جس طرح چاہتا ہے[2]۔ اُس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ وہ غالب (اور) حکمت والا ہے۔

1۔ یہ آیت اللہ، خالقِ کائنات کے علمِ محیطِ کل (وہ علم جو ہر چیز کا احاطہ کئے ہوئے ہے) کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ اس حقیقت کا انکشاف قرآن کی بہت سی دوسری آیات میں بھی مختلف پیرایوں میں کیا گیا ہے۔

2۔ یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت، اُس کا ارادہ اور اُس کا قانونِ تخلیق ہے جس کے مطابق ماں کے رحم کے اندر بچہ نشوونما پاتا اور پروان چڑھتا ہے، اور اس کی شکل و صورت اور نقوش بنتے ہیں۔

جدید جنینیات (Embryology؛ ایمبریالوجی) سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ رحمِ مادر میں بچہ ایک لمبے اور پیچیدہ نشوونمائی عمل (Developmental process) کے ذریعے وجود میں آتا ہے۔ اس کا آغاز ایک خلیہ (سیل، Cell) سے ہوتا ہے۔ اُسے زائی گوٹ (Zygote) کہتے ہیں۔ یہ بذاتِ خود دو خلیوں سے مل کر بنتا ہے۔ ایک وہ جو باپ سے آتا ہے اُسے اسپرم (Sperm) کہتے ہیں، اور دوسرا وہ جو ماں سے آتا ہے اُسے

اووم (Ovum) کہتے ہیں۔) یہ مختلف مراحل طے کرتا ہوا مکمل بچے کی شکل میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ (اس پر تفصیلی گفتگو سورہ المومنون کی آیات 12 تا14 کے ذیل میں ہوگی)

رحم کے اندر بچے کی شکل و صورت اور ساخت و بناوٹ اور اُس کی دوسری تمام جسمانی خصوصیات کا تعین، اسباب کی سطح پر، وہ چیزیں کرتی ہیں جن کو دورِ جدید میں جینز (Genes) کا نام دیا جاتا ہے۔ (اس پر تفصیلی بحث کتاب کے دائرہ سے باہر ہے)۔

یصورکم کا معنی ہے وہ تمہاری صورتیں بناتا ہے (He shapes you.)

صورت لغت میں صار، یصور کا مصدر ہے جس کا معنی مائل ہونا اور مائل کرنا ہے۔ اصطلاح میں صورت اس ہیئت کو کہتے ہیں جو ترتیبِ اجزاء سے حاصل ہو۔ صورت کو صورت اس لئے کہتے ہیں یہ اجزا کے ایک دوسرے کی طرف میلان سے حاصل ہوتی ہے۔

''صورت'' صرف چہرے کی شکل کو نہیں کہتے بلکہ اس کا تعلق کسی شے کی پوری ساخت اور بناوٹ سے ہے جس کی بنیاد پر وہ شے پہچانی جاتی ہے اور دوسری اشیاء سے اُس کا امتیاز کیا جاتا ہے (مفردات)۔

تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ○
(3:27)

تو رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے[1]۔ اور تو زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے[2]، اور تو جس کو چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے۔

1۔ "تولج"، "ولوج" کے مادے سے ہے۔ ایک چیز کا دوسری چیز میں داخل ہونا۔

سال بھر، رات اور دن کا دورانیہ تدریجاً گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ (ماسوائے استواء کے باریک خط کے) کبھی رات لمبی ہوتی ہے اور دن چھوٹا ہوتا ہے اور کبھی دن لمبا اور رات چھوٹی ہوتی ہے۔ اس طرح کبھی رات کا حصہ دن میں داخل ہوجاتا ہے اور کبھی دن کا حصہ رات میں۔

گویا، اللہ تعالیٰ کبھی رات کو چھوٹا کر کے دن کو لمبا کردیتا ہے اور کبھی دن کو چھوٹا کرکے رات کو لمبا کردیتا ہے۔

"ولوج" کا معنی ایک چیز کو دوسری میں آہستہ آہستہ داخل کرنا بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ رات اور دن کا سال بھر میں چھوٹا بڑا ہونا ایک دم نہیں ہوتا بلکہ تدریجی طور پر ہوتا ہے۔
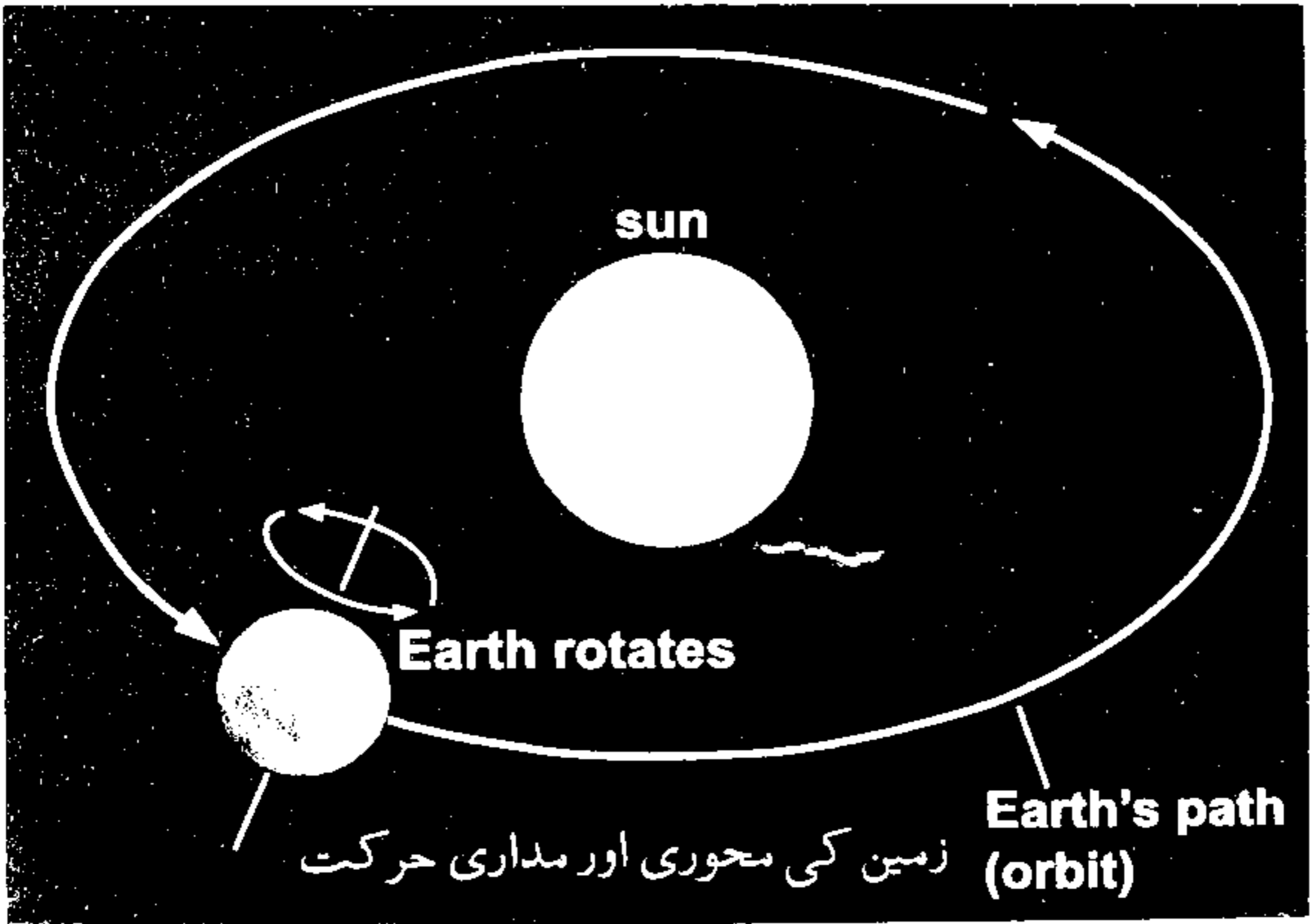
بعض کے نزدیک آیت کا معنی صبح اور شام کو رات اور دن کا ایک دوسرے میں آہستہ آہستہ داخل ہونا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جب صبح ہوتی ہے تو دن کی روشنی ایک دم شدت کے ساتھ آموجود نہیں ہوتی بلکہ آہستہ آہستہ پھیلتی ہے۔ اور اسی طرح جب رات ہوتی ہے تو دن کا اجالا آہستہ آہستہ غائب ہوتا اور رات کا اندھیرا آہستہ آہستہ اُس کی جگہ لیتا ہے۔

اس طرح ہم روشنی یا اندھیرے سے تدریجی طور پر ہمکنار ہوتے ہیں نہ

کہ یک لخت۔

سال بھر میں رات اور دن کے چھوٹے بڑے ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ہماری زمین اپنے مدار پر 23 درجے کے زاویہ پر جھکی ہوئی ہے۔ جس کے باعث کسی خطے میں سورج کی شعاعوں کے زمین پر پڑنے کا دورانیہ بدلتا رہتا ہے۔

اسی سے زمین پر موسموں کا نظام قائم ہے یعنی گرمی، سردی، خزاں اور بہار۔ نباتاتی اور حیوانی زندگی کے لحاظ سے موسموں کے اس نظام کی اہمیت واضح ہے۔

2۔یعنی وہ بے جان مادہ کو زندہ وجود میں اور زندہ اشیاء کو بے جان مادہ میں تبدیل کرتا ہے۔

بے جان سے زندہ کی پیدائش:

(الف) کروڑوں سال پہلے زمین پر زندگی کا جب آغاز ہوا تو اس موقع پر بے جان مادی اجزا (Inorganic Substances) سے ایک پیچیدہ سلسلۂ عمل (Process) کے نتیجے میں زندہ موجود وجود میں آیا۔ جس سے زندگی کا سلسلہ جاری ہوا اور اب ایک جاندار پہلے سے موجود دوسرے جاندار سے وجود میں آتا ہے۔

(ب) جانداروں کا جسم (جو کہ ایک زندہ موجود ہوتا ہے) غذا سے بنتا ہے اور غذا ابتدائی طور پر پودوں میں بے جان مادی اجزا کے ملاپ سے بنتی ہے۔پودا جڑوں کے ذریعے سے پانی اور دوسرے کیمیائی مرکبات Chemical Compounds جذب کرتا ہے۔ ہوا سے کاربن ڈائی آکسائیڈ جذب کرتا ہے اور پھر پتوں اور دوسرے سبز حصوں میں سورج کی روشنی کی مدد سے ان بے جان مادی اجزا کے ملاپ سے ایک لمبے اور پیچیدہ عمل کے ذریعے ''غذا'' تیار ہوتی ہے۔

اس غذا کو جب ہم کھاتے ہیں تو یہ ہضم ہوکر جزوِ بدن بنتی ہے اور زندہ خلیات کی نشوونما میں حصہ لیتی ہے۔

زندہ کا مردہ میں تبدیل ہونا:

جاندار جب موت سے ہمکنار ہوتے ہیں تو ان کا جسم انحطاطی عمل (Decay Process) کے نتیجے میں منتشر ہوکر بے جان مادی اشیاء میں بدل جاتا ہے۔

زندہ اجسام (انسانوں، حیوانوں اور پودوں) میں ہر آن دوقسم کے اعمال

(Processes) ہو رہے ہیں: ایک تعمیری (Anabolism) اور دوسرا تخریبی (Katabolism)۔ ان دونوں کو بطورِ مجموعی تحول یا Metabolism کہا جاتا ہے۔ تعمیری عمل میں ہر خلیہ میں بے جان مادی اجزا (جو غذا اور عمل تنفس کے ذریعے پہنچتے ہیں) ایک پیچیدہ عمل کے ذریعے زندہ مادے میں تبدیل ہوتے ہیں۔

جبکہ تخریبی عمل کے ذریعے زندہ مادہ بے جان مادہ مثلاً پانی، کاربن ڈائی آکسائیڈ اور نائٹروجنی مرکبات وغیرہ میں تبدیل ہوجاتے ہیں۔

یہ اللہ تعالیٰ کا قائم کردہ نظام ہے جس کے تحت زمین کے بے جان مادے (مرکبات اور عناصر) زندہ مادوں (خلیہ کے نامیاتی مرکبات) میں تبدیل ہوجاتے ہیں اور زندہ مادے انحطاط پذیر ہوکر بے جان مادوں میں بدل جاتے ہیں۔

وسیع تر معنوں میں زندگی اور موت کا یہ قانون پوری کائنات میں جاری ہے۔ گرد اور گیس سے ایک ستارہ وجود میں آتا ہے۔ جو اپنی زندگی کے مختلف مراحل سے گزرتا ہوا بالآخر اختتام کو پہنچ جاتا ہے۔ (ستاروں کی موت، مختلف طریقوں سے ہوتی ہے)۔

قوموں اور ملتوں کی سطح پر بھی زندگی اور موت کا قانون جاری ہے۔ زمین کی سطح پر مختلف خطوں میں مختلف قومیں اُٹھتی ہیں کشمکش حیات کے مختلف مراحل طے کرتی ہیں اور پھر زوال کا شکار ہوجاتی ہیں اور یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔

[یخرج: نکالتا ہے، ظاہر کرتا ہے، پیدا کرتا ہے، وجود میں لاتا ہے وغیرہ۔]

اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ ۝ الَّذِیۡنَ یَذۡکُرُوۡنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّقُعُوۡدًا وَّعَلٰی جُنُوۡبِهِمۡ وَیَتَفَکَّرُوۡنَ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقۡتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبۡحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ (3:190-191)

بے شک آسمانوں اور زمین کی تخلیق، اور رات اور دن کے ایک دوسرے کے پیچھے چلے آنے میں اہل عقل کے لئے بڑی نشانیاں ہیں[1] وہ جو کھڑے، بیٹھے اور اپنے پہلوؤں پر (لیٹے) اللہ کو یاد کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں غور وفکر کرتے ہیں[2]۔ (اُن کی دعا یہ ہوتی ہے کہ:) اے ہمارے رب تو نے یہ (عالم) بے مقصد پیدا نہیں کیا۔ تو پاک ہے (اس بات سے کہ کوئی بے مقصد کام کرے)، پس تو ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا۔

1۔قرآن عقل کو تحریک دے رہا ہے، کائنات کی خِلقت (وجود میں آنا اور ساخت و بناوٹ) اور اُس کے مظاہر (Phenomena) میں اللہ کی ہستی اور وجود (Existence of God) اور اُس کی قدرت کی گونا گوں نشانیاں ہیں، اُن لوگوں کے لئے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔ قرآن یہ چاہتا ہے کہ انسان اللہ کی معرفت، اُس کی پہچان اور شناخت حاصل کرے مگر ظاہر ہے کہ اُس کی ذات انسان کے حواس، عقل اور وجدان سے یعنی انسان کی ہر استعداد سے ماورا ہے تو پھر یہ معرفت کیسے حاصل کی جاسکتی ہے؟ اللہ کی صفات کی جلوہ گری کے مطالعہ سے جو کہ کائنات اور اُس کے مظاہر کی شکل میں ہمارے لئے قابلِ ادراک بھی ہے اور قابل تعقل بھی۔

دوسرا، قرآن یہ چاہتا ہے کہ انسان میں اللہ تعالیٰ کے لئے جو اُس کا خالق بھی ہے اور منعم بھی، احساسِ شکر گزاری پیدا ہو لہٰذا وہ اُن گونا گوں نعمتوں کی طرف انسان کو متوجہ کرتا ہے جن سے اللہ تعالیٰ نے انسان کو نوازا ہے۔
مزید دیکھیں سورہ البقرہ (2:164)

2۔اہل عقل کی دونشانیاں بیان کی جارہی ہیں:
الف : اللہ تعالیٰ کا ذکر (یعنی ہر حال میں اللہ تعالیٰ کو یاد رکھنا) اور

ب : کائنات کی خلقت میں غور و فکر۔

انسان کا مقصدِ تخلیق یہ ہے کہ وہ اپنے اللہ کی معرفت حاصل کرے اس مقصد کے لئے لازمی ہے کہ وہ اپنی ''انسانیت'' کی تکمیل کرے اور یہ ان دونوں شرائط کو بیک وقت پورا کئے بغیر ممکن نہیں۔ اگر ان میں سے کسی ایک کو چھوڑ دیا جائے تو انسان کمال سے محروم رہتا ہے۔ اگر یادِ خدا شامل نہ ہو تو کائنات میں غور و فکر مادی ترقی تو دیتا ہے لیکن انسان روحانی بلندی و تکمیل سے محروم رہتا ہے۔ بلکہ حیوانوں کی سطح پر گر جاتا ہے۔ (یہ وہ چیز ہے جس کا مشاہدہ ہم جدید دور میں مغربی تہذیب کی شکل میں کر سکتے ہیں)۔ اور اگر کائنات میں غور و فکر اور اللہ کی صفات کی جلوہ گری کا مشاہدہ شامل نہ ہو تو ''ذکرِ خدا'' ایک زبانی عمل تو بنتا ہے ذہنی و فکری عمل نہیں بنتا۔ اور اس چیز کے بغیر انسان معرفت کے کمال تک نہیں پہنچ سکتا۔

سورہ النساء (4)

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً ۚ (4:1)

اے لوگو![1] اپنے رب کا تقویٰ اختیار کرو جس نے تم کو ایک ہی جان سے پیدا کیا ہے[2]: (اُسے وجود میں لایا) اور اس سے اُس کا جوڑا پیدا کیا، اور اُن دونوں سے کثرت سے مرد اور عورتیں (دنیا میں) پھیلا دیں۔

1۔آیت وحدتِ نسلِ انسانی کو اُجاگر کررہی ہے۔ تمام انسان (چاہے مرد ہوں یا عورتیں ہوں) ایک مشترک منبع (Common Origin) سے پھوٹے ہیں۔ تمام انسان آپس میں ''خونی رشتے'' سے منسلک ہیں یعنی سب آپس میں رشتہ دار ہیں۔ لہٰذا چاہئے کہ وہ ایک دوسرے سے محبت کریں۔ اور باہمی احترام کے ساتھ امن وسکون سے زندگی بسر کریں۔

2۔ایک نفس سے تخلیق: قرآن کہتا ہے کہ دنیا کے تمام انسان ایک ''نفس'' سے پیدا ہوئے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ نفس سے کیا مراد ہے؟ ''نفس'' کے لفظ کے کئی معنی ہیں اور یہ قرآن مجید میں کئی معنوں میں استعمال ہوا بھی ہے۔ مثلاً روح، قلب یا ذہن، انسان کی ذات یا شخصیت، زندہ موجود وغیرہ۔

اگر ہم یہاں نفس کا معنی زندہ موجود (Living entity) کریں تو مطلب ہوگا کہ دُنیا کے تمام انسان ایک زندہ موجود سے پیدا کئے گئے ہیں۔

اُس سے اُس کا جوڑا پیدا کرنے کامفہوم: عربی زبان میں ''زوج''

دو چیزوں یا صنفوں کے جوڑے کو بھی کہتے ہیں اور جوڑے کے ایک فرد کو بھی۔ اس مفہوم میں مرد عورت کا زوج ہے اور عورت مرد کی زوج۔

اللہ تعالیٰ نے ایک زندہ موجود پیدا کیا اور اس سے اُس کا جوڑا (زوج) بنایا۔ ''اُس سے'' کا کیا معنی ہے۔ یہاں دو احتمال ہیں۔ ایک یہ ''اُس سے'' کا معنی ہے اُس کی جنس اور نوع سے۔اس معنی کی تائید میں مثال کے طور پر سورہ النحل (16/72) کی آیت پیش کی جاسکتی ہے۔

واللهُ جَعلَ لَکُمْ مِنْ انفُسِکُمْ ازْواجا

''اور اللہ ہی نے پیدا کیے تمہارے لیے تمہاری جنس سے جوڑے۔''

ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہوتا کہ بیوی شوہر سے پیدا ہوتی ہو یا شوہر بیوی سے۔ بلکہ یہ ہوتا ہے کہ دونوں ایک ہی نوع سے تعلق رکھتے ہیں۔(مزید دیکھیں سورہ الروم ؛ 30:21)۔

''اُس سے'' کے مذکورہ بالا مفہوم کی بنیاد پر آیت کا معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک زندہ موجود تخلیق فرمایا اور اُسی کی جنس سے ایک اور زندہ موجود پیدا کیا جو پہلے موجود کے لئے جوڑے (زوج) کی حیثیت رکھتا تھا۔ پھر ان دونوں سے نسلِ انسانی کا سلسلہ جاری ہوا۔

روایتی مفہوم میں پہلا زندہ موجود حضرت آدم علیہ سلام ہیں جبکہ دوسرا زندہ موجود حضرت حوا علیھا السلام۔

یہ سوال اپنی جگہ باقی ہے کہ پہلے موجود کو اور پھر دوسرے موجود کو پیدا کیسے کیا گیا۔

روایتی مفہوم یہ کہتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو براہ راست مٹی سے خلق کیا گیا۔ اور حضرت حوا علیھا السلام کو بھی اسی طریقے سے براہ راست مٹی سے بنایا گیا (حضرت آدم کی بچی ہوئی مٹی سے)۔

اس مفہوم پر یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ قرآن کہتا ہے کہ نسلِ انسانی کا ایک ہی نفس سے آغاز کیا گیا۔ مگر مندرجہ بالا مفہوم سے یہ دو وجود ہیں جن سے نسلِ انسانی کا آغاز ہوتا ہے۔''ایک ہی نفس'' سے آغاز یہ تقاضا کرتا ہے کہ وجود ثانی وجود اوّل سے پیدا ہو بصورتِ دیگر یہ ایک نفس سے نہیں بلکہ دونفسوں سے آغاز ہوگا۔

روایتی مفہوم اس کا یہ جواب دے سکتا ہے کہ یہاں ''نفس واحدہ'' سے

حضرت آدم علیہ السلام مراد ہیں اور چونکہ عام طور پر اولاد کو باپ سے منسوب کیا جاتا ہے لہٰذا عام محاورے کا لحاظ رکھتے ہوئے قرآن نے یہ لفظ استعمال کیے ہیں، مطلب ہوگا ۔ ''تم سب کو ایک باپ سے پیدا کیا''۔ ظاہر ہے۔ ایسا کہنا ماں کے وجود کی نفی نہیں کرتا۔(اسی طرح اگر یہ کہا جائے کہ تم سب کو ایک ہی ماں سے پیدا کیا گیا ہے تو ایسا کہنے سے بھی یقینی طور پر باپ کے وجود کی نفی نہیں ہوتی۔)

اور یہ بات بھی واضح ہے کہ قرآن کا اصلی مقصد یہاں نسل انسانی کی بیالوجی بیان کرنا نہیں بلکہ انسانوں کی وحدت کو اُجاگر کرنا اور انھیں آپس میں مل جل کر محبت اور بھائی چارے کے ساتھ رہنے کی تعلیم دینا ہے۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ وجود ثانی کو وجودِ اوّل سے جسمانی طور پر پیدا کیا گیا ہے۔ اس کی تشریح میں روایتی مفہوم یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے براہِ راست مٹی سے حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کی اور پھر اُن کی پسلی سے حضرت حوا علیھا السلام کو پیدا فرمایا۔

اس مفہوم کی تائید میں حدیث سے بھی استدلال کیا جاتا ہے ۔ صحیح مسلم کتاب الرضاع میں ہے:

''عورتوں کے ساتھ خیر خواہی کرو کیونکہ عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے اور پسلی کا اوپر کا حصہ زیادہ ٹیڑھا ہے۔ اگر تم اس کو سیدھا کرنے لگو گے تو توڑ دوگے۔ اور اگر تم نے اس کو چھوڑ دیا تو وہ ہمیشہ ٹیڑھی رہے گی عورتوں سے خیرخواہی کرو۔'' (ترجمہ از مولانا غلام رسول سعیدی شرح صحیح مسلم)

مگر اس حدیث کی تشریح دوسری طرح بھی کی جاسکتی ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ حدیث کا نچوڑ یہ ہے کہ یہ عورتوں کے ساتھ خیر خواہی کی تعلیم دے رہی ہے، اس میں ''عورت'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور یہ بات ''ہر عورت'' کے لئے کہی گئی ہے ظاہر ہے اگر بالفرض یہ مان بھی لیا جائے کہ حضرت حوا علیھا السلام پسلی سے پیدا کی گئیں تھیں یہ بات ہر عورت کے لئے تو نہیں کہی جاسکتی۔ہم جانتے ہیں کہ عورت بھی اُسی طریقے سے رحمِ مادر میں پیدا ہوتی ہے جس طریقے سے مرد پیدا ہوتا ہے۔

دوسرا یہ کہ حدیث میں یہ کہیں موجود نہیں کہ عورت کو مرد کی پسلی سے پیدا کی گیا ہے: حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

فَاِنَّ الْمَرْاَةَ خُلِقَتْ مِنْ ضِلَعٍ

لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہاں عورت کی مخصوص طبیعت کو پسلی سے تشبیہ دی گئی ہے نہ کہ یہ کہنا مقصود ہے کہ عورت کا جسم پسلی سے بنا ہے۔ یہ بات لغت اور زبان کے اعتبار سے بھی درست ہے۔ تشبیہ کے لئے یہ انداز قرآن میں بھی ملتا ہے مثال کے طور پر سورہ الروم میں ہے:(30:54):

اَللّٰهُ الَّذِی خَلَقَکُمْ مِنْ ضُعْفٍ

''اللہ وہ ہے جس نے تمہیں ضعف سے پیدا کیا ہے۔''

یعنی کمزور پیدا کیا ہے۔

اسی طرح سورہ الانبیاء میں ہے (21/37):

خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ

'' انسان کو جلد بازی سے پیدا کیا گیا ہے''

یعنی جلد باز پیدا کیا گیا ہے۔

لہٰذا مندرجہ بالا حدیث کا مفہوم ہوگا کہ

عورت اپنی طبیعت میں پسلی کی طرح ہے۔(پسلی کا خمدار ہونا اُس کا کوئی عیب نہیں بلکہ اُس کا جو مقصد ہے یہ بناوٹ اُس کے ساتھ مکمل مطابقت رکھتی ہے۔ اگر کوئی اُسے ''سیدھا'' کرنا چاہے گا تو اُسے اس کے مقصد تخلیق سے دور کردے گا بلکہ اُسے توڑ کر رکھ دے گا۔)

یہی حال عورت کا ہے۔ وہ فطری طور پر اس بات کی طالب ہے کہ اُس کے ساتھ خیر خواہی اور نرمی کا رویہ رکھا جائے یہی اسلام کا حکم ہے۔

صحیح بخاری میں ایک حدیث تو اسی مفہوم کی ہے جو ہم نے اوپر بیان کی ہے البتہ اُس میں الفاظ جمع کے ہیں یعنی عورتوں کو پسلی سے پیدا کیا گیا ہے یہ بات اوپر اخذ کئے گئے نتیجہ کی تائید کرتی ہے لیکن ایک اور حدیث میں تو صراحتاً یہ بات بیان ہوئی ہے کہ عورت پسلی کی طرح ہے:

اَلْمَرْاَةُ کَالضِّلَعِ

''عورت پسلی کی طرح ہے۔''

لہٰذا یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے ''حدیث'' کا مقصود یہ نہیں کہ عورت کو جسمانی طور پر پسلی سے بنایا گیا ہے۔ بلکہ مقصود یہ ہے کہ عورت کی مخصوص فطرت و طبیعت کو پسلی کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔اور منشائے رسالت ﷺ یہ ہے کہ مرد

عورت کے ساتھ نرمی، خیرخواہی، اور حسنِ سلوک کا مظاہرہ کرے۔

مزید غور طلب بات یہ ہے کہ اوپر ذکر کی گئیں صحیح مسلم اور صحیح بخاری کی تینوں حدیثوں کے راوی ایک ہی ہیں یعنی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اس کا مطلب یہ ہے کہ حدیث بنیادی طور پر ایک ہی ہے جسے دو مختلف طرح بیان (Report) کیا گیا ہے۔ ایک بیان واضح طور پر تشبیہ کا معنی دے رہا ہے دوسرے کو تشبیہ کے معنی میں لیا جاسکتا ہے۔ لہٰذا نتیجہ یہی ہے کہ اس حدیث سے تشبیہ کے معنی ہی لئے جانے چاہئیں۔

''خود ضِلع کا مفہوم پسلی کا تو ثانوی ہے، اصل معنی کجی اور انحراف ہی کے ہیں۔'' (تفسیر ماجدی زیرِ نظر آیت کے ذیل میں)

[حضرت حوا علیھا السلام کے حضرت آدم علیہ السلام کی پسلی سے پیدا کئے جانے کا تخیل بائبل میں موجود ہے۔ تاہم اس کا ایک معنی یہ کیا گیا ہے:

Or took part of the man's side (Holy Bible, New International version, International Bible Society)

یعنی خدا نے آدمی کے پہلو کے ایک حصہ سے عورت کی تخلیق کی۔]

سوال یہ ہے کہ اگر حضرت حوا علیھاالسلام کے حضرت آدم علیہ السلام کی پسلی سے پیدا کئے جانے کا تخیل درست نہیں ہے تو پھر آیت کا صحیح مفہوم کیا ہے یعنی وجودِ اوّل سے وجودِ ثانی کیسے پیدا کیا گیا۔ قرآن مجید اس بارے میں خاموش ہے لہٰذا علمی، تحقیقی اور سائنسی سطح پر جو بھی تصور دلائل کے ساتھ پیش کیا جائے گا، قرآن کا قاری اُسے قبول کرنے میں آزاد ہوگا۔
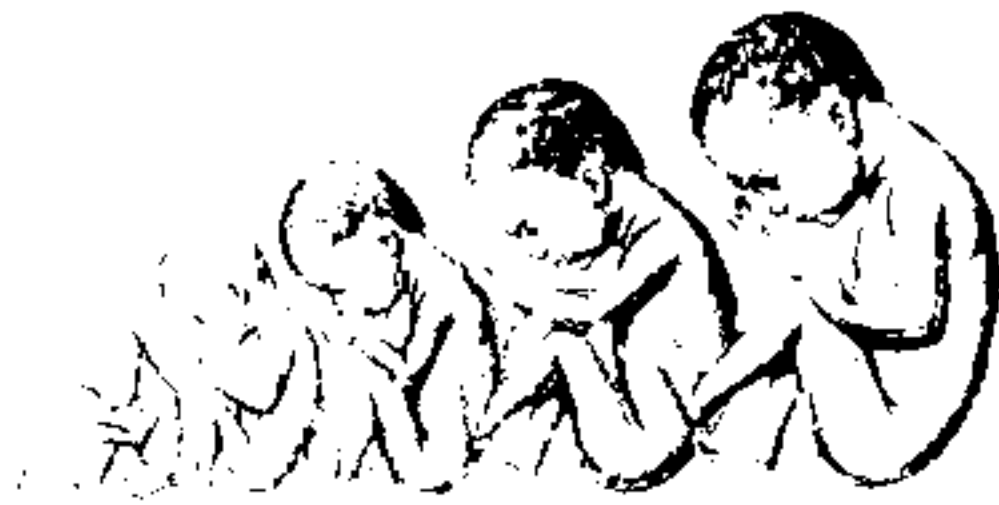
سورہ الانعام(6)

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ۬ ثُمَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ یَعْدِلُوْنَ ۝ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ طِیْنٍ ثُمَّ قَضٰۤى اَجَلًاؕ وَاَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَهٗ ثُمَّ اَنْتُمْ تَمْتَرُوْنَ ۝ (6:1-2)

''سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جس نے آسمانوں اور زمین کو تخلیق کیا اور تاریکیوں اور روشنی کو بنایا[1]۔ پھر تعجب ہے کہ جن لوگوں نے کفر کیا وہ اپنے رب کے ہمسر ٹھہراتے ہیں۔

وہی ہے جس نے تمہیں مٹی سے تخلیق کیا[2]۔ پھر ایک میعاد ٹھہرائی اور میعادِ مقررہ اُسی کے علم میں ہے[3]، پھر تعجب ہے کہ تم شک کرتے ہو!

1۔اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین (یعنی کائنات) کی تخلیق کی۔ اس میں مادہ اور توانائی (Matter & Energy) کا ایک ایسا نظام قائم کیا کہ کچھ اجسام روشنی خارج کرتے ہیں اور کچھ ایسا نہیں کرتے۔ مثال کے طور پر ستاروں (Stars) سے روشنی خارج ہوتی ہے جب کہ سیّارے (Planets) روشنی خارج نہیں کرتے۔ اس طرح کائنات میں روشنی اور تاریکی کا نظام قائم ہے۔

یہاں یہ نکتہ توجہ طلب ہے کہ آسمانوں اور زمین کی پیدائش کے سلسلے میں ''خلق'' کا لفظ استعمال ہوا ہے جب کہ روشنی اور تاریکیوں کے سلسلے میں ''جعل'' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ جب یہ الفاظ

ایک دوسرے کے ساتھ استعمال ہوں گے تو خَلَقَ کا معنی ہوگا عدم سے وجود بخشا، اور جَعَلَ کا معنی ہوگا پہلے سے موجود مواد سے بنایا۔ یہ بات معلوم ہے کہ روشنی اور اندھیرے کائنات ہی کے مظاہر ہیں۔

روشنی اور تاریکی انسانی دُنیا میں بھی ہے۔ سچائی روشنی ہے اور جھوٹ تاریکی، ہدایت روشنی ہے اور گمراہی تاریکی۔ آیت کریمہ میں ''نُوْرٌ'' لفظ واحد آیا ہے جب کہ ظلمات کا لفظ جمع۔ یہ اس طرف ایک بلیغ اشارہ ہوسکتا ہے کہ ہدایت تو ایک ہی ہوتی ہے جب کہ گمراہیاں کئی، سیدھا راستہ ایک ہی ہے جب کہ ٹیڑے راستے بے شمار ہیں۔

2۔ انسان کی تخلیق مٹی سے کی گئی ہے۔''طین'' پانی ملی ہوئی مٹی کو کہتے ہیں جس کے لئے ہم کیچڑ یا گارا کا لفظ استعمال کرسکتے ہیں۔ انگریزی میں اسے Clay کہتے ہیں۔

''مٹی سے انسان کی تخلیق'' کا مفہوم کیا ہے؟ اس پر آگے گفتگو کی جائے گی، یہاں اتنا بیان کرنا کافی ہوگا کہ سائنسی زبان میں مٹی سے مراد مادہ (Matter) ہے۔ مطلب یہ ہوگا کہ انسان کی تخلیق مادے سے کی گئی ہے۔

یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے کہ اُس نے بے جان مادے سے انسان جیسی حسین وجمیل اورذہین مخلوق پیدا فرمائی ہے۔

3۔یہاں دو اَجَلوں (مقررہ مدتوں) کا ذکرہے۔ مفسرین کے درمیان ان کے مفہوم میں اختلاف ہے۔ممکن ہے کہ پہلی اجل سے مراد موت ہو کیونکہ اجل کے معنی ہیں زمانہ کی مقررہ حد اور کسی چیز کی موت اس کی زندگی کی حد ہوتی ہے۔اور دوسری اجل سے مراد قیامت میں اُٹھنے کا وقت ہو (کیونکہ قیامت برزخی زندگی کی حد ہے)۔ ایک رائے یہ ہے کہ پہلی اجل سے مراد وہ موت ہے کہ جو کہ کسی حادثہ سے واقع ہوتی ہے اور دوسری اجل سے مراد طبعی موت ہے۔ یہ دوقسم کی موتیں، بہر حال، ہمارے لحاظ سے ہیں اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہر شخص کی ایک ہی موت ہے جو اُس کے اذن سے ہی واقع ہوتی ہے۔

وَمَا مِنۡ دَآبَّةٍ فِى الۡاَرۡضِ وَلَا طٰۤـئِرٍ يَّطِيۡرُ بِجَنَاحَيۡهِ اِلَّاۤ اُمَمٌ اَمۡثَالُـكُمۡ‌ ؕ مَا فَرَّطۡنَا فِى الۡـكِتٰبِ مِنۡ شَىۡءٍ‌ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمۡ يُحۡشَرُوۡنَ‏ ۝ (6:38)

اور کوئی جانور نہیں جو زمین پر چلتا ہو، اور کوئی پرندہ نہیں جو فضا میں اپنے دونوں بازوؤں سے اُڑتا ہو مگر یہ سب تمہاری ہی طرح اُمتیں ہیں[1]۔اور ہم نے کتاب میں کسی چیز کو نظر انداز نہیں کیا۔ پھر یہ سب اپنے پروردگار کے حضور اکٹھے کئے جائیں گے۔

1۔''دَابۃ'' وہ مخلوق جو حرکت کر سکے، چلے پھرے۔ یہ لفظ کبھی سب جانداروں اور ذی حیات مخلوق کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ یہاں یہ زمین پر چلنے والے جانوروں کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

''اُمَمٌ''، ''امت'' کی جمع ہے۔ اس کا معنی ہے وہ جماعت جس کے افراد میں کوئی قدرِ مشترک پائی جائے مثلاً ان کا دین ایک ہو، یا زبان ایک ہو، یا کسی اور خاصیت میں ایک جیسے ہوں۔

جس طرح انسان بطور مجموعی ایک امت (برادری) ہیں اسی طرح پرندے اور دوسرے جاندار بھی مختلف اُمتیں ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے جانداروں کو امتوں میں تقسیم کیا ہے ہر ایک کی اپنی ایک ''دنیا'' ہے، پیدائش اور موت کا نظام ہے۔ جسمانی ساخت ہے اور زندگی کا ایک کردار ہے جسے وہ ادا کرتے ہیں۔

ہر جاندار برادری کی تخلیق کا ایک مقصد اور ایک غایت ہے۔ جس کے مطابق اس کا جسمانی وجود بنایا گیا ہے اور مخصوص جسمانی صلاحیتیں دی گئی ہیں۔ نیز، اُسے اپنے مقصدِ حیات کا ''شعور'' دیا گیا ہے (فطری یا عقلی سطح پر) اور اس کے اندر مقصدِ حیات کے حصول کی جدو جہد کے لئے درکار ''ہدایت'' ودیعت کی گئی ہے۔

وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ ؕ وَ يَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ؕ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ○ وَهُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيْهِ لِيُقْضٰٓى اَجَلٌ مُّسَمًّى ۚ ثُمَّ اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ يُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ○ ع (6:59-60)

اور غیب کی کنجیاں اُسی کے پاس ہیں اُس کے سوا ان کو کوئی نہیں جانتا۔ بر اور بحر میں جو کچھ ہے اس سے وہ واقف ہے۔ کوئی پتّا نہیں گرتا مگر وہ اس کو جانتا ہے اور نہ زمین کی تہوں میں کوئی دانہ گرتا ہے، اور نہ کوئی تر اور خشک چیز ہے مگر وہ ایک روشن کتاب میں (لکھی ہوئی) ہے[1]۔

اور وہی ہے جو تمہیں رات میں وفات دیتا ہے[2] اور جانتا ہے جو کچھ تم نے دن میں کیا ہے، پھر وہ تمہیں اس میں اٹھاتا ہے تاکہ مدتِ معین پوری کی جائے[3]۔ پھر اُسی کی طرف تمہارا لوٹنا ہے، پھر وہ تمہیں آگاہ کرے گا اُس چیز سے جو تم کرتے رہے ہو۔

1۔ اللہ تعالیٰ کا علم محیط کل ہے یعنی وہ ہر چیز کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ وہ خشکی اور تری (بر اور بحر) کی تمام باریکیوں کو تمام تر تفصیلات کے ساتھ یکساں طور پر جانتا ہے۔ وہ ہر ہر شے کو اور اس کی ہر ہر حرکت اور ہر ہر فعل کو جانتا

ہے۔ اس کے علم کا عالم یہ ہے کہ وہ بے شمار پودوں میں سے کسی پودے کے گرنے والے پتے اور زمین کی تہوں میں چھپے ہوئے کسی بیج تک کا علم رکھتا ہے اور جانتا ہے کہ ہوائیں کب، کہاں اور کتنے پتوں کو گراتی ہیں، کتنے زیرہ دانوں (Pollen grains) کو پھولوں کے نر حصوں سے مادہ حصوں تک پہنچاتی ہیں تا کہ نئے پودے کی بنیاد ڈالی جائے، اور کتنے بیج ہیں جو مختلف ذرائع (انسانوں، حیوانوں، ہواؤں اور پانی وغیرہ) سے مٹی میں بکھرتے ہیں اور کون سا بیج کب تک خوابیدہ (Dormant) رہے گا اور کب اُگے گا۔

آیت میں ''پتے کے گرنے'' اور ''دانے کے زمین کی تہوں میں پڑنے'' کے الفاظ توجہ طلب ہیں۔ اس بات پر توجہ کریں کہ پتے کا گرنا اس کا زندگی سے ناتا توڑنا ہے۔ یعنی یہ اس کی موت کا اعلان ہے۔ جب کہ دانے یعنی بیج کا زمین کی تہوں میں گرنا اُس کی حیاتِ نو کے امکانات کا دروازہ کھولتا ہے۔ وہ جانتا ہے کون کہاں موت سے ہمکنار ہو رہا ہے اور کون کہاں زندگی کی شاہراہ پہ قدم رکھ رہا ہے۔

2۔''وفات دیتا ہے'' یعنی نیند کی حالت میں لے جاتا ہے جہاں انسان کا شعور معطل ہو جاتا ہے۔

''توَفّی'' لغت میں واپس لے لینے کے معنی میں آتا ہے۔ یہ روح قبض کیے جانے کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ یہاں یہ لفظ نیند سے ہم کنار کرنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ موت کی صورت میں انسانی دماغ مکمل طور پر معطل ہو جاتا ہے۔ جس میں روح اور جسم کا تعلق مکمل طور پر منقطع ہو جاتا ہے۔ جبکہ نیند کی حالت میں دماغ کا صرف ایک حصہ معطل ہوتا ہے۔

3۔حیاتِ انسانی میں نیند اور بیداری کی حالتیں یکے بعد دیگرے تسلسل کے ساتھ آتی رہتی ہیں۔ یہاں تک کے زندگی کے آخری لمحات آجاتے ہیں۔ اور انسان موت سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰی ؕ یُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَ مُخْرِجُ الْمَیِّتِ مِنَ الْحَیِّ ؕ ذٰلِکُمُ اللّٰہُ فَاَنّٰی تُؤْفَکُوْنَ ○ فَالِقُ الْاِصْبَاحِ ۚ وَ

جَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا ط
ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ○ (6:95-96)

بے شک اللہ ہی دانے اور گٹھلی کو پھاڑنے والا ہے[1]۔وہ زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور وہی مردہ کو زندہ سے نکالنے والا ہے[2]۔ بس وہی خدا ہے تو تم کہاں اوندھے ہوئے جاتے ہو۔

وہی صبح کا نکالنے والا ہے۔ اُسی نے رات سکون کی چیز بنائی ہے[3]۔اور سورج اور چاند اُس نے ایک حساب سے رکھے ہیں[4]۔یہ زبردست قوت والے، علم والے کی منصوبہ بندی ہے۔

1۔ اللہ ہی ہے جس کی مشیّت اور ارادہ کے تحت زمین کی تہوں میں دانہ اور گٹھلی پھٹتے ہیں اور اُن میں سے ننھا پودا نمودار ہوتا ہے۔ جڑ نکلتی ہے جو نیچے کی طرف جاتی ہے اور کونپل پھوٹتی ہے جو زمین سے باہر روشنی کی طرف اٹھتی ہے۔

''حَبّ'' غذائی اجناس مثلاً گندم، مکئی، جو اور چاول وغیرہ کے دانے کو کہتے ہیں۔ اس کا اطلاق دوسری نباتات کے دانوں اور بیجوں پر بھی ہوتا ہے۔

''نوی'' پھلوں کی گٹھلی کو کہتے ہیں جیسے کھجور، آڑو، آم وغیرہ۔

دانہ ہو یا گٹھلی اصل میں پودوں کے بیج ہیں۔ ان کے اندر پودا اپنی ابتدائی شکل میں موجود ہوتا ہے جسے جنین(Embryo) کہتے ہیں۔ یہ بہت باریک اور نرم و نازک ہوتا ہے۔

جب بیج کو سازگار حالات (نرم مٹی، پانی، آکسیجن وغیرہ) ملتے ہیں تو اس کے اندر کا ننھا پودا نشوونما پانا شروع کردیتا ہے اور بالآخر بیج کی سخت بیرونی دیوار کو چیرتا ہوا باہر نکل آتا ہے۔

یہ اللہ ہی کی قدرت کا کرشمہ ہے کہ نرم و نازک نو خیز پودا دانے اور

گٹھلی کی سخت اور ٹھوس بیرونی دیوار کو چیرتا ہوا باہر نکل آتا ہے۔

(فالق: پھاڑنے، چیرنے اور شگافتہ کرنے والا، کسی چیز کو پھاڑ کر اس میں سے کسی چیز کو برآمد کرنے والا، نمودار کرنے والا۔)

2۔ دیکھیں 3:27 نوٹ (2)۔

3۔ یعنی ''رات کو سکون کا باعث قرار دیا''۔ یہ اللہ تعالی ہی کا قائم کردہ نظام ہے۔ جس کے مطابق زمین اپنے محور (axis) پر گھومتی ہے جس سے رات اور دن باری باری تسلسل کے ساتھ ایک دوسرے کے پیچھے آتے ہیں۔

رات تھکے ہارے انسان کو راحت و آرام فراہم کرتی ہے۔ راتیں دنوں کے درمیان آرام اور بحالی کے وقفے (Intervals) ہیں۔ ہمارے جسم کی ساخت ایسی ہے کہ اس کی فعالیت اور تحرک کا روشنی کے ساتھ اور استراحت اور آرام کا اندھیرے کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔

4۔ ''حسبان'' مصدر ہے اور یہ ''حساب'' کے مادہ سے ہے۔ سورج اور چاند ایک حساب اور نظام کے پابند ہیں۔ زمین کے اعتبار سے ان کا طلوع اور غروب ایک نظام کے مطابق ہوتا ہے اس کے علاوہ یہ اپنی ساخت اور بناوٹ، اپنی جسامت، اپنی حرکت اور حرکت کی رفتار، اپنے محل وقوع، اپنے عرصۂ حیات اور تمام دوسری خصوصیات میں ایک حساب اور نظام کے پابند ہیں۔

انسان کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ ان کی حرکت، حرکت کی رفتار اور حرکت کے راستے کو سمجھے، اور اس بنیاد پر وقت، دنوں، مہینوں، برسوں وغیرہ کا حساب کرے، تاریخ کا زمانی ریکارڈ رکھے اور آئندہ کے منصوبے بنانے اور پیشن گوئیاں کرے۔

وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ النُّجُوْمَ لِتَهْتَدُوْا بِهَا فِیْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ ؕ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ○ (6:97)

وہی ہے جس نے تمہارے لئے ستارے قرار دیئے تاکہ تم ان سے خشکی اور تری کی تاریکیوں میں

راہنمائی حاصل کرو[1]۔

ہم نے اپنی نشانیاں اُن لوگوں کے لئے تفصیل سے بیان کردی ہیں جو علم رکھتے ہیں[2]۔

1۔کائنات میں بے شمار ستارے (اور سیارے اور دوسرے سماوی اجرام) ہیں۔ انسانوں کے لئے ان کا ایک فائدہ یہ کہ وہ ان سے رات کے وقت وسیع صحراؤں اور سمندروں میں راہنمائی حاصل کرسکتے ہیں۔

ستارے روشن اجسام ہیں، ان کے مخصوص مقام اور زمین کے لحاظ سے حرکت وسفر کے مخصوص راستے ہیں اور یہ ایک قانون اور نظام کے بندھن میں بندھے ہوئے ہیں۔ لہٰذا انسان ان کی مدد سے سفر کے دوران اپنے مقام اور سمت کا تعین کرسکتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ وقت کا حساب لگاسکتا ہے۔

2۔یہ نشانیاں اُن لوگوں کے لئے بامعنی ہیں جو علم رکھتے ہیں یا جو جاننا چاہتے ہیں۔

قرآن چاہتا ہے کہ لوگ اللہ کی نشانیوں کو پہچانیں اور کائنات اور مظاہر کائنات کا علم حاصل کریں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جیسے جیسے لوگوں کے علم اور شعور میں اضافہ ہوتا ہے اُن میں اسی نسبت سے اللہ تعالیٰ کی ہستی اور قدرت کا عرفان بڑھتا جاتا ہے یہی وہ چیز ہے جس کو قرآن فروغ دینا چاہتا ہے اور یہی انسانی زندگی کا مقصودِ اصلی ہے۔(آیات: نشانیاں، دلائل)

وَهُوَ الَّذِىٓ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ ۗ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ ۝ (6:98)

اور وہی ہے جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا ہے[1]۔پھر (تم میں سے ہر ایک کے لئے) ایک مستقر اور ایک مستودع ہے[2]۔

بے شک ہم نے اپنی نشانیاں اُن لوگوں کے لئے تفصیل سے بیان کردی ہیں جو سمجھ سے کام لیتے ہیں[3]۔

1۔دیکھیں 4:1 تمہارا تعلق ایک نوعِ انسانی سے ہے۔
2۔مستقر: ٹھہرنے اور قرار پکڑنے کی جگہ یا وقت ۔
مستودع: وہ جگہ جہاں کوئی چیز بطور امانت ودیعت کی جائے۔
مستقر اورمستودع کے مفہوم میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ اس سلسلے میں کئی آراء پیش کی جاتی ہیں۔

ایک مفہوم یہ ہے کہ ہر شخص کی ایک مدتِ حیات ہے جس کے دوران وہ زمین پر رہتا ہے۔ اس کے بعد وہ دنیاوی حیات کے اختتام کو پہنچتا ہے اور برزخی حیات میں قدم رکھتا ہے (مزید دیکھیں6:11)۔

3۔یہاں''یفقھون'' کا لفظ استعمال ہوا ہے جو''فقه'' کے مادے سے ہے۔ اس سے مراد وہ ذہنی صلاحیت ہے جس سے انسان کسی چیز کو سمجھتا ہے۔ امام راغب اصفہانی نے کہا ہے کہ فقہ حاضر کے علم سے غائب کے علم کی طرف پہنچنے کو کہتے ہیں(مفردات)۔ یعنی موجود معلومات سے اُن معلومات کا کھوج لگانا جو ابھی سامنے نہیں ہیں۔ اس کو اگر ہم وسعت دیں تو مفہوم ہوگا محسوسات (وہ اشیاء جنھیں حواس سے محسوس کیا جاسکے) کے مشاہدہ سے نتائج اخذ کرکے اُن کے ذریعے مجرد حقائق (Abstract Truths) کا سمجھنا۔

قرآن کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات میں اپنی ہستی اور قدرت کے دلائل کھول کھول کر بیان کردیئے ہیں اُن لوگوں کے لئے جو تفقہ (سمجھنے) کی صلاحیت سے کام لیتے ہیں۔

آپ نے دیکھا یہ''فقہ'' کا لفظ کتنا خوبصورت ہے۔ اس میں کتنی تازگی، زندگی اور تحرک و فعالیت ہے۔ اگر ہم اس کو تقلید جامد کی علامت بنالیں تو یہ ہمارا قصور ہے نہ کہ اس لفظ کا۔

یہ نکتہ بھی توجہ طلب ہے کہ پہلی آیت (6:97) میں ''یعلمون'' (جوعلم رکھتے ہیں) کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اور یہاں ''یفقھون'' (جو سمجھ سے کام لیتے

ہیں)۔ پہلی آیت میں دلالت واضح اور صریح ہے جبکہ دوسری آیت میں دلالت خفی اور دقیق ہے۔ پہلی آیت کے مفہوم کو سمجھنے کے لئے علم کافی ہے جبکہ دوسری آیت کے مفہوم کو سمجھنے اور اس کی اہمیت کا ادراک کرنے کے لئے گہرے غور و فکر کی ضرورت ہوگی۔

وَهُوَ الَّذِیٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَیْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِیَةٌ وَّجَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّالزَّیْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّغَیْرَ مُتَشَابِهٍ اُنْظُرُوْٓا اِلٰی ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَیَنْعِهٖ اِنَّ فِیْ ذٰلِكُمْ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ○ (6:99)

اور وہی ہے جس نے آسمان سے پانی اُتارا[1]۔ پھر ہم نے اس سے اُگنے والی ہر چیز پیدا کی[2] اور اس سے سرسبز شاخیں نکالیں جن سے ہم تہ بہ تہ دانے نکالتے ہیں[3]۔ اور کھجور کے گابھے سے لٹکتے ہوئے گچھے[4]، اور انگوروں کے باغ اور زیتون اور انار ایک دوسرے سے ملتے جلتے بھی اور مختلف بھی[5]۔ ہر ایک کے پھل کو دیکھو جب وہ پھلتا ہے اور اس کے پکنے کو دیکھو (جب وہ پکتا ہے)[6]۔

بے شک ان کے اندر نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو ایمان لانا چاہیں[7]۔

1۔یعنی بادل سے بارش برسائی۔"سما" کے مفہوم کے لئے دیکھیں (2:22) نوٹ 1۔

زمین پر میٹھے پانی (Fresh Water) کا بنیادی ذریعہ بارش ہے۔ پانی کے جتنے بھی منبعے ہیں جیسے دریا، نہریں، چشمے اور کنویں وغیرہ ان سب کو پانی بالآخر بارش ہی سے ملتا ہے۔ اس لئے بارش میں کمی ان سب پر اثر انداز ہوتی ہے۔

2۔پانی سے طرح طرح کی نباتات اُگتی ہیں۔ سبزے اور ہریالی کا دارومدار پانی ہی پر ہے۔

اس آیت کریمہ میں نباتاتی دنیا میں اللہ تعالیٰ کی ہستی، قدرت اور حکمت کی بعض نشانیوں کی طرف انسان کو متوجہ کیا گیا ہے تاکہ انسان اللہ تعالیٰ کی کاریگری اور انسان پر اس کی نعمتوں پر غور وفکر کر کے اس کی معرفت حاصل کر سکے۔

3۔یعنی بالیاں جن میں تہ بہ تہ دانے ہوتے ہیں۔

کھجور کے گابھوں سے لٹکتے ہوئے گچھے

4۔"طلع" : گابھا (Spathe)

"قنوان" (قنو کی جمع): گچھے (Clusters) کھجوروں کے دانے گچھے

کی شکل میں ہوتے ہیں۔ ان گچھوں کو 'قنوان' کہا جاتا ہے۔

یہ گچھے ابتدا میں باریک دھاگوں کی شکل میں ہوتے ہیں جن پر ایک سبز رنگ کا غلاف چڑھا ہوتا ہے۔اسے طلع (گابھا) سے موسوم کیا جاتا ہے۔ دانیہ (قریب، نزدیک): گچھے میں کھجوریں ایک دوسری کے قریب قریب ہوتی ہیں اس لئے دانیہ کا لفظ استعمال کیا گیا۔ اس سے گچھوں کا زیادہ بوجھ کی وجہ سے لٹکنا اور جھکنا بھی مراد ہوسکتا ہے۔

5۔زندگی اور نشو نما کے بنیادی اصولوں میں ایک جیسے مگر ظاہری شکل، رنگ، ذائقہ،فعل (Physiology) اور مخصوص کیمیائی مرکبات میں الگ الگ۔

6۔''دیکھو اس کے پھل کی طرف جب وہ پھلتا ہے اور اس کے پکنے کو (جب وہ پکتا ہے)'' کے الفاظ پر ایک بار پھر غور کریں۔ قرآن مجید کس طرح کائنات اُس کی اشیاء اور مظاہر پر نگاہ ڈالنے اور غور وفکر کرنے کی دعوت وتحریک دے رہا ہے۔ اب یہ اُن لوگوں کا فرض ہے جو خود کو قرآن کا وارث و امین کہتے ہیں کہ وہ قرآن کی اس دعوت پر توجہ دیں اور قرآن کی منشأ کی تکمیل کو اپنی زندگی کا مقصد بنائیں۔

7۔جو ایمان لانا چاہیں، جن کے ذہن تعصّبات سے پاک ہیں، اور جو حق کی آواز سن سکتے ہیں اُن کے لئے ان سب چیزوں میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کے گوناگوں دلائل موجود ہیں۔

اس آیت میں کئی چیزوں کا ذکر ہوا ہے جن میں سے چند یہ ہیں:

۱۔ بادل سے بارش کا برسنا۔

۲۔ پانی سے طرح طرح کی نباتات کا اُگنا۔ بالخصوص اناج کا جن کی بالیوں میں تہ بہ تہ دانے ہوتے ہیں۔

۳۔ کھجور، انگور،زیتون اور انار کے پھل۔

۴۔ یہ حقیقت کہ پھل کئی لحاظ سے ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں اور کئی لحاظ سے مختلف ہیں۔

۵۔ پھلوں کے پیدا ہونے پر غور کی دعوت۔

۶۔ اُن کے پکنے پر غور کی دعوت۔

فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ ۚ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ ؕ كَذٰلِكَ يَجْعَلُ اللّٰهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ○ (6:125)

اللہ جس کو ہدایت دینا چاہتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لئے کھول دیتا ہے اور جس کو گمراہ کرنا چاہتا ہے اس کے سینہ کو بالکل تنگ کردیتا ہے، گویا اُسے آسمان میں چڑھنا پڑرہا ہے[1]۔ اللہ اسی طرح پھٹکار ڈال دیا کرتا ہے اُن لوگوں پر جو ایمان نہیں لاتے۔

1۔آیت کا ایمانی، اخلاقی اور روحانی مفہوم واضح ہے۔لیکن قرآن نے جن لفظوں اور عبارت کا انتخاب کیا ہے اس سے ضمنی طور پر ایسے نقطے حاصل ہیں جن کا چودہ سوسال پہلے ذکر کیا جانا یقیناً قرآن کا علمی و سائنسی معجزہ ہے۔

الف: ''آسمان میں چڑھنے'' کے الفاظ پر غور کریں۔ چودہ سوسال پہلے کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ ایک وقت آئے گا جب لوگ ہوائی سفر کریں گے اور انسان خلاؤں میں قدم رکھے گا۔ چودہ سوسال پہلے ''آسمان میں چڑھنے'' کے الفاظ کو محض استعارہ اور تمثیل سمجھا جاتا ہوگا مگر آج یہ ایک حقیقت ہے مستقبل میں انسان اور آگے جائے گا۔

ب: ''بلندیوں کی طرف جانے پر سینے کا تنگ ہونا'' یہ دوسری حقیقت ہے جس کا قرآن نے چودہ سو سال پہلے ذکر کیا ہے جب کہ آج کی معلومات لوگوں کے پاس نہیں تھیں۔ ہم جانتے ہیں کہ اگر ہم کرۂ ہوائی (atmosphere) میں سطح زمین سے اوپر جائیں تو جیسے جیسے ہم سطح زمین سے دور جائیں گے ہوا پتلی

ہوتی جاتی ہے۔ اور اس میں آکسیجن کی مقدار کم ہوتی جاتی ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص آکسیجن کے ماسک کے بغیر فضا میں چڑھنے لگے تو جوں جوں وہ اوپر جائے گا اُس کے لئے سانس لینا مشکل ہوتا جائے گا اور ایک وقت ایسا آئے گا جب آکسیجن اس حد تک کم ہوجائے گی کہ وہ زندہ نہ رہ سکے گا۔

وَهُوَ الَّذِي أَنشَأَ جَنَّاتٍ مَّعْرُوشَاتٍ وَغَيْرَ مَعْرُوشَاتٍ وَالنَّخْلَ وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفًا أُكُلُهُ وَالزَّيْتُونَ وَالرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَغَيْرَ مُتَشَابِهٍ ۚ كُلُوا مِن ثَمَرِهِ إِذَا أَثْمَرَ وَآتُوا حَقَّهُ يَوْمَ حَصَادِهِ ۖ وَلَا تُسْرِفُوا ۚ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ ۝

(6:141)

اور وہ وہی ہے جس نے باغات پیدا کئے[1]۔ کچھ چھپروں پر چڑھائے جاتے ہیں اور کچھ نہیں چڑھائے جاتے۔اور کھجور اور کھیتی پیدا کی جس سے طرح طرح کی غذائی پیداوار حاصل ہوتی ہے۔ اور زیتون اور انار (پیدا کئے) ایک دوسرے سے ملتے جلتے بھی اور مختلف بھی۔ فائدہ اُٹھاؤ ان کے پھلوں سے جب وہ پھلیں، اور اس کی کٹائی کے وقت اس کا حق ادا کرو اور اسراف نہ کرو، اللہ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا ۔

1۔اس آیت کریمہ میں عالمِ نباتات میں اللہ تعالیٰ کی قدرت اور حکمت کی نشانیوں کی طرف انسان کو متوجہ کیا گیا ہے۔
ا۔ طرح طرح کے باغات۔

''معروشات'' ''عرش'' سے بنا ہے، جو یہاں اُن چھپروں اور مچانوں (Trellies) کے لئے استعمال کیا گیا ہے جس پر بیلیں چڑھائی جاتی ہیں۔

بعض وہ پودے ہوتے ہیں جو بیل کی شکل میں ہوتے ہیں اور اپنے تنوں پر کھڑے نہیں ہوسکتے ان کو چھپروں، مچانوں اور دوسرے سہاروں پر چڑھایا جاتا ہے۔ ایسے پودوں کے لئے ''معروشات'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، ان کی واضح مثال انگور ہے۔ جب کہ دوسرے وہ پودے ہوتے ہیں جن کے تنے طاقتور ہوتے ہیں وہ خود سیدھے کھڑے ہوسکتے ہیں انھیں کسی سہارے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ان کے لئے ''غیر معروشات'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

۲۔ کھجور۔

۳۔کھیتیاں جو غذائی پیداوار اور نوعیت کے اعتبار سے قسم قسم کی ہوتی ہیں۔

۴۔زیتون۔

۵۔انار:ایک جیسے بھی اور مختلف بھی۔

۶۔ پھلوں سے غذا حاصل کرنا۔

۷۔ اللہ کی رضا کے لئے محروم المعیشت لوگوں پر خرچ کرنا۔

۸۔ اسراف اور فضول خرچی سے دور رہنا۔

وَمِنَ الْاَنْعَامِ حَمُوْلَةً وَّفَرْشًا ؕ كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۙ

(6:142)

اور اُس نے چوپایوں میں بڑے قد کے بھی پیدا کئے اور چھوٹے قد کے بھی[1]۔ تو اللہ نے جو کچھ تمھیں بخشا ہے اس سے فائدہ اُٹھاؤ اور شیطان کے نقشِ قدم کی پیروی نہ کرو، بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔

1۔یا'' کچھ بوجھ اُٹھانے والے اور کچھ زمین پر بچھے'' ''حمولة'' سے مراد وہ بڑے بڑے جانور ہیں جو سواری اور بوجھ لادنے کے لئے استعمال ہوتے ہیں، مثلاً گھوڑا، اونٹ، گدھا، خچر، وغیرہ۔ اور ''فرش'' سے چھوٹے چوپائے مراد ہیں جیسے بکریاں بھیڑیں وغیرہ۔ ان کا گوشت کھایا جاتا ہے، دودھ پیا جاتا ہے یا ان سے دوسرے فوائد حاصل کئے جاتے ہیں۔(مثلاً کھالوں، اون اور بالوں کا حاصل کیا جانا۔)

اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ اور حکمتِ بالغہ سے جانوروں کو انسان کا مطیع بنایا ہے جن سے انسان اپنی خدمت حاصل کرتا اور طرح طرح سے فائدے اُٹھاتا ہے۔

اس آیت میں جانوروں کے تنوع (Variety) کا حوالہ دے کر اللہ تعالیٰ کی قدرت کی کاریگری اور اس کی رحمت کی طرف انسان کی توجہ مبذول کرائی گئی ہے۔

إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهُ حَثِيثًا وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُومَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِأَمْرِهِ أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ تَبٰرَكَ اللَّهُ رَبُّ الْعٰلَمِينَ ۝

(7:54)

بے شک[1] تمہارا رب وہی اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین[2] کو چھ ادوار[3] میں تخلیق کیا۔ اور وہ تخت اقتدار پر جلوہ فرمائے ہوئے ہے[4]۔ وہ رات کو دن پر ڈھانپا ہے جو تیزی سے اس کا تعاقب کرتی ہے[5]۔ اور اس نے سورج اور چاند اور ستارے پیدا کئے ہیں۔ وہ سب اس کے حکم کے پابند ہیں[6]۔

آگاہ ہوجاؤ! پیدا کرنا اور حکم دینا اُسی کے لئے خاص ہے۔ بڑا ہی بابرکت ہے اللہ جو جہانوں کا رب ہے۔

1۔اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کی بعض کائناتی نشانیوں کی طرف انسان کی توجہ مبذول کروائی گئی ہے:

الف : اللہ نے کائنات کو تدریجی طور پر پیدا کیا ہے۔

ب : وہی تختِ اقدار پر جلوہ فرما ہے۔

پ : اس نے رات اور دن کا نظام جاری کیا ہے۔

ت : اُسی نے سورج، چاند اور ستارے پیدا کئے ہیں، تمام کائنات اُس کے حکم کی پابند ہے۔

ٹ : کائنات کا خالق بھی اللہ ہے اور حاکم بھی۔

2۔ ''آسمانوں اور زمین'' یعنی کائنات جو کہ کہکشاؤں، ستاروں، سیاروں اور دوسرے اجرامِ سماوی پر مشتمل ہے۔

3۔ ''ایام''، ''یوم'' کی جمع ہے۔ یوم چوبیس گھنٹے کے دن کو بھی کہتے ہیں۔ یہ رات کے مقابلے میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ لیکن اس کے اصل معنیٰ ''دَور'' یا ''عرصہٴ وقت'' ہے چاہے چھوٹا ہو یا بڑا۔ اور یہاں یہ لفظ اسی مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ موجودہ عام زمینی دن رات کا تعلق سورج کے سامنے زمین کی محوری گردش سے ہے جبکہ تخلیقِ کائنات کے وقت سورج اور زمین کا نظام خود تخلیقی مراحل میں تھا۔ لہٰذا آیت کا مفہوم ہوگا کہ کائنات چھ ادوار (Periods, Aeons) یا مراحل (Stages) میں تخلیق کی گئی۔

(چھ ادوار کی تفصیل کے لئے دیکھیں راقم کی کتاب ''کائنات: قرآن اور سائنس'')

یہ بات کہ کائنات کو اللہ تعالیٰ نے چھ ادوار میں تدریجاً تخلیق فرمایا ہے، قرآن پاک میں سات مرتبہ آئی ہے ایک تو یہی مقام ہے اس کے علاوہ دوسرے مقامات مندرجہ ذیل ہیں:

سورہ یونس (10:3)، سورہ ہود (11:7)

سورہ فرقان (25:59)، سورہ سجدہ (32:4)

سورہ ق (50:38)، سورہ حدید (57:4)

''چھ ادوار'' کی تفصیل چاہے کچھ بھی ہو، ایک بات تو واضح طور پر اس آیت سے اخذ کی جاسکتی ہے کہ کائنات کی تخلیق یک لخت نہیں بلکہ تدریجی طور پر ہوئی ہے۔ یعنی آہستہ آہستہ مختلف مراحل طے کرتی ہوئی۔ اسی چیز کو جدید دور میں ارتقاء یا Evolution کہا جاتا ہے۔ بہرحال، اس کا معنی یہ ہے کہ کائنات کی تخلیق کے لئے اللہ تعالیٰ نے جو طریقہ اختیار فرمایا ہے وہ تدریجی تخلیق کا طریقہ ہے۔ اللہ قادرِ مطلق ہے وہ ساری کائنات کو یک لخت پیدا کرسکتا ہے وہ وقت کا محتاج نہیں۔

لیکن اُس نے اپنی حکمتِ بالغہ سے تدریجی تخلیق کے طریقے کو منتخب فرمایا ہے۔

تدریجی اور مرحلہ وار تخلیق کی ایک حکمت یہ ہے اس میں کسی شے کے بننے کا عمل بہت سے مراحل پر مشتمل ہوتا ہے۔ ہر مرحلہ ہمارے سامنے شے کے بنانے والے کی تخلیقی صلاحیت کا ایک نیا گوشہ لاتا ہے۔

کائنات کی تدریجی تخلیق لحہ بہ لحہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور ربوبیّت کے لاتعداد رخوں کو نمایاں کرتی ہے۔ کائنات چونکہ Evolve ہوتی ہوئی (یعنی درجہ بدرجہ آگے بڑھتی ہوئی) حقیقت ہے۔ اس لئے ہر لمحے وہ ایک نئی کیفیت اور نئے روپ سے گزرتی ہے۔ ہر کیفیت اور ہرروپ اپنے خالق کی خلاقیت کا ایک نئے انداز سے تعارف کراتا ہے۔ یوں خالقِ کائنات کی معرفت کے دلائل لمحوں، دنوں، مہینوں، سالوں، صدیوں اور زمانوں کے تناظر میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ سورہ الرحمن میں ہے۔

''كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْن''

''ہر آن وہ ایک نئی شان میں ہے۔''

یعنی ہر لمحے کائنات میں اُس کی خلاقیت اور ربوبیت کی ایک نئی شان سامنے آتی ہے۔

اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کائنات ایک جامد (Static) کائنات نہیں بلکہ ایک متحرک (Dynamic) کائنات ہے۔ یہ ایک ''بنی بنائی'' کائنات نہیں بلکہ ''بنتی ہوئی'' کائنات ہے۔ اس کا تخلیقی عمل جاری ہے۔

عرش پر جلوہ فرما ہونے کا معنی:

''عرش'' کے بنیادی معنی کسی بنائی ہوئی چیز میں بلندی کے ہیں (ابن فارس)، امام راغب اصفہانی نے کہا ہے کہ عرش اصل میں ہر چھت والی چیز کو کہتے ہیں (مفردات)، بعض اوقات اس کا اطلاق خود چھت پر بھی ہوتا ہے (مثلاً دیکھیں البقرہ 2:259)۔

قرآن مجید میں بیل دار پودوں مثلاً انگور کو ''معروشات'' سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ وہ چھپروں پر چڑھائے جاتے ہیں۔

عرش کا لفظ بادشاہوں کے تخت کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے جس پر وہ دربار میں بیٹھتے اور احکامات جاری کرتے تھے۔ (مثلاً دیکھیں سورہ النمل 27:38)۔

اسی سے یہ لفظ حکومت اور اقتدار کے لئے بطورِ کنایہ استعمال ہوتا ہے۔ لہٰذا جب کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص تخت پر بیٹھا، تو اس کا معنی ہوتا ہے کہ اس نے زمامِ حکومت اپنے ہاتھ میں لی یا جب یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں ملک میں بادشاہ کو تخت سے گرا دیا گیا تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اُس سے حکومت چھین لی گئی ہے۔

اس بنیاد پر جب ''عرش'' کا لفظ اللہ تعالیٰ کی نسبت سے بولا جائے گا تو اس کا مطلب ہوگا اللہ تعالیٰ کا تختِ اقتدار (Throne of Authority)، یعنی اُس کی حکومت، اُس کا غلبہ، اُس کی قدرت، اس کی طاقت وغیرہ۔ اور ''استویٰ علی العرش'' کا معنی ہوگا وہ تختِ اقتدار و حکومت پر تمکن کئے ہوئے ہے۔کل کائنات اُس کے اقتدار، حکومت اور غلبہ میں ہے، اس نے کل کائنات کو اپنے قبضۂ قدرت اور احاطۂ تدبیر میں لیا ہوا ہے۔

کائنات کے خالق، اللہ تعالیٰ، نے جب کائنات کی تخلیق کا آغاز کیا تو وقت کے اس قلیل ترین لمحے (جو ایک سیکنڈ کا ناقابل تصور حد تک چھوٹا حصہ ہوگا) سے جب کائنات کی تخلیق شروع ہوئی اس پر اُس کے خالق کا کنٹرول، غلبہ اور اقتدار ہے۔ یہ نہیں کہ پہلے کائنات بنائی اور کائنات بننے کے بعد اُس کے تختِ حکومت پر متمکن ہوا۔ کائنات اپنے خالق کی مکمل اور مسلسل نگہبانی کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی۔ اُسے اپنی تخلیق کے پہلے لمحے سے ہر آن اپنے وجود اور نشوونما کے لئے اپنے خالق کی نگہبانی کی حاجت ہے۔ (ثم کا لفظ تراخیٔ زمان کے لئے نہیں بلکہ اس حقیقت پر زور دینے کے لئے استعمال ہوا ہے کہ کائنات کا خالق بھی اللہ ہے اور حاکم اور مدبّر بھی وہی ہے۔ اُسی نے اس کائنات کو بنایا ہے اور وہی اس کا انتظام بھی سنبھالے ہوئے ہے۔)

علامہ محمد اسد کا ترجمہ ہے:

" ---- Who has created the heavens and the earth in six aeons, and is firmly established on the throne of His almightiness."

علامہ عبداللہ یوسف علی کا ترجمہ ہے:

"---- Who created the heavens and the earth in Six Days, and is firmly established on the throne (of authority)... "

انہی کی پیروی میں ہم نے اردو میں ترجمہ کیا ہے:

اور وہ تختِ اقتدار پر جلوہ فرمائے ہوئے ہے۔

یوں بھی کہہ سکتے ہیں:

اور وہ تختِ اقتدار پر تمکن کئے ہوئے ہے۔

5۔ رات اور دن کی گردش کا نظام:

اللہ تعالیٰ کی قدرت کا کرشمہ ہے کہ زمین پر رات اور دن کا نظام قائم ہوا اور رات اور دن یکے بعد دیگرے تسلسل کے ساتھ آتے ہیں۔ زمین کی محوری گردش کے دوران اس کا جو حصہ سورج کے سامنے آتا ہے وہاں روشنی ہوتی ہے اور وہ دن کہلاتا ہے اور زمین کے دوسرے نصف میں اندھیرا ہوتا ہے اور وہ رات کہلاتا ہے۔ رات اور دن اس طرح ایک دوسرے کے آگے پیچھے رواں دواں ہیں کہ اگر ہم دُور خلاء سے دیکھیں تو نظر آئے گا کہ رات دن کے پیچھے تیزی سے دوڑ رہی ہے جہاں پہلے دن ہوتا ہے وہاں رات چھاجاتی ہے اور گویا رات دن کو ڈھانپ لیتی ہے۔

اس نقطہ پر ایک اور زاویہ سے سوچیں، رات کا اندھیرا کیا ہے، زمین کا سایہ ہے جو ایک عظیم مخروط (Cone) کی شکل میں ہوتا ہے۔ اندھیرے کا یہ دیو قامت مخروط زمین کے گرد گھومتا رہتا ہے (زمین کی محوری گردش کے باعث)۔ اور زمین کے روشن حصوں کو ڈھانپتا رہتا ہے۔

6۔ سورج، چاند اور ستارے یعنی چھوٹے بڑے تمام سماوی اجسام اس کے حکم اور قانون کے پابند ہیں۔

7۔خلق سے مراد ہے پیدا کرنا اور امر سے مراد ہے حکم دینا، تدبیر کرنا۔ قرآن کہتا ہے کہ کائنات کا خالق بھی اللہ تعالیٰ ہے اور اس کا حاکم اور مدبر بھی وہی ہے۔خلق اور امر کا یکتا مالک و مختار وہی ہے۔

وَهُوَ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيَاحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهِ حَتَّىٰ إِذَا أَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنَاهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَأَنزَلْنَا بِهِ الْمَاءَ فَأَخْرَجْنَا بِهِ مِن كُلِّ الثَّمَرَاتِ كَذَٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتَىٰ لَعَلَّكُمْ

تَذَكَّرُوْنَ ۝ وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ۚ وَالَّذِيْ خَبُثَ لَا يَخْرُجُ اِلَّا نَكِدًا ۭ كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّشْكُرُوْنَ ۝ (7:57-58)

اور وہی ہے جو ہواؤں کو اپنی رحمت کے آگے آگے بشارت بنا کر بھیجتا ہے یہاں تک کہ جب وہ بھاری بادل کو اُٹھالاتی ہیں تو ہم اس کو کسی مردہ زمین کی طرف لے جاتے ہیں پھر اس سے پانی برساتے ہیں، پھر اس سے ہر قسم کے پھل پیدا کرتے ہیں۔ اسی طرح ہم مردوں کو نکالیں گے۔ (یہ نشانیاں ہم نے اس لئے نمایاں کی ہیں) تاکہ تم (ان آثار سے آخرت کی) یاد دہانی حاصل کرو۔

اور جو زمین اچھی ہوتی ہے، وہ اپنے رب کے حکم سے خوب پھل پھول لاتی ہے اور جو زمین خراب ہوتی ہے اس سے ناقص پیداوار کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔ اسی طرح ہم اپنی نشانیاں مختلف پہلوؤں سے دکھاتے ہیں اُن لوگوں کے لئے جو شکر گزار بننا چاہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمتِ بالغہ اور قدرتِ کاملہ سے زمین پر ہواؤں کی گردش کا نظام قائم کیا ہے۔ یہ ہوائیں آبی بخارات سے بھرے ہوئے بادلوں کو اُٹھاتی ہیں اور انھیں قانون قدرت کے مطابق کسی خطے کی طرف لئے جاتی ہیں جہاں منشائے ربی کے مطابق ان سے بارش برستی ہے۔

بارش جب کسی زمین پر برستی ہے، تو اگرچہ وہ پہلے بے آب و گیاہ پڑی ہوئی ہو اس سے طرح طرح کی نباتات اُگتی ہے۔

وہ اللہ جس نے اتنا بڑا نظام قائم کیا ہے یقیناً اس بات پر بھی قادر ہے

کہ مردوں کو دوبارہ زندہ کردے۔
اللہ تعالیٰ نے کائنات میں اپنی قدرت کی نشانیاں اس لئے بکھیری ہیں تاکہ انسان اللہ تعالیٰ کی یاد دہانی حاصل کرے۔
زمین دو قسم کی ہوتی ہے: زرخیز اور بنجر۔ زرخیز زمین کثرت سے پھلتی پھولتی ہے جب کہ بنجر زمین ناقص اور قلیل پیداوار ہی اُگا سکتی ہے۔

سورہ یونس(10)

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ مَا مِنْ شَفِیْعٍ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ○ (10:3)

بے شک تمہارا رب وہی اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ ادوار میں تخلیق کیا اور وہ تختِ اقتدار پر جلوہ فرمائے ہوئے ہے[1]۔ ہر کام کی تدبیر کرتا ہے[2] اُس کے ہاں اُس کی اجازت کے بغیر کوئی شفاعت کرنے والا نہیں۔ یہ اللہ ہے جو تمہارا رب ہے، پس اُسی کی عبادت کرو۔ تو کیا تم غور و فکر نہیں کرتے۔

1۔تشریح کے لئے دیکھیں سورہ الاعراف(7:54)نوٹ (1)، (2)، (3) اور (4)۔

2۔ ''تدبیر'' کا معنی ہے:''کسی کام کو اس طرح کرنا کہ وہ بہترین نتائج پیدا کرے''۔ یہاں اس کا مطلب یہ ہے کہ کائنات کے تمام معاملات کا انتظام اللہ تعالیٰ کے دستِ قدرت میں ہے۔ اُس کے تکوینی احکامات کائنات کے ذرّے ذرّے میں کار فرما ہیں۔ ہر شے کو اس نے وہ صفات دیں ہیں جو اس کے مقصدِ حیات کے ساتھ پوری مطابقت میں ہیں۔

''تدبیرِ امور''یعنی کائنات کے امور کی تدبیر ''عرشِ اقتدار پر متمکن ہونے'' کی تفسیر ہے۔

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِیَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا وَّ قَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِیْنَ وَالْحِسَابَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ○ اِنَّ فِی اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَّقُوْنَ ○(10:5-6)

وہی ہے جس نے سورج کو درخشاں اور چاند کو چمکتا بنایا[1] اور اس کے لئے منزلیں ٹھہرا دیں تاکہ تم سالوں کا شمار اور حساب معلوم کرو[2]۔ نہیں پیدا کیا اللہ نے اس (کائنات) کو مگر حق کے ساتھ۔ وہ اپنی نشانیوں کی وضاحت کرتا ہے اُن لوگوں کے لئے جو جاننا چاہیں۔

بے شک رات اور دن کے ایک دوسرے کے پیچھے چلے آنے میں، اور اُن چیزوں میں جو اللہ نے آسمانوں اور زمین میں پیدا کی ہیں، احساس رکھنے والوں کے لئے بڑی نشانیاں ہیں۔

1۔ قرآن کا معنی و مفہوم ہی نہیں اُس کی عبارت اور لفظوں کا انتخاب بھی ایک معجزہ ہے۔ اس آیت میں سورج کی روشنی کے لئے ''ضیا'' اور چاند کی روشنی کے لئے ''نور'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ عام استعمال میں دونوں روشنی کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ لیکن جب یہ ایک دوسرے کے مقابل استعمال ہوتے ہیں تو ضیاء سے مراد وہ روشنی ہوتی ہے جو کسی چیز کی ذاتی ہو اور نور اُس روشنی کو کہتے ہیں جو کسی اور شے سے لی گئی ہو۔ آج ہم جانتے ہیں کہ سورج کی روشنی اس کی اپنی ہے جو اس کے اندر ہونے والے نیوکلیائی تعاملات (Nuclear Reactions)

سے پیدا ہوتی ہے۔ جب کہ چاند کی روشنی اُس کی اپنی نہیں ہوتی بلکہ یہ سورج ہی کی روشنی ہے جو چاند کی سطح سے منعکس ہو کر ہم تک پہنچتی ہے۔

2۔ چاند زمین کے گرد گردش کرتا ہے۔ اپنی اس گردش کے دوران وہ زمینی مشاہدے کے لحاظ سے ''گھٹتا بڑھتا'' رہتا ہے (اس بات پر انحصار کرتے ہوئے کہ اُس کا کتنا حصہ سورج کے سامنے آتا ہے)۔ زمین کے گرد اس کا ایک چکر ستائیس دن، سات گھنٹوں اور تینتالیس منٹوں میں پورا ہوتا ہے۔لیکن زمین سے نظر آنے کے لئے اُسے مزید ایک یا دو دن لگ جاتے ہیں۔ اس لئے نیا چاند 29 یا 30 دن کے بعد نظر آتا ہے۔
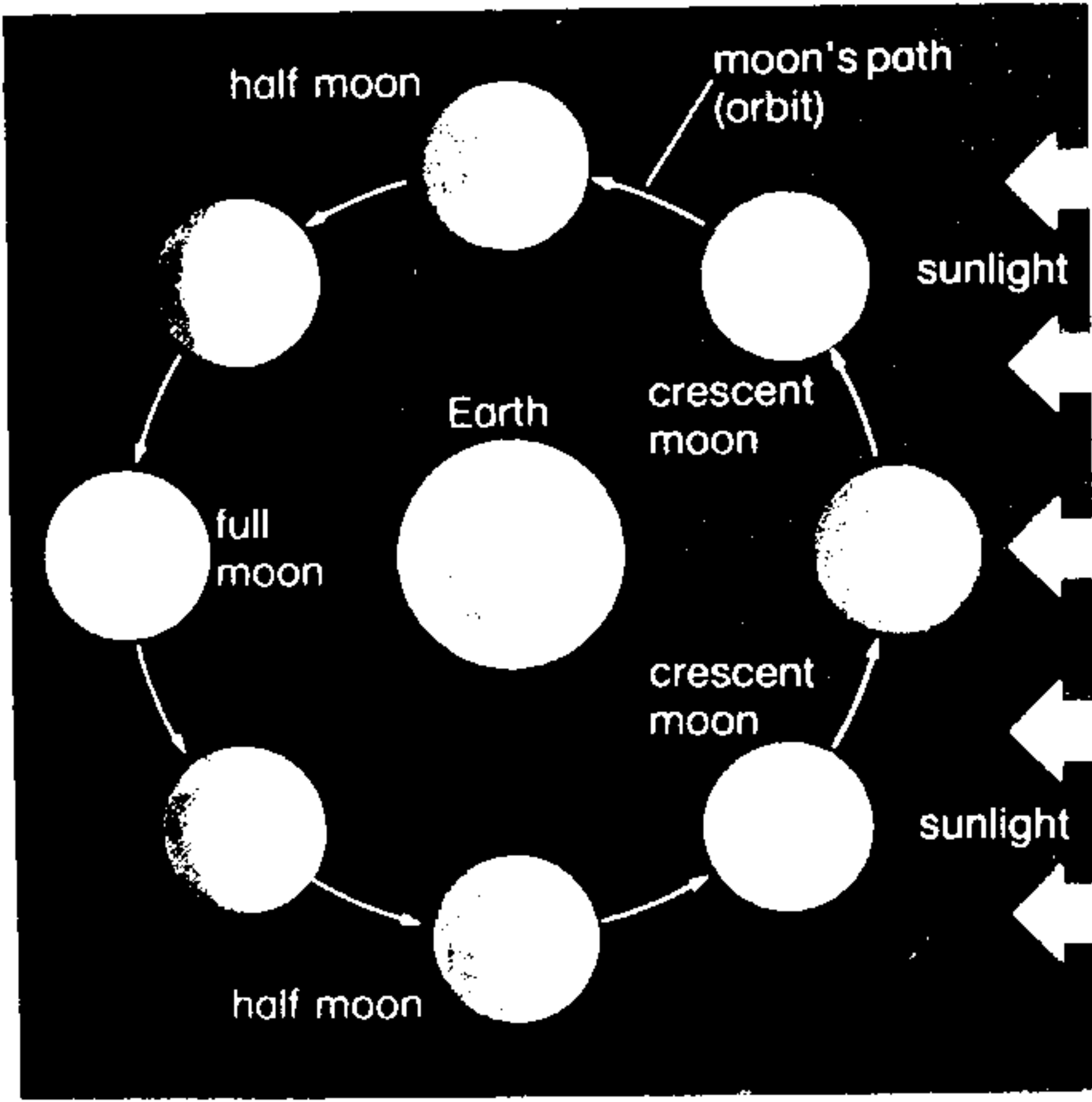
چاند کی منزلیں: چاند زمین کے گرد گردش کررہا ہے۔

چاند جب اپنے مدار میں گردش کرتا ہے تو وہ زمین سے مشاہدے کے اعتبار سے آسمان کے مختلف مقامات سے گزرتا ہے۔ انھیں چاند کی منزلیں کہا جاتا ہے۔ ہر رات چاند ایک نئی منزل میں ہوتا ہے۔
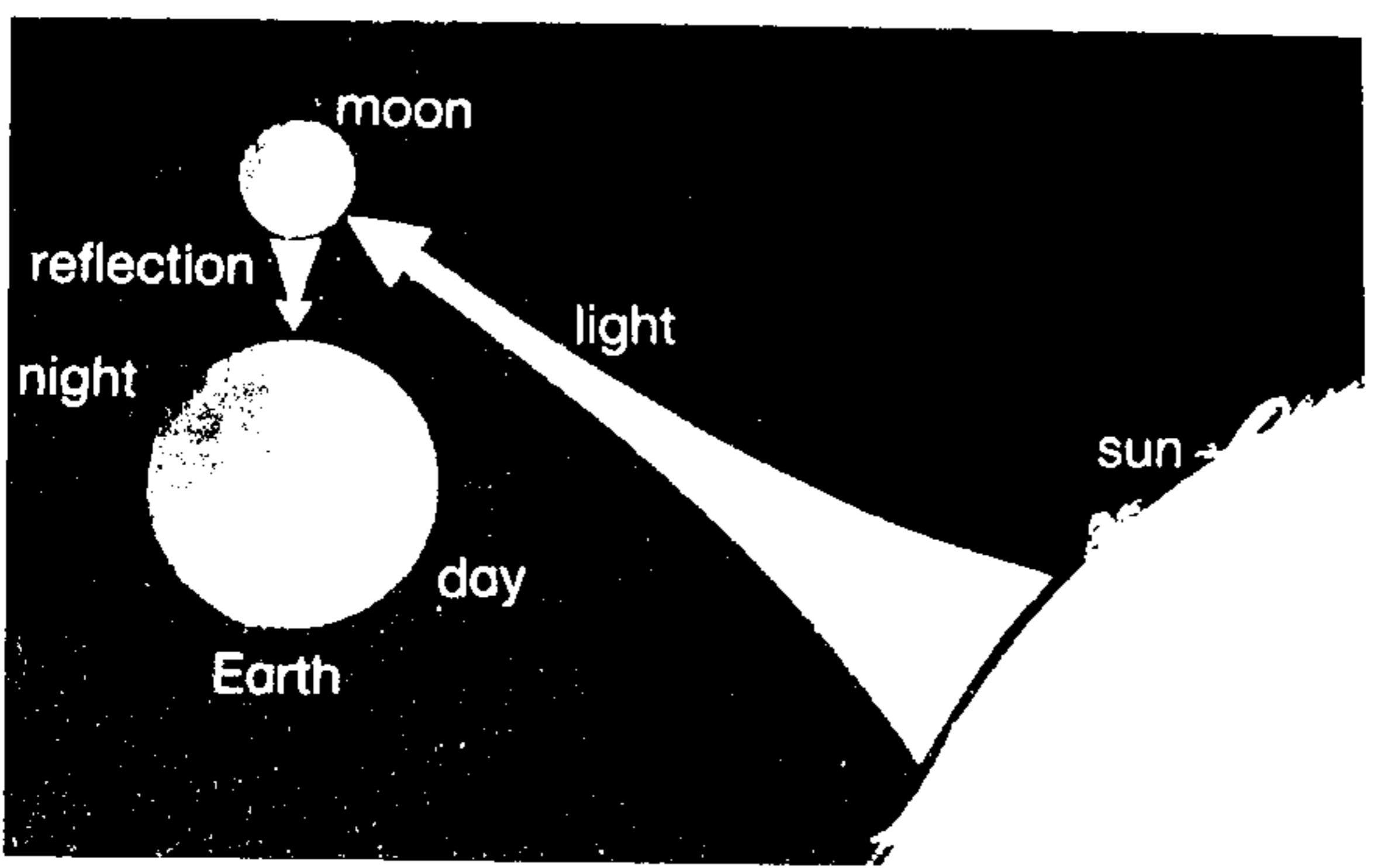
چاند سورج کی روشنی کو منعکس کرتا ہے۔

چاند کے اس گردشی نظام کی مدد سے انسان مہینوں، سالوں کا حساب کرتا ہے، تاریخ کا ریکارڈ رکھتا ہے اور آئندہ کی پیشین گوئیاں کرتا ہے۔ چنانچہ چاند کی گردش زمین کے باسیوں کے لئے ایک قدرتی "آسمانی جنتری" کا کام کرتی ہے۔ یہ ایک ایسا قدرتی نظام ہے جس سے ہر جگہ کے لوگ، چاہے خواص ہوں چاہے عوام یکساں طور پر فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور اٹھاتے چلے آئے ہیں۔

سورج کی تصویر۔ ایک بڑا شعلہ نظر آرہا ہے۔

هُوَ الَّذِىۡ يُسَيِّرُكُمۡ فِى الۡبَرِّ وَالۡبَحۡرِ ....

(10:22)

وہی ہے جو تمہیں خشکی اور تری میں سفر کراتا ہے۔...........

He it is who enables you to travel on land and sea.

اللہ تعالیٰ ہی نے انسان کو یہ تخلیقی صلاحیت دی ہے کہ وہ اپنے سفر کو باسہولت اور تیز تر کرنے کے لئے طرح طرح کی سواریاں بناتا ہے۔ خشکی پر سفر کے لئے اُس نے ٹرینیں اور چھوٹی بڑی گاڑیاں بنائیں، ہوائیں سفر کے لئے ہوائی جہاز بنائے۔ ان کی مدد سے انسان لمبی مسافتوں کو نہایت آسانی اور تیزرفتاری کے ساتھ طے کرسکتا ہے۔ اگر یہ تیز رفتار سواریاں نہ ہوں تو انسان سمندروں اور خشکی (صحراؤں، پہاڑوں، جنگلوں) کی وسعتوں میں کھوکر رہ جائے۔ اور صرف خشکی پر ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے میں عمریں صرف ہوجائیں۔

عہد حاضر میں تیز ترین ذرائع حمل و نقل (Means of Transportation) نے دُنیا بھر کے انسانوں کو اس طرح جوڑ دیا ہے کہ زمین گویا سکڑ کر ایک چھوٹا سا گاؤں بن گئی ہے۔ علم و فن، صنعت و تجارت اور تہذیب و تمدن کی موجودہ بیش تر ترقیوں کا آمدورفت کے جدید ذرائع کے بغیر تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔

هُوَ الَّذِىۡ جَعَلَ لَـكُمُ الَّيۡلَ لِتَسۡكُنُوۡا فِيۡهِ وَالنَّهَارَ مُبۡصِرًا ؕ اِنَّ فِىۡ ذٰ لِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوۡمٍ يَّسۡمَعُوۡنَ ۝ (10:67)

وہی ہے جس نے تمہارے لئے (پُرسکون) رات بنائی تا کہ تم اس میں آرام کرو اور روشن دن بنایا (تا کہ

تم اس میں معاش کے لئے جدو جہد کرو)۔ بے شک
اس میں ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو (بات کو)
سنتے ہیں۔

تشریح کے لئے دیکھیں سورہ البقرہ 2:164 نوٹ (4)، سور الانعام 6:96 نوٹ (3)۔

قُلِ انْظُرُوا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ
وَمَا تُغْنِي الْاٰيٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا
يُؤْمِنُوْنَ ○ (10:101)

ان سے کہو غور سے دیکھو! کیا کیا (عجائبات)
ہیں آسمانوں اور زمین میں۔
مگر نشانیاں اور خبردار کرنے والے ان لوگوں کو
کچھ فائدہ نہیں پہنچاتے جو ایمان نہیں لانا چاہتے۔

قرآن انسانوں کو دعوت دیتا ہے کہ وہ کائنات اور کائناتی مظاہر پر غور و فکر کریں۔

کائنات اور اس کی ایک ایک چیز، ایک ایک حرکت، ایک ایک تبدیلی اور ایک ایک مظہر (Phenomenon) اپنے خالق کی ہستی اور قدرت کی گواہی دیتا ہے۔ جو کوئی کائنات کا مشاہدہ کھلی آنکھوں سے کرے گا، وہ ضرور اس نتیجے پر پہنچے گا کہ اس کا کوئی خالق، رب اور قیوم ہے۔

مگر یہ نشانیاں اور تنبیہیں انہیں لوگوں کو فائدہ پہنچاتی ہیں جو اپنے اندر قبولِ حق کے لئے آمادگی پیدا کرتے ہیں۔ اور وہ لوگ جو جاہلانہ تعصبات پر جمے ہوئے ہوں اور ماننا ہی نہ چاہیں ان پر ان چیزوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ قبولِ حق کے لئے ذہن کو کھلا رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ۚ كُلٌّ فِي كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ○ (11:6)

اور کوئی جاندار نہیں زمین میں مگر یہ کہ اس کا رزق اللہ ہی کے ذمہ ہے[1] اور وہ جانتا ہے اس کے مستقر اور مستودع کو[2]۔ ہر چیز ایک روشن کتاب میں (لکھی ہوئی) ہے۔

1۔ دُنیا میں جانداروں کی بے شمار انواع اور اقسام پائی جاتی ہیں۔ مختلف انواع میں غذا کی نوعیت کا کم یا زیادہ فرق ہوتا ہے۔ ایک ہی فرد کی عمر کے مختلف حصوں میں غذا کی نوعیت اور مقدار مختلف ہوتی ہے۔

یہ اللہ تعالیٰ کا نظام ربوبیت و رزّاقیت ہے جس نے تمام جانداروں کی غذا کا اُن کی ضرورت کے مطابق انتظام کیا ہے۔

2۔ مستقر اور مستودع کی تشریح کے لئے دیکھیں 6:98 یہ بھی ممکن ہے کہ یہاں مستقر سے مراد جانداروں کی معاشی جدوجہد کا میدان ہے اور مستودع سے مراد اُن کی آرام گاہ ہے۔

وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ وَّكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَآءِ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا ۗ (11:7)

اور وہ (اللہ) وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین

کو چھ ادوار میں تخلیق کیا[1]۔ اور اس کا تختِ قدرت
پانی پر تھا[2]، تاکہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے عمل کے
لحاظ سے کون اچھا ہے۔

[اور وہ (اللہ) وہی ہے جس نے آسمانوں اور
زمین کو چھ ادوار میں تخلیق کیا، اور (جب زندگی کی تخلیق
کا ارادہ کیا تو) اس کا تختِ قدرت پانی پر قائم
ہوا(یوں بالآخراُس نے تمہیں پیدا کیا) تاکہ تمہیں
آزمائے کہ تم میں سے عمل کے لحاظ سے کون اچھا
ہے۔]

And He it is who has created the
heavens and the earth in six aeons;
and (ever since He has willed to create
life,) the throne of His almightiness has
rested upon water.

1۔آسمانوں اور زمین کی چھ ادوار میں تخلیق کی تشریح کے لئے دیکھیں
7:54 نوٹ 1 تا 5۔

2۔ یعنی ''اُس کے تخلیقی ارادہ نے پانی سے زندگی کا آغاز کیا۔'' جس
سے بالآخر انسان کا ظہور ہوا۔ آگے انسان کی تخلیق کا مقصد بیان کیا جارہا ہے:
(کہ انسان کی تخلیق اس لئے کی گئی کہ اُس کو آزمایا جائے کہ کون انسان اچھے اعمال
سرانجام دیتا ہے۔)

''ماء'' کا عام معنی تو پانی ہے مگر یہ لفظ (اور اسی طرح پانی یا Water
کا لفظ) بعض اوقات اُن چیزوں کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے جو اپنی طبیعی
خصوصیات (Physical Properties) میں پانی کی طرح ہوں۔ مثلاً بہنے
والی اشیاء (Fluids) یا مائعات (Liquids)۔ بعض مفسرین نے یہ قرار دیا ہے
کہ آسمانوں اور زمین کی تخلیق سے '' پہلے'' اُس کا عرش پانی پر تھا۔ اگر یہ معنی صحیح

ہے تو پانی سے مراد کوئی ایسا سیّال مادہ (Fluid) ہوسکتا ہے جس سے کائنات کی تخلیق کی گئی ہو۔ یہ بات یاد رہے کہ اپنی سیالیّت Fluidity کی بنا پر گیسوں کو بھی سیّال کہا جاتا ہے۔

لیکن راقم کے خیال میں یہاں "ماء" (پانی) کا لفظ اپنے عام معنی میں استعمال ہوا ہے اور ''عرشِ الٰہی کے پانی پر ہونے'' کا معنی ہوگا اسکی خلاقیت کا ظہور پانی پر ہوا جہاں سے اُس نے زندگی نمودار کی۔ اس مفہوم کو سورہ انبیاء کی آیت 30 سے تقویت ملتی ہے جس کی مزید تائید سورہ الملک کی آیت 2 سے ہوتی ہے (دونوں آیات کا مطالعہ کیجئے۔)

چنانچہ پانی سے زندگی کی تخلیق کا تصور قرآن میں موجود ہے جس کا ایک معنی ہے پانی کے واسطے میں زندگی کی پیدائش (یعنی اوّلیں جاندار کی پیدائش)۔

Creation of life in the medium of water.

انسان کے حوالے سے دُنیا کی اہم ترین چیز زندگی ہے۔ لہٰذا اس آیت کریمہ میں جہاں آسمانوں اور زمین کی خلقت کی بات کی گئی ہے وہاں ''پانی میں قدرتِ الٰہیہ کی کارفرمائی'' کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ كُلٌّ یَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی ؕ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ ○ وَهُوَ الَّذِیْ مَدَّ الْاَرْضَ وَجَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ وَاَنْهٰرًا ؕ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِیْهَا زَوْجَیْنِ اثْنَیْنِ یُغْشِی الَّیْلَ النَّهَارَ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ○ وَفِی الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّجَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّزَرْعٌ وَّنَخِیْلٌ صِنْوَانٌ وَّغَیْرُ صِنْوَانٍ یُّسْقٰی بِمَآءٍ وَّاحِدٍ قف وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰی بَعْضٍ فِی الْاُكُلِ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ○ (13:2-4)

اللہ ہی ہے[1] جس نے آسمانوں کو بلند کیا بغیر ایسے سہاروں کے جو تمہیں نظر آئیں[2] اور وہ تختِ اقتدار پر تمکن کئے ہوئے ہے[3]۔

اور اس نے سورج اور چاند کو مسخر کیا، ہر ایک رواں ہے وقت معین تک[4]۔ وہی ہر کام کی تدبیر کرتا ہے[5]۔ وہ (اپنی) نشانیوں کی وضاحت کرتا ہے تاکہ تم اپنے رب کی ملاقات کا یقین کرو۔

اور وہی ہے جس نے زمین کو (انسانوں اور دوسری مخلوق کے رہنے کے لئے) ہموار کیا[6]، اور اس میں پہاڑ اور دریا بنائے[7] اور ہر قسم کے پھلوں کے دو دو جوڑے پیدا کئے[8]۔ وہ رات کو دن پر ڈھانپ دیتا ہے[9]۔ بے شک ان چیزوں کے اندر اُن لوگوں کے لئے (اُس کی قدرت کی) نشانیاں ہیں جو غور و فکر کریں۔

اور زمین میں قطعات ہیں جو ایک دوسرے کے پاس ہیں[10]۔ اور انگوروں کے باغات ہیں، اور کھیتیاں ہیں، اور کھجوروں کے درخت ہیں بعض ایسے جو گروہوں کی شکل میں ایک ہی جڑ سے پھوٹتے ہیں اور بعض ایسے جو اکیلے اکیلے اُگتے ہیں[11]۔ سب کو ایک ہی پانی سے سیراب کیا جاتا ہے لیکن ہم غذائی پیداوار میں بعض (درختوں) کو بعض پر برتری دیتے ہیں[12]۔

بے شک اس کے اندر (اللہ کی قدرت کی) نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لئے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔

1۔ ان آیات میں اللہ کی قدرت اور کاریگری کی بہت سی نشانیوں کی طرف انسان کو متوجہ کیا گیا ہے۔ مثلاً

الف : آسمانوں کا نظر نہ آنے والے سہاروں کے ذریعے بلند کیا جانا۔

ب : سورج اور چاند کا مسخر ہونا۔

پ	:	سورج اور چاند اور دوسرے اجرام سماوی کا وقت معین تک اپنے اپنے راستوں پر رواں دواں ہونا۔
ت	:	زمین کا ہموار کیا جانا۔
ٹ	:	زمین میں پہاڑوں اور دریاؤں کا پیدا کیا جانا۔
ث	:	طرح طرح کے پھلوں کا پیدا کیا جانا۔ پھلدار پودوں میں نر اور مادہ کا وجود۔
ج	:	رات اور دن کا نظام۔
چ	:	زمین میں قطعات کا ہونا۔
ح	:	انگوروں کے باغات۔
خ	:	طرح طرح کی کھیتیاں۔
د	:	کھجوروں کے درخت۔
ڈ	:	تمام نباتات کا ایک ہی پانی سے سیراب کیا جانا مگر غذائی پیداوار میں مختلف ہونا۔

2۔ کائنات بہت وسیع ہے، اس میں انگنت کہکشائیں ہیں، ہر کہکشاں میں ان گنت ستارے اور دوسرے سماوی اجسام ہیں۔ یہ کائنات اتنی وسیع ہے کہ اس میں فاصلوں کے تعین کے لئے وضع کی گئی نوری سال (Light year) کی اکائی بھی بہت چھوٹی پڑ جاتی ہے۔

کائنات کا ایک زیر سرخ روشنی سے حاصل کردہ عکس

اتنے بے شمار سماوی اجرام وسیع کائناتی خلاء (Cosmic Space) میں اپنے اپنے مداروں میں رواں دواں ہیں۔ مگر ''گرتے'' نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں ایسے ستونوں پر تھاما ہوا ہے جو نظر نہیں آتے۔ یہ ستون کون سے ہیں؟ یہ جذب اور دفع کی قوتوں کا وہ توازن ہے جو تمام اجرام سماوی کو اپنے مداروں پر رواں دواں رکھتا ہے۔

کائنات کی تمام مادی اشیاء ایک خاص قوت سے ایک دوسرے کو کھینچتی ہیں۔ اس قوت کو قوتِ تجاذب (Gravitational force) کہا جاتا ہے۔ تمام ستارے، سیّارے اور دوسرے سماوی اجسام قوتِ تجاذب سے ایک دوسرے کو کشش کرتے ہیں۔

تمام اجرامِ سماوی تیز رفتاری کے ساتھ مخصوص مداروں پر حرکت کررہے ہیں۔ یہ حرکت انھیں ایک دوسرے سے دور تر رکھتی ہے اور انھیں ایک دوسرے میں گرجانے سے روکتی ہے۔

تجاذبی قوت اجرام سماوی کو ایک دوسرے کی طرف کھینچتی ہے اسے مرکز مائل قوت (Centripetal force) کہا جاتا ہے جبکہ حرکت سے پیدا ہونے والی قوت کو مرکز گریز قوت (Centrifugal force) کا نام دیا جاتا ہے۔

ان دونوں قوتوں کی مقدار برابر ہوتی ہے۔ جس کے باعث تمام اجسام اپنے اپنے راستوں پر رہتے ہوئے حرکت کرتے ہیں۔

اس کو ایک مثال سے سمجھئے۔ زمین سورج کے گرد گردش کرتی ہے۔ تجاذبی قوت اس کو سورج کی طرف کھینچ رہی ہے اگر زمین رُک جائے تو سیدھی سورج میں جاکر گر جائے مگر چونکہ وہ تیزی سے حرکت کررہی ہے جس کے باعث مرکز گریز قوت پیدا ہوتی ہے جو زمین کو سورج میں گر جانے سے روکتی ہے۔ چونکہ جذب اور دفع کی یہ دونوں قوتیں مقدار میں برابر ہوتی ہیں لہٰذا زمین اپنے مدار پر رہتے ہوئے گردش کرتی رہتی ہے۔ اگر تجاذبی قوت مرکز گریز قوت سے بڑھ جائے تو زمین سورج میں جاگرے گی اور اگر مرکز گریز قوت تجاذبی قوت سے زیادہ ہوجائے تو زمین اپنے مدار کو چھوڑ کر سورج سے دور کسی سمت میں نکل جائے گی۔

3۔ ''عرش پر متمکن ہونے'' کی تشریح کے لئے دیکھئے 7:54 نوٹ4۔

4۔ ''سَخَّرَ'' کا معنی ہے کسی چیز کو جبراً کسی مخصوص غرض کی طرف لے جانا (مفردات)۔ یہاں اس کا مطلب یہ ہے کہ سورج اور چاند اللہ تعالیٰ کے

قانون اور حکم کے پابند ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا قانون فطرت ہے جو ان کو جکڑ کررکھے ہوئے ہے۔ یہ اپنے معین مداروں پر چل رہے ہیں۔ دونوں سے انسان کی خدمت کا کام لیا جارہا ہے۔ سورج روشنی اور توانائی کا منبع ہے۔ چاند راتوں کو اپنی چاندنی سے جگمگاتا ہے۔ اس سے سمندروں میں مدوجزر پیدا ہوتے ہیں۔

خلاء سے کھینچی گئی زمین کی ایک تصویر

مگر یہ نظام ایک مقررہ وقت تک ہی ہوگا۔ ایک وقت آئے گا جب یہ کائنات اختتام کو پہنچ جائے گی۔

5۔ کائنات کے تمام امور کی تدبیر وہی کررہا ہے۔

"تدبیر" کی تشریح کے لئے دیکھیں(10:3) نوٹ (2)۔ یہ کائنات مسلسل بدلتی ہوئی (Ever-Changing) اور مسلسل آگے بڑھتی اور ارتقاء پاتی ہوئی (Ever- Evoluing) کائنات ہے۔ اس کی چھوٹی سے چھوٹی شے سے

لے کر بڑی سے بڑی سطح تک تمام امور کی تدبیر اللہ تعالیٰ ہی کر رہا ہے۔

6۔ یہاں ''مَدَّ'' کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کا معنی ہے پھیلانا، ہموار کرنا۔ یعنی زمین کو ایسا بنایا کہ اس پر انسان اور دوسرے جاندار زندگی بسر کر سکتے اور اپنی تخلیق کے مقصد کو حاصل کر سکتے ہیں۔

زمین کو پھیلانے اور ہموار کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ زمین چپٹی (Flat) ہے۔ جس طرح زمین پر بلند و بالا پہاڑوں کی موجودگی اُس کے گول ہونے کے خلاف نہیں بالکل اُسی طرح اُس کی سطح کا ہموار ہونا بھی اُس کے گول ہونے کے منافی نہیں ہے۔

یہاں پھیلانے سے مراد اُس کی سطح کا ایسا بنایا جانا ہے کہ اس پر جاندار زندہ رہ سکیں۔ نہ تو ساری زمین بلند و بالا پہاڑوں اور درّوں پر مشتمل ہے اور نہ ہی چپٹے میدانوں پر، بلکہ اس میں پہاڑ بھی ہیں اور میدان بھی جنگلات بھی ہیں اور صحرا بھی، خشکی بھی ہے اور سمندر بھی۔

7۔زمین کے ہموار کئے جانے اور پھیلائے جانے کے بیان کے فوراً بعد پہاڑوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس سے ہموار کرنے کا مفہوم صحیح صحیح سمجھ میں آ جاتا ہے۔

پہاڑوں کے وجود میں بہت سی حکمتیں اور مقاصد ہیں۔ یہاں پہاڑوں اور دریاؤں کا ایک ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پہاڑوں اور دریاؤں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر جمی ہوئی برف پگھل کر دریاؤں کی شکل اختیار کرتی ہے۔ اس طرح انسانوں اور دوسرے جانداروں کو میٹھا پانی حاصل ہوتا ہے۔

8۔ یہاں ''زوجین اثنین'' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ یعنی ''دو ارکان پر مشتمل جوڑے''۔ یعنی نر اور مادہ۔ اسی اعتبار سے یہاں پھلوں سے مراد درخت ہوں گے اور آیت کا مفہوم ہوگا۔ کہ ہر قسم کے درختوں میں نر اور مادہ پیدا کئے۔ دوسرے لفظوں میں یہ آیت عالمِ نباتات میں نر اور مادہ کے وجود کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ نزولِ قرآن کے زمانہ میں اگرچہ انفرادی طور پر بعض درختوں مثلاً کھجور میں نر اور مادہ کی موجودگی کا علم تھا لیکن یہ بات ایک کلی حقیقت کے طور پر معلوم نہ تھی۔ یہ قرآن کا اعجاز ہے کہ اُس نے سائنسی سطح پر اس حقیقت کی دریافت سے بہت پہلے اس بات کا ایک کلیہ کے طور پر انکشاف کیا۔

پودوں میں تولیدی اعضاٗ پھولوں میں پائے جاتے ہیں۔ عام طور پر نر اور مادہ اعضاٗ ایک ہی پھول میں واقع ہوتے ہیں۔ مثلاً کپاس۔

کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک درخت پر دوقسم کے پھول لگتے ہیں ایک قسم کے پھولوں میں نر اعضاً ہوتے ہیں اور دوسری قسم کے پھولوں میں مادہ اعضاً۔ مثلاً کھیرے کے خاندان (Cucurbitaceae family) کے اکثر پودے۔ بعض صورتوں میں ایسا ہوتا ہے کہ نر اور مادہ درخت ہی الگ الگ ہوتے ہیں مثلاً کھجور میں نر اور مادہ پودے علیحدہ علیحدہ ہوتے ہیں۔

نر اور مادہ تولیدی مادے کے ملاپ یا باروری (Fertilization) کے عمل سے پھل پیدا ہوتا ہے۔

9۔تشریح کے لئے دیکھیں سورہ الاعراف 7:54نوٹ 5۔

10۔ایک مفہوم تو بڑا واضح ہے کہ زمین کی سطح تمام کی تمام ایک سی نہیں ہے بلکہ اس میں قسم قسم کے قطعات (ٹکڑے، خطے اور علاقے) ہیں جو ایک دوسرے کے قریب قریب موجود ہونے کے باوجود کسی نہ کسی حد تک ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ مثلاً کہیں چکنی مٹی ہے تو کہیں ریت ہے۔کوئی زرخیز ہے تو کوئی بنجر اور شور زدہ ہے۔کوئی پھلوں کے باغات کے لئے مفید ہے تو کوئی اناج کے لئے وغیرہ۔ انسان اور دیگر جانداروں کی ضروریات بہت زیادہ ہیں اور ان میں بہت تنوع اور بوقلمونی پائی جاتی ہے۔ لہٰذا یہ مختلف قطعات مختلف ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں۔

جدید تحقیق کی بنیاد پر ہم قطعاتِ ارضی کا ایک اور مفہوم بھی بیان کرسکتے ہیں۔ آیت کے الفاظ ظاہراً مکمل طور پر جس کی تائید کرتے ہیں۔کرۂ زمین اوپر تلے مختلف تہوں (Layers)پہ مشتمل ہے۔ اس کی سب سے اوپر کی تہہ حجری کرہ یا لیتھوسفئیر (Lithosphere) کہلاتی ہے۔ یہ تہہ درجن کے لگ بھگ بڑے بڑے قطعات پر مشتمل ہے۔جنھیں تختیاں یا سلیں یا پلیٹیں (Plates) کہا جاتا ہے۔ ان پلیٹوں کی بنیاد پر زمین پر ہونے والے تغیرات کی تشریح کے لئے ایک نظریہ تشکیل دیا گیا ہے۔ جسے Plate tectonics (پلیٹوں کی حرکت کا نظریہ) کہا جاتا ہے۔

11۔زمین کی مختلف قسم کی پیداواروں کا ذکر ہے۔انگور، طرح طرح کی کھیتیاں (زرعی اجناس)، اور کھجور۔

صنوان اور غیر صنوان: اگر ایک ہی جڑ سے متعدد تنے پھوٹیں تو ایسے درختوں کو صنوان کہا جاتا ہے یعنی گروہ دار۔ اور اگر ایک جڑ سے ایک تنا پھوٹے تو انھیں غیر صنوان کہا جاتا ہے یعنی اکیلا۔

Date-palms growing in clusters from one root or standing alone.

12۔ غذائی نوعیت اور کیفیت (Quality) کے فرق کی طرف اشارہ ہے۔

13۔ قرآن مجید عقل و فکر کو جو اہمیت دیتا ہے اور انسانوں میں ان کو کام لانے کا جو احساس پیدا کرنا چاہتا ہے وہ ان آیات سے پوری طرح واضح ہے۔

هُوَ الَّذِي يُرِيكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَطَمَعًا وَيُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ ۚ وَيُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهِ وَالْمَلَائِكَةُ مِنْ خِيفَتِهِ ۚ وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيبُ بِهَا مَنْ يَشَاءُ وَهُمْ يُجَادِلُونَ فِي اللَّهِ ۚ وَهُوَ شَدِيدُ الْمِحَالِ ۝ (13:12-13)

(اللہ) وہی ہے جو تمہیں بجلی دکھاتا ہے جو خوف بھی پیدا کرتی ہے[1] اور امید بھی اور وہ بھاری بادلوں کو (ہوا کے دوش پر) اُٹھاتا ہے[2]۔ اور بجلی کی گرج اس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتی ہے، اور فرشتے بھی اس کے خوف سے (اس کی تسبیح کرتے ہیں۔) اور وہ کڑکتی بجلیاں بھیجتا ہے اور انھیں جن پر چاہتا ہے گراتا ہے[3] اور لوگ اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہی ہوتے ہیں اور وہ بڑی زبردست قوت والا ہے۔

1۔اللہ تعالیٰ کے قانون فطرت کے مطابق بادلوں میں بجلی کوندتی ہے۔ لوگ جان کی ہلاکت کے خوف سے اس سے ڈرتے ہیں لیکن انھیں اس بات کی

خوشی بھی ہوتی ہے کہ بارش ہوگی تو ان کی زمینیں سیراب ہوں گی۔

2۔ یہ اللہ تعالیٰ کا قانونِ فطرت ہے کہ ہوائیں بھاری بادلوں کو اٹھاتی ہیں۔ اور انھیں ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف لے جاتی ہیں۔ مثلاً سمندروں سے خشکیوں کی طرف۔

یہ امر غور طلب ہے کہ قرآن ''السحاب الثقال'' (بھاری بادل) کے الفاظ استعمال کررہا ہے۔ دور جدید میں بھی یہ بات ایک سائنسی حقیقت کے طور پر معلوم ہے کہ بڑے اور گہرے بادلوں میں ہزاروں لاکھوں ٹن پانی آبی بخارات کی شکل میں ہوتا ہے۔

3۔ بادلوں میں بجلیوں کا کڑکنا اور کسی مقام پر گرنا ارادہ اور مشیّتِ الٰہی کے مطابق ہوتا ہے اس کو ہم قانونِ فطرت کا نام دے سکتے ہیں۔

اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا ؕ وَمِمَّا يُوْقِدُوْنَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَآءَ حِلْيَةٍ اَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ ؕ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً ۚ وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ ؕ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ ؕ (13:17)

اُس نے اوپر سے پانی برسایا تو وادیاں اپنی اپنی گنجائش کے مطابق بہہ نکلیں(1)، پھر سیلاب نے ابھرتے جھاگ کو اُٹھالیا اور اسی طرح کا جھاگ ان چیزوں کے اندر سے بھی اُبھرتا ہے جن کو یہ زیور یا اسی قسم کی کوئی اور چیز بنانے کے لئے آگ میں تپاتے ہیں(2)۔ یوں اللہ حق اور باطل کی مثال بیان فرماتا ہے۔

پس جھاگ تو بے مصرف ہوکر اُڑ جاتا ہے لیکن

جو چیز لوگوں کو نفع پہنچانے والی ہوتی ہے وہ زمین میں باقی رہ جاتی ہے[3]۔ اسی طرح اللہ تمثیلیں بیان کرتا ہے۔

1۔ جب بارش کا پانی وادیوں اور ندی نالوں میں بہتا ہے تو جھاگ (یعنی گھاس پھونس، کوڑا کرکٹ وغیرہ) پانی کی سطح پر آجاتا ہے اور سطح پر تیرنے لگتا ہے۔

2۔ یہاں دھات کاری (Metallurgy) کی ایک قسم کی طرف انسانی ذہن کو متوجہ کیا گیا ہے۔ اِسے حرارتی دھات کاری یا (Pyrometallurgy) کہا جاتا ہے۔ جب کسی دھات کی کچ دھات (Ore) کو کچھ دوسرے اجزا شامل کرکے بلند درجہ حرارت پر گرم کیا جاتا ہے تو دھات کے لئے مطلوب حصہ نیچے چلا جاتا ہے اور غیر مطلوب حصہ جھاگ کی شکل میں سطح پر آجاتا ہے۔ اسے سلیگ (Slag) کہتے ہیں۔ اس کو اوپر سے نتھار کر علیحدہ کردیا جاتا ہے۔ (اس نکتے کو بہتر طور پر سمجھنے کے لئے کسی کتاب میں تانبے کی دھات کاری کا مطالعہ کیجئے۔)

3۔ یہاں قرآن نے اُن اصولوں میں سے ایک اہم اصول کی طرف انسان کی توجہ مبذول کرائی ہے جن پر اللہ تعالیٰ نے کائنات کو پیدا کیا۔

"جو چیز نفع بخش ہوتی ہے وہ باقی رہتی ہے اور بے مصرف چیز رائیگاں چلی جاتی ہے۔"

قوموں کے عروج و زوال کا بھی یہی معیار ہے۔ جب تک کوئی قوم افادیت، نفع رسانی اور فیض بخشی کا مظاہرہ کرتی ہے وہ عروج اور کمال کے مقام پر قائم رہتی ہے۔ لیکن جب وہ ان صفات سے خود کو محروم کردیتی ہے تو زوال کا شکار ہوجاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ قانون عام ہے، اس میں کسی قوم کا لحاظ نہیں کیا جاتا۔

یہ قانون پوری کائنات میں کارفرما ہے۔ (مادی کائنات میں بھی، پودوں کی دُنیا میں بھی اور عالمِ حیوانات میں بھی۔ اور اس کے علاوہ اس کے اخلاقی اور سماجی میدان میں بھی۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِیَ فِی الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ ۚ
وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَیْنِ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ ۚ
وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ؕ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ ۠
(14:32-34)

اللہ[1] ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے۔ اور اس نے بادل سے پانی اتارا اور اس سے مختلف قسم کے پھل تمہارے رزق کے لئے پیدا کئے۔
اور اس نے کشتی کو تمہارے لئے مسخر[2] کر دیا تاکہ وہ سمندر میں اُس کے حکم سے چلے، اور اس نے دریاؤں کو بھی تمہارے لئے مسخر کر دیا، اور سورج اور چاند کو بھی تمہارے لئے مسخر کر دیا جو مسلسل رواں ہیں (ایک نظام کے مطابق)۔ اور رات اور دن کو بھی تمہارے لئے مسخر کر دیا۔
اور اس نے تمہیں ہر اُس چیز سے بخشا جس کے تم طالب تھے، اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گننا چاہو گے

تو ان کو شمار نہ کر پاؤ گے بے شک انسان بہت زیادتی
کرنے والا از حد ناشکرا ہے۔

1۔ ان آیات (14:32-34)میں اللہ تعالیٰ نے اپنی گوناگوں نعمتوں کی طرف انسان کو متوجہ کیا ہے جو اس نے کائناتِ ارضی و سماوی میں انسان کے لئے مہیا کی ہیں۔ مثلاً

الف : آسمانوں اور زمین (یعنی کائنات) کی تخلیق۔
ب : بارش کے نظام کے ذریعے میٹھے پانی کی فراہمی۔
پ : نباتات کا اُگنا اور ان سے انسانوں کو رزق کی فراہمی ۔
ت : کشتی کا پانی میں چلنا (آبی ذرائع حمل ونقل)
ٹ : سمندروں کی نعمت۔
ث : دریاؤں کی نعمت۔
ج : سورج کا انسان کی خدمت میں لگا ہونا۔
چ : چاند کا انسان کی خدمت میں لگا ہونا۔
ح : رات اور دن کا انسان کی خدمت میں لگا ہونا۔

ان آیات میں چار مرتبہ "سخرلکم" (تمہارے لئے مسخر کردیا) کے الفاظ دوہرائے گئے ہیں۔ گویاانسان کو یہ شعور دیا جارہا ہے کہ کائنات کی کتنی ہی اشیاٗ ہیں جو اس کی بقا اورنشوونما کی ضروریات کو پورا کرنے میں مصروف ہیں۔

2۔ انسان کے لئے تسخیر کے معنی:

مسخر کرنے کے معنی ہیں کسی کو مجبور کرکے کسی کام پر لگانا، کسی کو کسی خاص مقصد کی طرف زبردستی لے جانا، قابو میں کرنا، اختیار دینا وغیرہ،

اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان (کائنات) کی اشیاء کو ایسا بنایا ہے کہ انسان کے لئے ان میں طرح طرح کے فائدے ہیں اور یہ کہ انسان اُن سے فائدہ اٹھاسکتا ہے اللہ تعالیٰ نے انسان کو یہ صلاحیت دی ہے کہ وہ انھیں اپنے کام میں لاسکتا ہے۔

کائنات میں اللہ تعالیٰ کے قائم کردہ قوانین اور ضابطے کارفرما ہیں، انھیں

ہم قوانینِ فطرت (Laws of nature) یا سائنسی قوانین (Scientific Laws) کا نام دیتے ہیں۔ دوسری طرف انسان کو اللہ تعالیٰ نے سوچنے سمجھنے، غوروفکر کرنے، اور نتائج اخذ کرنے اور اپنے ارادے کو بروئے کار لانے کی صلاحیت عطا کی ہے۔نتیجۂ انسان قوانینِ فطرت کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور جیسے جیسے وہ انھیں سمجھتا جاتا ہے، اسی طرح وہ کائنات کی اشیاء اور مظاہر کو سمجھتا اور اپنے فائدے کے لئے استعمال کرتا ہے۔ ایسی چیز کو تسخیر کہا جاتا ہے۔ آج ہمیں سائنس اور ٹیکنالوجی کے جو طرح طرح کے کرشمے نظر آرہے ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کی پیداکردہ اشیاء اور مظاہر کو اللہ کے بنائے ہوئے قوانین کے مطابق ہی استعمال کرنے کے نتیجے میں سامنے آرہے ہیں۔

وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ فَظَلُّوْا فِيْهِ يَعْرُجُوْنَ ۝ لَقَالُوْٓا اِنَّمَا سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُوْرُوْنَ ۝ع (15:14-15)

اور اگر ہم ان کے لئے آسمان میں کوئی دروازہ کھول دیں کہ اس میں چڑھیں۔ تو کہیں گے ہماری نگاہیں مخمور کردی گئی ہیں بلکہ ہم پر جادو کردیا گیا ہے۔

ان آیات میں حیرت انگیز طور پر اس بات کی پیشن گوئی موجود ہے کہ انسان کے لئے یہ ممکن ہوجائے گا کہ وہ ''آسمان'' یعنی ماورائے زمیں کائنات یا خلاء کے سفر پر جائے گا۔''آسمان کا دروازہ'' کھول دیں یعنی یہ ممکن بنادیں کہ انسان خلاء کے سفر پر نکلے۔اور دُور خلاؤں میں سے اللہ کی قدرت اور خلاقیت کے مظاہر کا مشاہدہ کرے۔

آیت 15 میں اُن کیفیات کی طرف بھی اشارہ کردیا گیا ہے جن سے خلائی سفر کے دوران ایک انسان گزرسکتا ہے۔''نگاہوں کے مخمور ہونے'' اور''جادو کئے جانے'' کے الفاظ پرغور کیجئے۔

نزولِ قرآن کے زمانے میں''آسمانوں'' میں چڑھنا ایک تصور و تخیل (Theory) تھا مگر آج ایک مسلّمہ حقیقت ہے۔

وَ لَقَدْ جَعَلْنَا فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّ زَیَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِیْنَ ۝ وَ حَفِظْنٰهَا مِنْ كُلِّ شَیْطٰنٍ رَّجِیْمٍ ۝ اِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ مُّبِیْنٌ ۝ (15:16-18)

اور ہم نے آسمان میں بروج[1] بنائے ہیں اور اُسے دیکھنے والوں کے لئے خوب مزین کیا ہے[2]۔

اور ہم نے ہر شیطانِ مردود سے اُسے محفوظ کیا ہے[3]، اگرکوئی چوری سے سُننا چاہے تو صاف ظاہر ہونے والا شعلہ اُس کا تعاقب کرے گا[4]۔

1۔"بُروج"، "بُرج" کی جمع ہے۔ وہ چیز جو ظاہر اور نمایاں ہو۔ اگر کوئی عورت اپنی زینت کو ظاہر و آشکارا کرے تو عرب کہتے ہیں:

تبرجت المرئة (عورت نے اپنی زینت کا اظہار کیا)۔ اس لغوی معنی کی مناسبت سے اس کا اطلاق اُن چیزوں پر ہونے لگا جو دور سے نمایاں ہوتی ہیں مثلاً قلعہ، محل، شاہراہ وغیرہ۔ طبری نے مجاہد اور قتادہ کی سند پر بروج کا مفہوم ستارے بیان کیا ہے۔ یہ ستاروں کے روشن اور نمایاں ہونے کے اعتبار سے ہے۔ اس اعتبار سے معنی ہوگا:

ہم نے آسمان میں روشن ستارے بنائے ہیں
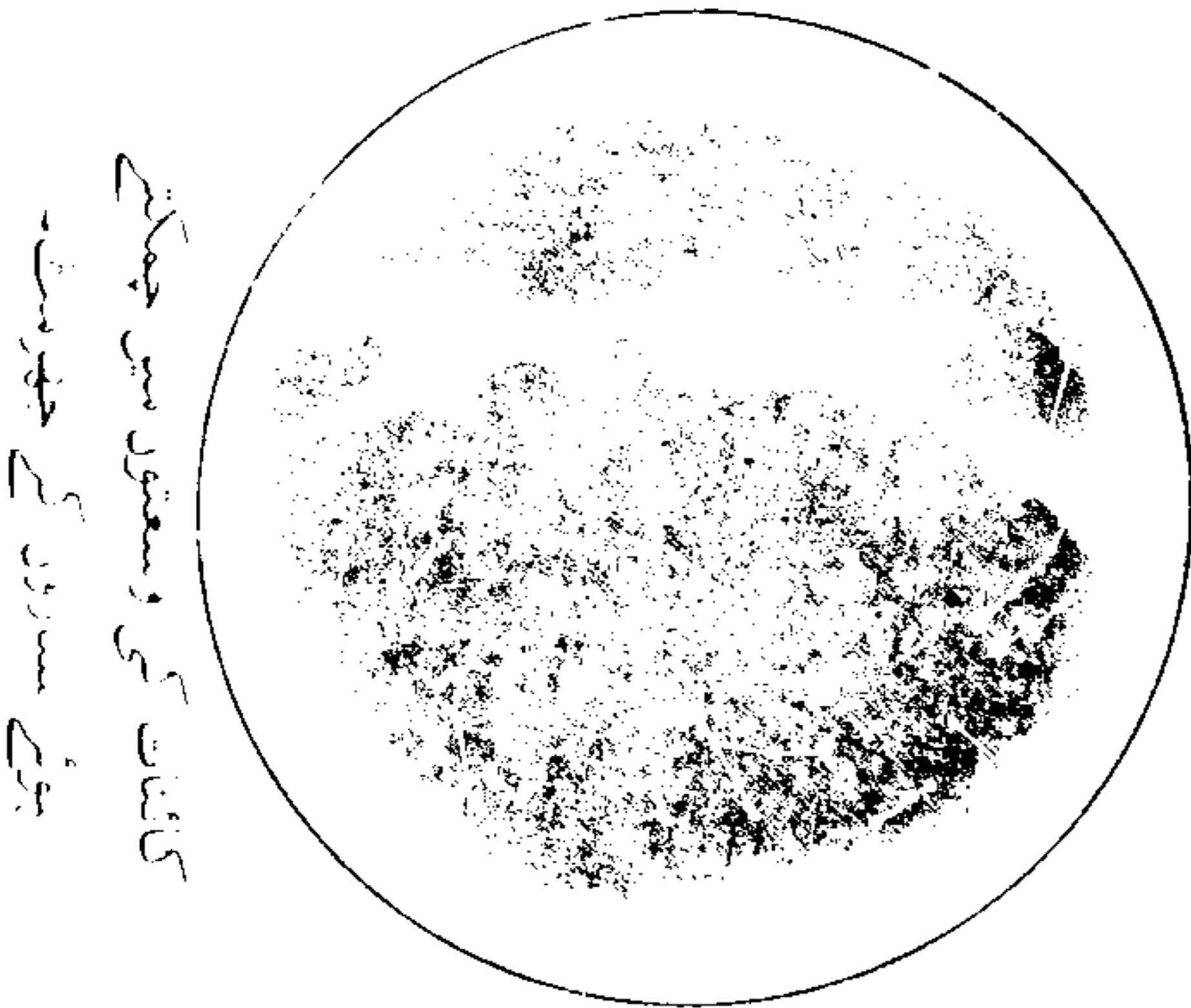
2۔دیکھنے والوں کے لئے (روشن ستاروں کی زینت سے) آسمان کو

آراستہ کیا ہے یہ آیت آسمانوں کے مشاہدے اور مطالعے کی دعوت دے رہی ہے مفہوم یہ ہے کہ ''ہم نے دیکھنے والوں کے لئے آسمان کو ستاروں کی زینت سے آراستہ کردیا ہے،(اب کون ہے جو اُسے دیکھے، اس کا مشاہدہ و مطالعہ کرے)''۔
دوسرے لفظوں میں یہاں Astronomy کی ترغیب دی گئی ہے اور اگلی آیت میں Astrology کی مذمت کی گئی ہے۔

آسمان ہر قسم کی شیطانی قوت کی دست درازی سے محفوظ ہیں کسی شیطانی قوت کے اختیار میں نہیں کہ وہ سماوی نظام میں دخیل ہوسکے۔

And we have made it secure against every satanic force accursed

شیطان کا معنی:

شیطان کے لغوی معنی میں دو قول ہیں: ایک یہ کہ یہ ''شطن'' سے مشتق ہے جس کے معنی دُور ہونے کے ہیں۔ اس اعتبار سے شیطان کا معنی ہوگا اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور ہونے والا، انحرافی راہوں پر چلنے والا، سرکش۔

دوسرے قول کے مطابق یہ شَاطَ یَشِیْطُ سے مشتق ہے جس کے معنی غصہ سے جل جانے کے ہیں۔ اس اعتبار سے شیطان کا معنی ہوگا وہ جو غصہ سے جلتا ہو۔ حسد، عناد اور نخوت کرنے والا۔

چنانچہ شیطان ہر سرکش کو کہتے ہیں خواہ جن و انس سے ہو یا دیگر حیوانات سے (ابوعبیدہ بحوالہ مفردات) اس کا اطلاق ہر قسم کی شیطانی قوت پر ہوتا ہے۔

رجیم کا معنی: یہ ''رَجَم'' کے مادے سے ہے جس کے معنی ہیں پتھر مارنا، ظن و تخمین اور اٹکل کے تکے چلانا۔ رجیم یا مرجوم (وہ جسے پتھر مارے گئے) کے معنی میں ہے یا ''راجم'' (پتھر مارنے والا) کے معنی میں۔ پہلے معنی کے اعتبار سے مفہوم ہوگا، دھتکارہ ہوا، مردود، راندہ درگاہ۔ جبکہ دوسرے معنی کے اعتبار سے مفہوم ہوگا وسوسوں کے پتھر مارنے والا، یا اٹکل کے تکے چلانے والا۔(اسی سے ''رجماً بالغیب'' ہے یعنی ظن و تخمین اور اٹکل سے کوئی بات کہنا)۔

یہاں Astrology(جسے بدقسمتی سے اردو میں ''علمِ نجوم'' کہاجاتا ہے) کے ذریعے غیب کے راز حاصل کرنے کی نفی گئی ہے۔

4۔ کسی کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ غیب کے راز چُرا سکے۔ اگر کوئی شیطانی طریقوں یا Occult Sciences سے غیب کے راز حاصل کرنے کی کوشش کرے گا تو اس کی تواضح صاف نظر آنے والے شعلے سے کی جائے گی یعنی وہ یہ نہ کر سکے گا۔

شہاب کا معنی: لغت میں ''شہاب'' شعلہ، چنگاری اور انگارہ کو کہتے ہیں۔ مثال کے طور پر سورہ النمل (27:7) میں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب کوہ طور پر آگ جلتی دیکھی تو اپنی زوجۂ محترمہ سے کہا:

اَوْ اٰتِیْکُمْ بِشِہَابٍ قَبَسٍ......

یا لے آؤں گا تمہارے پاس (اس آگ سے)

کوئی شعلہ سلگا کر......

بہر حال یہاں سے یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ شہاب عربی زبان کا ایک عام لفظ ہے جو شعلہ، چنگاری اور انگارہ کے معنی میں عام استعمال ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ یہ اُس روشنی کو بھی کہتے ہیں جو فضا میں شام کے بعد لمبی لکیر کی طرح نمودار ہوتی ہے اور پھر آناً فاناً غائب ہو جاتی ہے۔ اسے سائنسی اصطلاح میں'' Meteor'' کہا جاتا ہے۔

ان آیات کی تشریح میں مفسرین نے بہت کچھ کہا ہے، راقم کا رجحان اس طرف ہے کہ یہاں تمثیل اور کنایہ کے اسلوب میں کہانت اور Astrology کا رد کیا گیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ والہ واصحابہ وسلم کی جب بعثت ہوئی تو اس وقت کہانت اور ''علمِ نجوم'' (Astrology) کا بڑا چرچا تھا۔ جھوٹے غیب دان سادہ لوح لوگوں کو خوب لوٹتے تھے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ کوئی جن اُن کے ماتحت ہے جو انھیں غیب کی خبریں لاکر دیتا ہے، یا کہتے کہ وہ ستاروں کے مقامات کی بنیاد پر حساب کرکے غیب کی خبریں بتاتے ہیں۔

ان آیات میں ان کے گمانِ باطل کی تردید کی گئی ہے۔

وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُوْنٍ۝ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ وَمَنْ لَّسْتُمْ لَهٗ بِرٰزِقِيْنَ۝ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ ۚ وَمَا نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ۝

(15:19-21)

اور زمین کو ہم نے پھیلایا[1] اور اس میں (پہاڑوں کے) لنگر ڈالے[2]، اور اس میں ہر قسم کی چیزیں تناسب کے ساتھ اُگائیں[3]، اور اس میں ہم نے تمہاری معیشت کے وسائل رکھے اور اُن کی معیشت[4] کے بھی جنھیں تم روزی نہیں دیتے۔ اور کوئی چیز ایسی نہیں جس کے خزانے ہمارے پاس نہ ہوں لیکن ہم اُسے ایک معین اندازے کے ساتھ اتارتے ہیں[5]۔

1۔ زمین کو پھیلایا، ہموار کیا، رہنے کے قابل کیا دیکھیں 13:3 نوٹ نمبر 6۔

زمین میں وہ ارضیاتی تبدیلیاں آئیں جن کے نتیجے میں سطح زمین نے وہ شکل اختیار کی جس پر زندگی وجود میں آسکے اور قائم رہ سکے۔

2۔ دیکھیں 13:3 نوٹ نمبر 7۔

3۔''موزون'' وزن کیا ہوا''۔مطلب ہے کہ ہر چیز کو حکمت کے میزان پر تولا گیا ہے۔ یعنی ہر چیز کو اس حکمت پر پیدا کیا گیا ہے کہ وہ دنیا میں کب، کہاں اور کتنی ہونی چاہئے۔ علاوہ ازیں، ہر چیز کو مناسب حال خاصیتوں سے نوازا

گیا ہے۔

''اَنبات'' اُگانا۔ یہ ممکن ہے کہ یہ یہاں وسیع معنوں میں استعمال ہوا ہو جس میں زمین کی تمام مخلوقات انسان، حیوانات، نباتات اور جمادات شامل ہوں۔

4۔ ''مَعَایِش'' (معیشۃ کی جمع) زندگی کے وسائل و ذرائع۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں اور دوسرے جانداروں کے لئے انواع واقسام کے وسائلِ زندگی پیدا کئے ہیں۔

5۔ یعنی تمام چیزیں ''قدرتِ خدا'' کے خزانے میں ہیں اس میں سے کسی چیز کو جتنی مقدار میں وہ ضروری اور قرین مصلحت سمجھتا ہے وجود میں لاتا ہے۔ (یہاں نزول کا لفظ ایجاد اور تخلیق کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔)

وَاَرْسَلْنَا الرِّيٰحَ لَوَاقِحَ فَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَسْقَيْنٰكُمُوْهُ وَمَآ اَنْتُمْ لَهٗ بِخٰزِنِيْنَ ۝
(15:22)

اور ہم ہی ہواؤں کو بار آور بنا کر چلاتے ہیں[1]۔ پھر ہم بادل سے بارش نازل کرتے ہیں۔ پھر ہم تمہیں اس سے سیراب کرتے ہیں اور یہ تمہارے بس میں نہ تھا کہ تم اس کے ذخیرے جمع کر کے رکھتے[2]۔

1۔'' لواقح'' ، ''لقح'' کے معنی حاملہ کرنے اور بار آور بنانے کے ہیں۔ ''لواقح''،''لاقحہ'' کی جمع ہے اس کا معنی ہے ''بار آور کرنے والی''۔ ہوائیں درختوں کو بھی بار آور کرتی ہیں اور بادلوں کو بھی۔ درختوں کو اس طرح کہ اُن کے پھولوں کے نرتولیدی مادّے (زیرہ دانوں: Pollens grains) کو مادہ حصوں پر لاکر ڈال دیتی ہے۔ اس عمل کو سائنس کی زبان میں زیرگی (Pollination) کہا جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں مادہ حصہ بار آور (Fertilized) ہوجاتا ہے اور نشوونما پاکر پھل بنا دیتا ہے۔

بادلوں کو ہوائیں اس طرح بار آور کرتی ہیں کہ یہ سمندروں وغیرہ کی سطح سے آبی بخارات کو اٹھاتی ہیں اور انھیں جمع کر کے بادلوں کی شکل دینے میں کردار ادا کرتی ہیں۔

یہاں یہ دونوں مفہوم مراد ہوسکتے ہیں اور دونوں میں کوئی تضاد نہیں لہٰذا دونوں بہ یک وقت مراد بھی ہوسکتے ہیں۔

ہوا کا ایک اہم کام آبی بخارات کو اُٹھانا، جمع کرنا اور ایک مقام سے دوسرے مقام پر لے جانا ہے۔ سورج کی تپش جب سمندروں وغیرہ کی سطح سے پانی کو بخارات میں تبدیل کرتی ہے تو ہوا اپنی مسلسل حرکت کی وجہ سے انھیں اُٹھاتی اور مجموعی طور پر عموماً کسی ایک سمت میں چلاتی رہتی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہوا میں آبی بخارات کی تعداد بڑھتی جاتی ہے حتیٰ کہ وہ آبی بخارات سے مکمل طور پر بھر جاتی ہے اس وقت وہ سائنس کی زبان میں پُر سیر شدہ (Supersaturated) کہلاتی ہے۔ یہی وہ ہوا ہے جو بادلوں کی شکل اختیار کرتی یا پہلے سے موجود بادلوں کا حصہ بنتی ہے، ممکن ہے کہ اسی طرح کی ہواؤں کو بارآور ہوائیں کہا گیا ہو۔

بادل کیسے بنتے ہیں: پُر سیر شدہ ہوا جب اوپر اٹھتی ہے تو اس میں پھیلاؤ (expansion) ہوتا ہے جس سے یہ ٹھنڈی ہونے لگتی ہے اس دوران آبی بخارات ہوا میں موجود گرد (dust) کے باریک ذرات (aerosol particles) پر جمع ہونا شروع ہوجا تے ہیں جس سے ''باریک قطرے'' (droplets) وجود میں آتے ہیں۔ یہ وہ چیز ہے جسے بادل کہا جاتا ہے۔ موافق حالات کے تحت باریک قطرے آپس میں مل کر بڑے قطرے بناتے ہیں۔ جو کہ مختلف عوامل پر انحصار کرتے ہوئے بارش، برف یا دوسری شکلوں میں زمین پر برستے ہیں۔

قرآن کے ریاحِ لواقح کی اصطلاح استعمال کر کے ہواؤں کے اس کردار کو واضح کردیا ہے جو وہ بادلوں کے بننے اور برسانے میں ادا کرتی ہیں۔

And We send the fecundating winds, then cause the rain to descend from the sky.

ہم بھیجتے ہیں بار آور ہوائیں پھر برساتے ہیں آسمان سے بارش۔

ہوائیں نباتات میں بارآوری (سائنسی زبان میں زیرگی

(pollination) میں بنیادی کردار ادا کرتی ہیں۔ ایک پھول کے نر حصہ سے زیرہ دانوں (Pollen grains) کو اُسی پھول یا کسی اور پھول کے مادہ حصے (بیضہ دان : Ovary) تک پہنچاتی ہیں اور اسی طرح یک صنفی (Unisexual) درختوں میں نر درخت کے زیرہ دانوں کو مادہ درخت کے تولیدی حصوں تک پہنچاتی ہیں۔ یہ بہت بڑا کام ہے جو ہوائیں سرانجام دیتی ہیں۔

دنیا میں بے شمار نباتات (درخت، جڑی بوٹیاں اور دوسرے پودے) ہیں جن میں اس عمل کی ضرورت ہوتی ہے۔ دُنیا کے سارے انسان مل کر بھی اس کام کا اربواں حصہ بھی سرانجام نہیں دے سکتے۔ یہ اللہ تعالیٰ ہی کی کاریگری ہے کہ ہر وقت گردش کرتی ہوئی ہوائیں خاموشی سے اس کام کو سرانجام دیتی رہتی ہیں۔ اور اس طرح نباتات کے پھلنے، پھولنے پھیلنے اور نشوونما پانے کا باعث بنتی رہتی ہیں۔

2۔ پانی کے ذخیرے جمع کرکے رکھنا: ممکن ہے اس میں بارش کی شکل میں برسنے سے پہلے پانی کے بادلوں کی شکل میں ذخیرہ کرنے کی طرف اشارہ ہو۔ معنی ہوگا کہ ان بادلوں پر تمہارا کوئی بس نہیں جو کہ زمین پر میٹھے پانی کا اصل منبع ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ ہی کی قدرت ہے جو بادلوں کی شکل میں پانی کا اتنا وسیع ذخیرہ اکٹھا کرتی ہے جو اللہ کی مشیّت کے مطابق زمین پر برستا ہے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ اس میں بارش کے برسنے کے بعد پانی کے ذخیرہ کرکے رکھنے کی طرف اشارہ ہو۔ یعنی تم میں یہ طاقت نہیں کہ بارش برسنے کے بعد زیادہ مقدار میں پانی جمع اور محفوظ رکھ سکتے اس لئے اللہ تعالیٰ بار بار بارش برساتا ہے تاکہ تمہیں مسلسل طور پر پانی مہیا ہوتا رہے۔ نیز پانی کو پہاڑوں، کی چوٹیوں پر برف کی صورت میں منجمد کرکے رکھتا ہے جہاں سے دریاؤں، چشموں وغیرہ کی صورت میں اہل زمین کو پانی ملتا رہتا ہے۔ علاوہ ازیں پانی کی وسیع مقدار سطح زمین کے نیچے زیرِ زمین پانی (Ground water) کی شکل میں محفوظ رہتی ہے جسے کنویں کھود کر نکالا اور کام لایا جاتا ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُونٍ ۝ وَالْجَانَّ خَلَقْنَاهُ مِن قَبْلُ مِن نَّارِ السَّمُومِ ۝ (15:26-27)

اور بے شک ہم نے انسان کو سیاہ متغیر کیچڑ کی
نرم مٹی سے پیدا کیا ہے[1]۔ اور ہم نے جنوں کو اس
سے پہلے بے دھویں کی سخت آگ سے پیدا کیا[2]۔

2۔صلصال: کے مفہوم میں کئی آراء پائی جاتی ہیں۔ اس کا ایک معنی بدبودار مٹی یا سڑی ہوئی مٹی یا دوسرے لفظوں میں متغیر مٹی یا گارا یا کیچڑ کیا گیا ہے اور یہ عربی کے محاورے صَلّ اللحم (گوشت خراب ہوگیا، گوشت نے بوچھوڑ دی، گوشت متغیر ہوگیا) سے ماخوذ ہے۔ سائنسی اعتبار سے یہاں یہ اس صورت میں صحیح ہے کہ اس کا معنی متغیر گارا/ کیچڑ لیا جائے۔ اس کا مطلب ہوگا کیمیائی طور پر تبدیل شدہ مٹی یا ایسی مٹی جو کیمیائی تبدیلیوں سے گزر رہی ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی ایک روایت کے مطابق صلصال کے ایک معنی پتلی اور نرم مٹی (الطین المرقق) ہے جس سے مٹی کے برتن بنائے جاتے ہیں (روح المعانی)۔ ہم نے ترجمہ میں اسی معنی کو اختیار کیا ہے۔

صلصال کا ایک معنی ہے وہ خشک مٹی جو مارنے پر آواز پیدا کرے یعنی کھنکھنانے والی یا بجنے والی مٹی۔ یہ وہ مٹی ہے جو آگ پر پکائی نہ گئی ہو۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ہی سے ایک قول منسوب ہے کہ صلصال وہ عمدہ پاکیزہ کیچڑ ہے جس میں پانی سوکھ جانے کی وجہ سے شگاف پیدا ہوجاتے ہیں اور جب اس کو (اس کی جگہ سے) ہلایا جاتا ہے تو کھڑ کھڑ کی آواز دیتی ہے (تفسیر مظہری)۔

''حماء'':سیاہ مٹی، وہ مٹی جو پانی میں پڑے پڑے سیاہ ہوگئی ہو۔

''مسنون'':مسنون کے کئی معنی بیان کیئے گئے ہیں۔ اس کا ایک معنی متغیر کیا جاتا ہے۔ ہر وہ چیز جس پر سال ہا سال گزرنے سے تغیروتبدل آگیا ہو (نعمانی)۔ اس کا ایک دوسرا معنی ہے قالب میں ڈھلا ہوا۔ وغیرہ

2۔ سادہ ترین لفظوں میں آیت کا مفہوم ہم یوں بیان کرسکتے ہیں کہ جنوں کی تخلیق حرارتی توانائی سے کی گئی ہے۔

وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ وَّمَنَافِعُ وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ۝ وَلَكُمْ فِيْهَا جَمَالٌ حِيْنَ تُرِيْحُوْنَ وَحِيْنَ تَسْرَحُوْنَ ۝ وَتَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ اِلٰى بَلَدٍ لَّمْ تَكُوْنُوْا بٰلِغِيْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ اِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝ وَّالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيْرَ لِتَرْكَبُوْهَا وَزِيْنَةً وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ (16:5-8)

اور اس نے چوپائے پیدا کیے، تمہارے لئے ان میں گرم لباس بھی ہے اور دیگر فائدے بھی، اور ان سے تم غذا بھی حاصل کرتے ہو[1]۔ اور ان میں تمہارے لئے زیب و زینت بھی ہے جب تم ان کو شام کو (چرا کر) گھر واپس لاتے ہو، اور جب تم (صبح) ان کو چرنے کو چھوڑتے ہو[2]۔

اور وہ تمہارے بوجھ ایسے خطوں تک اُٹھا لے جاتے ہیں جہاں تم شدید مشقت کے بغیر پہنچنے والے نہیں بن سکتے تھے۔ بے شک تمہارا رب بڑا ہی شفیق اور بہت مہربان ہے[3]۔

اور اُسی نے گھوڑے اور خچر اور گدھے پیدا کئے ہیں کہ تم ان پر سوار ہو[4] اور وہ (تمہارے لئے) زینت[5] بھی ہیں۔ اور وہ ایسی چیزیں پیدا کرے گا

جن کو تم نہیں جانتے(6)۔

1۔ جانور طرح طرح سے انسان کے کام آتے ہیں۔ ان کی اون، بالوں اور رؤوں اور چمڑے سے مختلف قسم کے ملبوسات اور اوڑھنے بچھونے کی چیزیں بنائی جاتی ہیں جو انسان کو سردی اور گرمی سے بچاتی ہیں۔

بعض جانوروں کا دودھ پیا جاتا ہے۔ بعض کا گوشت کھایا جاتا ہے۔ ان کی چربی اور ہڈی کے کئی استعمالات ہیں۔ان کے گوبر کو قدرتی کھاد کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔یہ سواری اور باربرداری کے کام آتے ہیں۔ (مزید دیکھیں 6:142)

2۔یہ جانوروں کے نفسیاتی اور معاشی فوائد کی طرف اشارہ ہے۔ یہ ''جمال'' (زیب و زینت، حُسن، شان، دلکشی) معاشی استحکام، خود انحصاری اور آزادی کا جمال ہے۔ ''جمال'' گھر اور معاشرہ کی خوشحالی کا علامتی اظہار ہے۔ جو لوگ دوسروں کے دست نگر ہوں، قرضوں کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہوں، زندگی کی ایک ایک نعمت کو ترستے ہوں، صحت اور علاج معالجہ کے مسائل میں گھرے ہوئے ہوں انھیں کیا خبر کہ ''جمال'' کیا چیز ہے۔

یہ نکتہ بھی توجہ طلب ہے کہ یہاں پہلے جانوروں کے چراگاہوں سے گھروں کو لوٹنے کا ذکر ہے اور بعد میں چراگاہوں کی طرف لے جانے کا۔ جب جانور چراگاہوں سے چر کر واپس آتے ہیں تو وہ شکم سیر ہوتے ہیں اور بہت سے مادہ جانوروں کے پستان دودھ سے بھرے ہوتے ہیں۔ یہ چیز ان کے مالکوں کے اطمینان اور خوشی کا باعث ہوتی ہے، پھر یہ ان کے مالکوں کے لئے مشقت اور محنت سے آرام اور راحت کی طرف واپسی کا مرحلہ ہے۔

3۔ بار برداری کی طرف اشارہ ہے۔

4۔ خاص طور پر گھوڑے، گدھے اور خچر کا ذکر ہے جن پر انسان سواری کرتا ہے اور بار برداری کا کام بھی لیتا ہے۔

5۔ یہاں ''زینت'' کا لفظ توجہ طلب ہے۔ اوپر ''جمال'' کا لفظ استعمال ہوا تھا۔ اور یہاں یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ جو کہ نفسیاتی اطمینان کی حالت کی طرف اشارہ ہے۔

6۔ سواریوں کے ذکر کے بعد یہ ٹکڑا بڑا معنی خیز ہے۔ اس میں مستقبل میں ایجاد ہونے والے تمام ذرائع نقل و حمل (Means of Transportation) کی پیشن گوئی موجود ہے۔ جدید ذرائع حمل و نقل (بری، بحری، ہوائی) نزولِ قرآن کے زمانے میں موجود نہ تھے اور اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ مستقبل میں اور کیا کیا ذرائع ایجاد ہوں گے۔

اس سے یہ بھی پتا چلا کہ مثبت اور تعمیری انسانی سرگرمیاں اللہ ہی کی منشا کی تکمیل کر رہی ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے کسی چیز کو پیدا کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ وہ انسانوں کے ذریعے سے پیدا کرتا ہے۔

هُوَ الَّذِيٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً لَّكُمْ مِّنْهُ شَرَابٌ وَّمِنْهُ شَجَرٌ فِيْهِ تُسِيْمُوْنَ۝ يُنْۢبِتُ لَكُمْ بِهِ الزَّرْعَ وَالزَّيْتُوْنَ وَالنَّخِيْلَ وَالْاَعْنَابَ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ۝ (16:10-11)

وہی ہے جس نے بادل سے پانی برسایا جس سے تم پیتے بھی ہو[1]، اور اسی سے سبزہ بھی اُگتا ہے جس میں تم (مویشیوں کو) چراتے بھی ہو۔ وہ اسی سے تمہارے لئے کھیتی، زیتون، کھجور، انگور اور (ان کے علاوہ) ہر قسم کے پھل پیدا کرتا ہے[2]، بے شک اس میں (قدرتِ الٰہی کی) بہت بڑی نشانی ہے ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر کرتے ہیں[3]۔

1۔میٹھے پانی (Fresh water)کا بنیادی ذریعہ بارش ہے۔ یہ انسان کے پینے کے کام آتا ہے۔ اس سے نباتات اُگتی ہیں۔

2۔چند چیزوں کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ اناج کے کھیت، زیتون،

کھجور، انگور، اور قسم قسم کے پھل۔

3۔ قوتِ فکر کو کام میں لانے کی ترغیب و تحریک ہے۔

وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۙ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۭ وَالنُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمْرِهٖ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝ۙ وَمَا ذَرَاَ لَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ ۝ وَهُوَ الَّذِيْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا وَّتَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا ۚ وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝

(16:12-14)

اور اُس نے رات اور دن، اور سورج اور چاند کو تمہارے لئے مسخر کیا ہے اور ستارے بھی اُس کے حکم سے مسخر ہیں۔ بے شک اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔ اور جو چیزیں زمین میں تمہارے لئے مختلف قسموں کی پھیلائیں ہیں (انھیں بھی مسخر کیا ہے)۔ بے شک اس میں بڑی نشانی ہے ان لوگوں کے لئے جو یاد دہانی حاصل کرتے ہیں[1]۔

اور وہی ہے جس نے سمندر[2] کو مسخر کیا ہے تا کہ تم اس سے تازہ گوشت کھاؤ، اور اس سے زیور نکالو جو تم پہنتے ہو، اور تم کشتیوں کو دیکھتے ہو کہ اس میں چیرتی ہوئی چلتی ہیں (تا کہ تم اس میں سفر کرو) اور تا کہ تم

اس کے فضل کے طالب بنو اور تاکہ تم اس کے شکر
گزار بنو۔

1۔ ''مسخر'' کرنے کے معنی کے لئے دیکھیں 14:32 نوٹ(2)۔
اللہ تعالیٰ نے رات اور دن، اور سورج، چاند اور ستاروں کو انسان کے
لئے مسخر کیا ہے۔ یعنی ایسا بنایا ہے کہ انسان اُن سے فائدہ اٹھاسکتا ہے۔
اسی طرح زمین کی چیزوں حیوانات، نباتات اور معدنیات اور دوسری
اشیاء کو بھی انسان کے لئے مسخر کیا ہے۔ اب یہ انسان کا کام ہے کہ وہ اپنی عقل و
فکر کو کام میں لائے اور ان نعمتوں سے فائدہ حاصل کرے۔
ان گوناگوں نعمتوں کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ انسان ان سے اللہ تعالیٰ
کی معرفت اور آخرت کی یاد دہانی حاصل کرے۔
''بحر'' کا لفظ سمندر اور دریا دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے یہاں
بحر کے تین اہم فائدوں کا ذکر کیا گیا ہے:

الف : انسان اس سے تازہ گوشت (غذا کا سامان) حاصل کرتا ہے۔
ب : زیب و زینت کا سامان نکالتا ہے، اور
ج : نقل وحمل کے لئے اسے استعمال کرتا ہے۔

''لحماً طریاً'' (تازہ گوشت) کے الفاظ سے سمندری غذا (Sea
food) کی اہمیت واضح کی گئی ہے۔ سمندر سے سالانہ لاکھوں ٹن گوشت حاصل کیا
جاتا ہے۔ مستقبل میں سمندری غذا کی اہمیت بہت بڑھ جائے گی۔
سمندری غذا اپنی غذائی قدر و قیمت کے لحاظ سے بھی بہت
اہم ہے۔
ان بے شمار نعمتوں کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنے خالق کا شکر گزار بندہ بنے۔

وَاَلْقٰى فِى الْاَرْضِ رَوَاسِىَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ وَ
اَنْهٰرًا وَّسُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۙ
وَعَلٰمٰتٍ ؕ وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ ۝
(16:15-16)

اور اس نے زمین میں پہاڑ ڈالے کہ وہ تمہیں لے کر لرزتی نہ رہے[1]۔ اور نہریں جاری کیں[2] اور راستے نکالے تا کہ تم راہ پاؤ۔ اور دوسری علامتیں بھی ہیں اور ستاروں سے بھی یہ (لوگ) راہ معلوم کرتے ہیں۔

1۔''تمید'' کا لفظ ''مَیْد'' سے مشتق ہے جس کا معنی ہیں لرزنا، تھرتھرانا، ڈولنا وغیرہ۔ (جیسا کہ زلزلے کے موقع پر زمین لرزتی ہے، یا جیسا کہ ہوا سے درختوں کی شاخیں اوپر نیچے اور دائیں بائیں حرکت کرتی ہیں۔)
یہاں پہاڑوں کے اہم فائدے کی طرف انسان کی توجہ مبذول کرائی گئی ہے۔ پہاڑ سطحِ زمین کو سختی اور مضبوطی عطا کرتے ہیں اور اُسے اندرونی اور بیرونی عوامل کے زیرِ اثر لرزنے اور بے توازن ہونے سے بچاتے ہیں۔
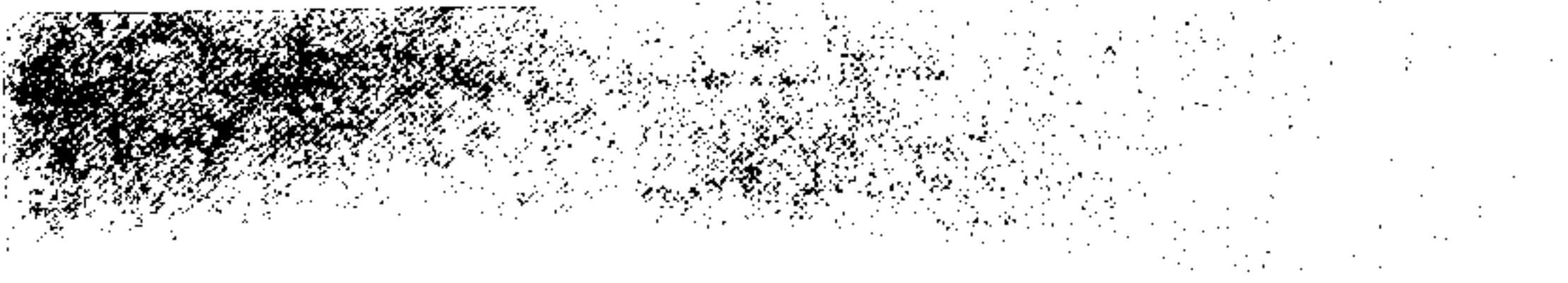
ہمالیہ کا پہاڑی سلسلہ بیلٹ کی طرح دور تک پھیلا ہوا ہے۔
اسپیس شٹل سے کھینچی گئی تصویر۔

دُنیا کے بلند اور طویل پہاڑی سلسلے بیلٹ (Belt) اور زرہ کی طرح سے زمین کو چاروں اطراف سے مضبوطی سے جکڑے ہوئے ہیں۔ اس کے نتیجے میں زمین کی سطح، اس کے اندر ہر دم جاری حملی روؤں (Convectional

(currents) کے اثرات سے محفوظ رہتی ہے، ورنہ اس پر ہر وقت زلزلے کی کیفیت رہتی۔ علاوہ ازیں، چاند کی تجاذبی قوت (Gravitational force) کے باعث براعظموں پر ممکنہ طور پر پیدا ہونے والے مدوجزر(Tides) کو بھی ایک حد میں رکھتے ہیں ورنہ جس طرح سمندروں میں نمایاں مدو جذر پیدا ہوتے ہیں خشکی میں بھی پیدا ہوتے اور سطح زمین لرزتی رہتی۔ اور انسان زمین پر آرام و سکون کے ساتھ نہ رہ سکتا۔ زمین پر بڑی بڑی عمارتیں بنانا تو دور کی بات، ایک خیمہ کھڑا کرنا بھی مشکل ہوتا۔
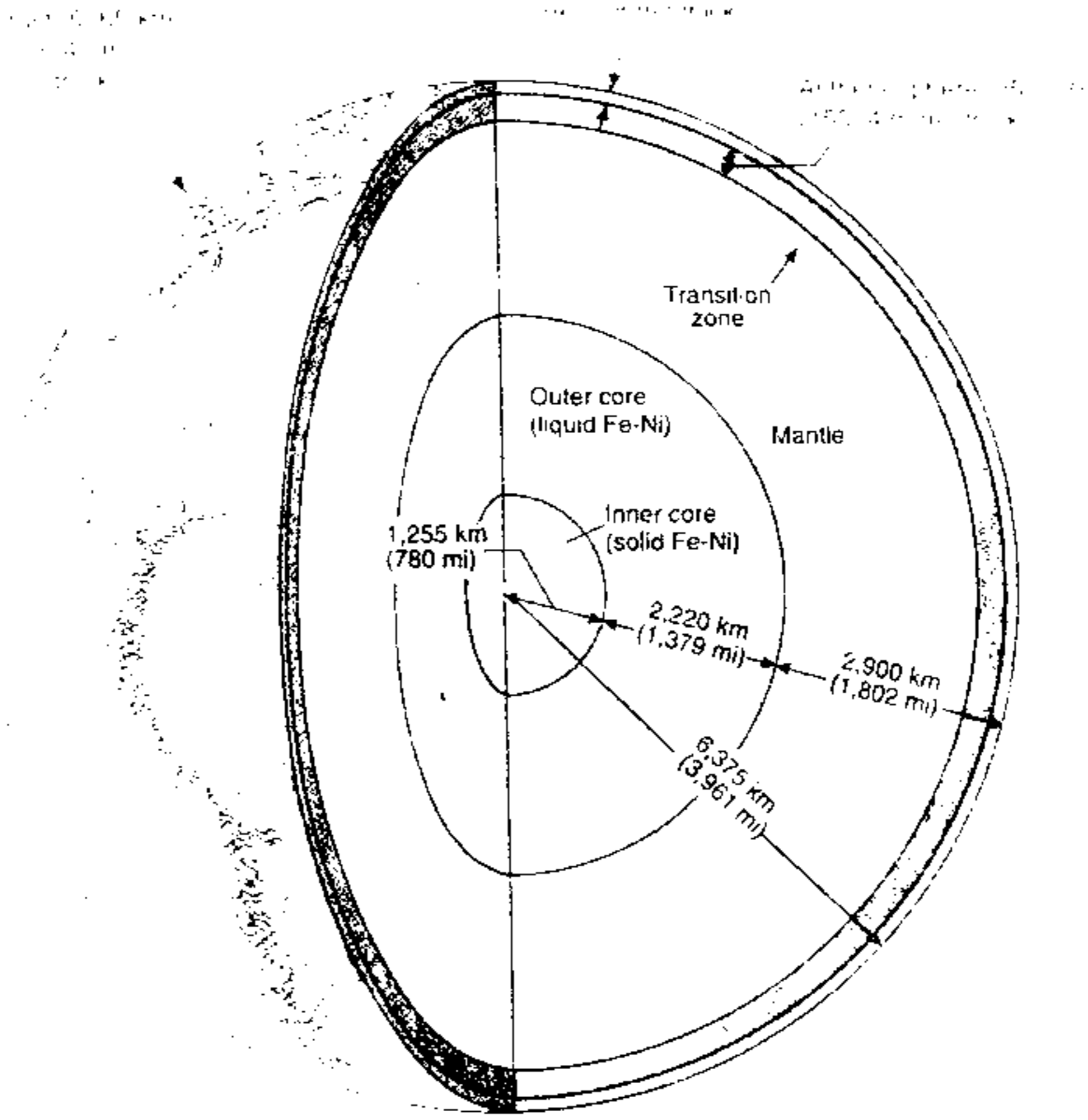
زمین کی اندرونی تہیں۔ اللہ تعالٰی نے زمین کی سطح کو ایسا بچھایا ہے کہ مخلوق اس پر آرام سے رہ سکتی ہے۔

2۔دریا اور نہریں میٹھے پانی کو زمین کے مختلف خطوں تک پہنچاتے ہیں۔ بلند و بالا پہاڑوں کی چوٹیوں پر عظیم گلیشیئرز اور برفانی ٹوپیوں (Ice caps) کی شکل میں میٹھے پانی کے حیران کن حد تک وسیع ذخیرے جمع ہوتے ہیں۔ یہ پانی سارا

سال رواں رہتا ہے اور انسان کی مختلف ضرورتوں کو پورا کرتا ہے۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اِلٰى مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ يَّتَفَيَّؤُا ظِلٰلُهٗ عَنِ الْيَمِيْنِ وَالشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِّلّٰهِ وَهُمْ دٰخِرُوْنَ ۞ وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ۞
(16:48-49)

کیا اُنھوں نے اُن اشیاء کی طرف نہیں دیکھا جنھیں اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے کہ بدلتے رہتے ہیں اُن کے سائے دائیں سے (بائیں طرف) اور بائیں سے(دائیں طرف) اللہ کو سجدہ کرتے ہوئے اس حال میں کہ وہ عاجزی کا اظہار کررہے ہوتے ہیں[1]۔

اور اللہ ہی کو سجدہ کرتے ہیں آسمانوں اور زمین میں جتنے جاندار ہیں[2] اور فرشتے بھی۔ اور وہ ذرا تکبر نہیں کرتے۔

1۔ کائنات کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ ریز ہے۔ چھوٹی ہو یا بڑی، باشعور ہو یا بے شعور۔ سجدہ ریز ہونے کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کے قانون اور حکم کے سامنے جھکی ہوئی۔

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ذی حیات مخلوق صرف زمین پر ہی نہیں پائی جاتی بلکہ دوسرے سماوی اجسام (سیاروں، ذیلی سیاروں وغیرہ) پر بھی پائی جاتی ہے۔ اس کو ماورائے زمین زندگی (Extraterrestrial life) کہاجا تا ہے۔ مزید دیکھیں سورہ شوریٰ 42:29)

وَاِنَّ لَكُمْ فِى الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ؕ نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِىْ بُطُوْنِهٖ مِنْۢ بَيْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ ۝ وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا ؕ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝ (16:66-67)

بے شک تمہارے لئے چوپایوں میں بھی بڑا سبق ہے۔ ہم تم کو اُس میں سے پلاتے ہیں جو ان کے جسموں میں ہے، گوبر اور خون کے درمیان سے خالص دودھ جو پینے والوں کے لئے نہایت خوشگوار ہے[1]۔

اور کھجوروں اور انگوروں کے پھلوں سے بھی (تمہیں پلاتے ہیں)، تم ان سے میٹھا رس بھی حاصل کرتے ہو[2]، اور کھانے کی اچھی چیزیں بھی۔ بے شک اس میں بڑی نشانی ہے اُن لوگوں کے لئے جو عقل سے کام لیتے ہیں[3]۔

"Verily, in cattle there is a lesson for you. We give you to drink of what is inside their bodies, coming from a conjunction between the contents of the intestine and the blood, a milk pure and pleasant for those who drink it." (M. Bucaille)

1۔ دودھ اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نعمت ہے۔ اس کی پیدائش اللہ تعالیٰ کی قدرت کا حیرت انگیز کرشمہ ہے۔ دودھ مادہ جانوروں کے پستانوں میں موجود دودھ

کے غدودوں (Mammary Glands) کے ذریعے بنتا ہے۔ (دودھ دینے والے جانوروں کو پستانیے یا میملز (Mammals) کہا جاتا ہے۔)

غذا جب معدے اور آنتوں سے گزرتی ہے تو اُس کا قابل ہضم حصہ ہضم ہو کر خون کی نالیوں میں جذب ہوجاتا ہے۔ اور جو حصہ ہضم ہونے سے رہ جاتا ہے وہ گوبر کی شکل میں خارج ہوجاتا ہے۔ خون اپنے اندر جذب شدہ غذائی اجزاء کو جسم کے ایک ایک خلیہ (Cell) تک پہنچاتا ہے۔ یہ غذا جسم کی توانائی اور نشوونما کی ضرورتوں کو پورا کرتی ہے۔ دودھ کے غدود ان غذائی اجزاء کو دودھ میں تبدیل کرتے ہیں۔

یہ مختلف نظام، باہم مربوط ہوکر جسم کے اندر کام کرتے ہیں۔ اور اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ کوئی ہے جس کی مشیت اس سارے عمل کے پیچھے کارفرما ہے۔

2۔ پھلوں کا رس (Fruit juice) بھی اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت ہے۔

''سکر'' کے دو معنی بیان ہوئے ہیں: ایک شراب (خمر) اور دوسرا پھلوں کا میٹھا رس۔ پہلے معنی کے لحاظ سے آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ ''تم اس سے شراب بھی بناتے ہو اور کھانے کی اچھی چیزیں بھی۔'' اس میں اس طرف اشارہ ہوسکتا ہے کہ امکان دونوں موجود ہیں۔ چاہو تو اس سے الکوحل حاصل کرو اور چاہو تو اس سے کھانے کی اچھی چیزیں بناؤ۔

3۔ یہاں قرآن مجید ایک بار پھر عقل کو تحریک دے رہا ہے۔ حیواناتی جسم میں غذا کے ہضم ہونے کا عمل (Digestion of food)، ناقابل ہضم حصہ کا ایک نظام کے تحت بدن سے اخراج، ہضم شدہ غذا کا خون میں جذب ہونا، جذب شدہ غذا کا جزوِ بدن بننا (Assimilation)، اس سے خون کا بننا، اور دودھ کے غدودوں کے ذریعے اس کا دودھ میں تبدیل ہونا، یہ سارے اعمال اپنے اندر غور و فکر کا وسیع سامان رکھتے ہیں۔ اسی طرح پودوں میں پھلوں کا بننا، اور ان میں مٹھاس اور غذائیت کا پیدا ہونا انسان کو دعوتِ فکر دے رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جانوروں میں بھی انسان کے پینے کی چیز پیدا کی ہے یعنی دودھ اور پودوں میں بھی میٹھا رس پیدا کیا ہے۔ (آگے ایک اور مشروب کا ذکر ہورہا ہے یعنی شہد)۔

وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا یَعْرِشُوْنَ ۙ ثُمَّ كُلِیْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِیْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا ؕ یَخْرُجُ مِنْۢ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِیْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ (16:68-69)

اور آپ کے رب نے شہد کی مکھی کو یہ وحی[1] کردی کہ تُو پہاڑوں، اور درختوں، اور اُن چھپروں میں جو لوگ اٹھاتے ہیں، (اپنے) چھتے بنا، پھر ہر قسم کے پھلوں سے رس چوس، پس اپنے رب کی آسان کی ہوئی راہوں پر چلتی رہ[2]۔

(یوں) ان (مکھیوں) کے شکموں سے ایک مشروب نکلتا ہے جس کے رنگ مختلف ہوتے ہیں، اس میں لوگوں کے لئے شفا ہے[3]۔

بے شک اس میں ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر کرتے ہیں (قدرتِ الٰہی کی) بڑی نشانی ہے[4]۔

1۔''وحی'' کا یہاں معنی ہے فطرت اور جبلت میں ڈالنا۔ یہ وہ فطری تعلیم ہے جو خالقِ کائنات نے ہر جاندار میں ودیعت کی ہے۔ اس کو فطری اور جبلی ہدایت بھی کہہ سکتے ہیں۔ اسی کے تحت شہد کی مکھی اپنی زندگی گزارتی ہے۔ چھتے بنانا، چھتے بنانے کے لئے مناسب جگہ تلاش کرنا، ہر قسم کے پھولوں تک پہنچنا اور ان کا رس چوسنا، ایک نظام کے تحت اس کو شہد میں تبدیل کرنا، اور جمع رکھنا۔ یہ سب ہدایتِ ربانی کے تحت ہوتا ہے۔

2۔ان "راستوں" سے مراد وہ اصول اور ضابطے ہیں جن پر عمل کر کے شہد کی مکھی شہد تیار کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے شہد کی مکھی کے ان راستوں کو آسان اور ہموار بنایا ہے۔ اس کے لئے ان کے مطابق عمل کرنا آسان ہے اور وہ جبلی ہدایت کے تحت ان پر مسلسل طور پر عمل کرتی رہتی ہے۔

شہد کی مکھی کے شکم میں شہد بنتا ہے۔ اس کے مختلف رنگ ہوتے ہیں، یعنی یہ مختلف اقسام کا ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے شہد میں مختلف بیماریوں کے لئے شفا رکھی ہے۔ اس کے علاوہ یہ غذا کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس میں اہلِ فکر کے لئے قدرتِ الٰہی کی بڑی نشانی ہے۔ یہاں پھر قرآن غور وفکر کی صلاحیتوں کو جگانا چاہ رہا ہے۔

شہد کی مکھی ایک "سماجی" حیوان ہے۔ شہد کی مکھیاں آپس میں مل کر ایک آبادی (Colony) کی شکل میں رہتی ہیں۔ ان کی ایک آبادی میں اوسطاً تقریباً تیس ہزار مکھیاں ہوتی ہیں اگرچہ ان کی تعداد اسی ہزار تک ہوسکتی ہے۔

ایک چھتے میں تین قسم کی مکھیاں ہوتی ہیں:

ا۔ایک ملکہ مکھی، ۲۔کئی سو نر مکھیاں (Drones) اور ۳۔ہزاروں کارکن مکھیاں (Workers)۔

ملکہ مکھی آبادی کی سربراہ ہوتی ہے، اس کی جسامت مقابلتاً بڑی ہوتی ہے۔ سارے انڈے یہی مکھی دیتی ہے۔ یہ تقریباً پانچ سال زندہ رہتی ہے، اس عرصہ میں یہ تقریباً دس لاکھ انڈے دیتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ملکہ مکھی سارے چھتے کی ماں ہوتی ہے۔

نر مکھیاں چھتے میں کوئی خدمت انجام نہیں دیتیں۔ ان کا کام صرف ملکہ مکھی کو بارور (Fertilize) کرنا ہے۔

کارکن مکھیاں مادہ ہوتی ہیں۔ ان کی جسامت ملکہ مکھی کے مقابلے میں چھوٹی ہوتی ہے۔ یہ انڈے نہیں دے سکتیں، تاہم چھتے کے سارے کام یہی انجام دیتی ہیں۔

تقسیم کار(Division of Labour):

کارکن مکھیوں نے چھتے کے کام آپس میں بانٹے ہوتے ہیں۔ بہت سی مکھیاں پھولوں سے رس (Nectar) اور زیرہ دانے (Pollens) جمع کر کے لاتی

ہیں۔ زیرہ دانوں سے انھیں پروٹین حاصل ہوتی ہے جنھیں وہ خاص خانوں میں ڈالتیں ہیں۔ رس کو یہ مکھیاں چھتے میں موجود دوسری مکھیوں کے حوالے کرتی ہیں۔ رس لانے والی مکھی اپنا منہ کھولتی ہے تو وصول کرنے والی مکھی اس میں سے اپنی زبان کی مدد سے رس چوس لیتی ہے۔ ان کے معدے میں رس میں کیمیائی تبدیلیاں ہوتی ہیں جن کے نتیجے میں شہد بنتا ہے۔ شہد سے مکھیاں اپنی غذا حاصل کرتی ہیں۔

کچھ کارکن مکھیاں چھتہ (Honey-comb) بناتی ہیں۔ جس میں موم کی دیواروں پر مشتمل چھوٹے چھوٹے شش ضلعی (Six sided) خانے ہوتے ہیں۔

کچھ کارکن مکھیاں بچوں (لاروا) کی پرورش کرتی ہیں، کچھ خالی خانوں کو صاف کرتی ہیں تاکہ ملکہ اُن میں انڈے دے سکے۔ کچھ چھتے کے دروازے پر نگرانی کا کام کرتی ہیں۔

تجربات سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ کارکن مکھیاں مختلف کام اپنی عمر کے حساب سے سرانجام دیتی ہیں۔

ایک کارکن مکھی گرمیوں کے صرف پانچ یا چھ ہفتے زندہ رہتی ہے۔ اس عرصہ میں عمر کے مطابق اس کی ذمہ داری بدلتی رہتی ہے۔ سب سے پہلے وہ چھتے کے خانوں کی صفائی کا کام کرتی ہے۔ وہ یہ فریضہ کوئی تین دن تک سرانجام دیتی ہے۔ اس کے بعد وہ نرس مکھی کا کردار ادا کرتی ہے اور لاروا کو شہد اور زیرہ دانے کھلاتی ہے۔ شروع میں وہ بڑی عمر کے لاروا کو کھلاتی ہے اور چھٹے تا بارہویں دن کے دوران وہ چھوٹی عمر کے لاروا کو کھلاتی ہے اور ساتھ ہی ملکہ مکھی کو شاہی جیلی (Royal gelly) کھلاتی ہے جو کہ مکھی کے سر کے اندر موجود مخصوص غدود سے خارج ہوتی ہے۔

بارہویں دن سے کارکن مکھی موم کے خانے بنانے کا کام کرتی ہے۔ سولہویں دن سے یہ چھتے میں آنے والے زیرہ دانوں اور رس کو وصول کرنا شروع کرتی ہے۔ بیسویں دن سے یہ گارڈ کے طور پر کام کرنا شروع کرتی ہے۔ جبکہ تیسرے ہفتے سے اپنی زندگی کے آخر تک یہ رس اورزیرہ دانے جمع کرنے کا کام کرتی ہے۔

تاہم، یہ شیڈول بہت زیادہ سخت نہیں ہوتا، بلکہ اس میں ضرورت کے مطابق رد و بدل ہوتا رہتا ہے۔

وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا ۙ وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ (16:78)

اور اللہ نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے اس حال میں پیدا کیا کہ تم کچھ نہیں جانتے تھے اور اس نے تمہارے لئے کان اور آنکھیں اور دل بنائے[1]، تا کہ تم شکر ادا کرو[2]۔

1۔اللہ تعالیٰ نے حواس اور ذہن کی نعمتوں سے نوازا ہے جن کے ذریعے انسان علم حاصل کرتا ہے۔ حواس میں سے یہاں دو حسوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ سننے کی حس (سمع) اور دیکھنے کی حس (ابصار)۔ یہ بات ظاہر ہے کہ پانچوں حواس میں سب سے اہم یہی ہیں۔

تیسری چیز جس کا یہاں ذکر کیا گیا ہے وہ افئدہ ہے جو کہ ''فؤاد'' کی جمع ہے۔ اس سے مراد انسان کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہے، جسے ہم ذہن یا Mind کہہ سکتے ہیں۔

حواس کا ذکر کرتے ہوئے پہلے ''سمع'' کان کا لفظ آیا ہے اور پھر ''ابصار'' (آنکھوں) کا۔ ہم جانتے ہیں کہ بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو اس میں پہلے سننے کا عمل ہوتا ہے اور دیکھنے کے عمل کے لئے اُسے کچھ وقت لگتا ہے۔ کیونکہ کان تو کھلے ہوتے ہیں اُن پر کوئی پردہ نہیں ہوتا مگر آنکھیں شروع میں بند ہوتی ہیں اور انھیں کھلنے میں کچھ وقت لگتا ہے۔ رحم مادر میں تاریکی ہوتی ہے پیدائش کے بعد بچے کی آنکھیں فوری طور پر روشنی کی شعاعیں قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتیں، انھیں کچھ وقت لگتا ہے۔

2۔ انسان شکر گزار بنے یعنی ان نعمتوں اور صلاحیتوں کا درست استعمال کرے اور یوں اپنے ہر ہر عمل کے ذریعے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے۔

اَلَمْ یَرَوْا اِلَی الطَّیْرِ مُسَخَّرٰتٍ فِیْ جَوِّ السَّمَآءِ ؕ مَا یُمْسِکُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ○ (16:79)

کیا انھوں نے پرندوں کی طرف نہیں دیکھا کہ وہ فرمانبردار بن کر فضائے آسمانی میں اڑ رہے ہیں۔ کوئی چیز انھیں تھامے ہوئے نہیں بجز اللہ کے[1]۔ بے شک اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو ایمان لائیں[2]۔

1۔ پرندوں کی مخصوص شکل ہوتی ہے، ان کے پردار بازو (Wnigs) ہوتے ہیں جنھیں وہ پھیلا اور سکیڑ سکتے ہیں۔ ان کا جسم مقابلتاً ہلکا ہوتا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ان کی ہڈیوں میں خلا ہوتا ہے۔ یہ انڈے دینے والے حیوانات ہیں ان کے بچوں کی پرورش ان کے جسموں سے باہر ہوتی ہے۔ اگر جسموں کے اندر ہوتی تو ان کا وزن بڑھ جاتا ہے انھیں اڑنے میں دشواری ہوتی۔

علاوہ ازیں فضائے آسمانی (یعنی کرۂ ہوائی) میں ہوا ہوتی ہے۔ یہ سب عوامل مل کر یہ ممکن بناتے ہیں کہ پرندے کشش ثقل کے باوجود ہوا میں اڑ سکیں۔

انسان کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ پرندوں کی پرواز کی سائنس کو سیکھے اور اُسے عملی طور پر بروئے کار لائے۔ چنانچہ انسان نے ہوائی جہاز بنائے جن کے ذریعے وہ دور دراز کے سفر نہایت تیزی سے طے کرلیتا ہے۔

2۔ یہاں ایمان لانے والوں کو بطور خاص متوجہ کیا جارہا ہے کہ پرندوں کا ہوا میں اُڑنا اللہ کی قدرت کی کھلی نشانیاں رکھتا ہے ان لوگوں کے لئے جو ایمان لائے ہیں یا ایمان لانا چاہیں۔

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْۢ بُيُوْتِكُمْ سَكَنًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ جُلُوْدِ الْاَنْعَامِ بُيُوْتًا تَسْتَخِفُّوْنَهَا يَوْمَ ظَعْنِكُمْ وَيَوْمَ اِقَامَتِكُمْ وَمِنْ اَصْوَافِهَا وَاَوْبَارِهَا وَاَشْعَارِهَآ اَثَاثًا وَّ مَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ ۝ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّمَّا خَلَقَ ظِلٰلًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْجِبَالِ اَكْنَانًا وَّجَعَلَ لَكُمْ سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ وَسَرَابِيْلَ تَقِيْكُمْ بَاْسَكُمْ ؕ كَذٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ ۝ (16:80-81)

اور اللہ ہی نے تمہارے لئے تمہارے گھروں کو سکون کی جگہ بنایا ہے۔ اور تمہارے لئے چوپایوں کی کھال کے گھر بنائے جنہیں تم اپنی روانگی اور قیام کے موقع پر ہلکا پھلکا پاتے ہو، ان کے اون، ان کے روئیں اور ان کے بالوں سے تمہارے لئے گھریلو سامان اور ایک وقت تک برتنے کی چیزیں (بنائیں)[1]۔

اللہ ہی نے تمہارے لئے اپنی پیدا کردہ چیزوں سے سائے بنائے[2]، اور تمہارے لئے پہاڑوں میں پناہ گائیں بنائیں، اور تمہارے لئے ایسے لباس بنائے جو تمہیں گرمی سے بچاتے ہیں اور ایسے لباس بنائے جو تمہاری جنگ میں تمہیں محفوظ رکھتے ہیں[3]۔ اسی طرح

تم پر اللہ اپنی نعمتیں پوری کرتا ہے تاکہ تم فرمانبردار رہو۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو تخلیقی صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ اور کائنات کو ایسا بنایا ہے کہ وہ انسان کی تخلیقی صلاحیتوں کے سامنے مطیع اور مسخر ہے اور ان کے ساتھ پوری سازگاری رکھتی ہے۔ لہذا انسان اپنی ان صلاحیتوں کو کام میں لاکر کائنات میں تصرف کرتا ہے اور اُسے طرح طرح سے اپنے فائدے اور سہولت کے لئے استعمال کرتا ہے۔

وہ راحت و آرام اور تحفظ کے لئے پتھر اور مٹی سے مکانات بناتا ہے۔ چوپایوں کی کھالوں اور بالوں سے خیمے بناتا ہے۔ بھیڑ، بکری اور اونٹ وغیرہ کی اُون اور بالوں سے گھریلو سامان اور برتنے کی چیزیں بناتا ہے۔

(صوف: بھیڑ کی اُون، اوبار: اونٹ کے بال، اشعار: بکری کے بال)

اللہ تعالیٰ نے ٹھوس اور غیر شفاف چیزیں بنائی ہیں جو سایہ اور تحفظ کے لئے استعمال کی جاسکتی ہیں۔ اس کے علاوہ انسان اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی تخلیقی صلاحیتوں کو کام میں لاکر پہاڑوں میں پناہ گاہیں بناتا ہے۔

3۔ لباس بھی اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت ہے۔ عام لباس انسان کو گرمی اور سردی اور موسمی اثرات سے بچاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انسان نے ایسے لباس بھی بنائے ہیں، جو اُسے جنگ میں تحفظ فراہم کرتے ہیں۔ ان میں زرہیں، بلٹ پروف قمیصیں اور حفاظت کے دوسرے تمام ذرائع شامل ہیں۔

وَجَعَلْنَا الَّيْلَ وَالنَّهَارَ اٰيَتَيْنِ فَمَحَوْنَآ اٰيَةَ الَّيْلِ وَجَعَلْنَآ اٰيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً لِّتَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ ۭ وَكُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنٰهُ تَفْصِيْلًا ۝
(17:12)

اور ہم نے رات اور دن کو (اپنی قدرت کی) دونشانیاں بنایا[1]۔ پس رات کی نشانی کو تو مدھم کیا اور دن کی نشانی کو روشن بنایا[2]۔ تاکہ تم اپنے رب کے فضل کے لئے کوشش کرو، اور تاکہ تم برسوں کا شمار اور حساب جان سکو[3]۔ اور ہر چیز کو ہم نے پوری تفصیل سے بیان کردیا ہے۔

1۔رات اور دن کا ہونا اور ان کا باری باری تسلسل کے ساتھ آنا جانا، اللہ تعالیٰ کے وجود وہستی اور قدرت کی نشانی اور دلیل ہے۔ جب انسان رات اور دن کے اس نظام پر غور وفکر کرتا ہے تو جتنا گہرائی میں جاکر وہ سوچتا ہے، اتنا ہی زیادہ بہتر طریقے سے وہ اس حقیقت کو جان لیتا ہے کہ کوئی ہے جو اس کائنات کا خالق ہے۔

رات اور دن کا نظام کائنات کے مظاہر (Phenomena) میں سے ہے۔ کائنات میں بے شمار مظاہر ہیں۔ اور ہرمظہر اللہ کی ہستی اور قدرت کی دلیل ہے۔

2۔ یعنی رات اندھیری بنائی اور دن روشن بنایا۔ یعنی رات ایسی بنائی کہ اس میں انسان آرام کرسکتا ہے اور اپنی کھوئی ہوئی توانائی کو بحال کرکے تروتازہ

ہوسکتا ہے۔ اور دن ایسا بنایا کہ اس میں انسان غذا اور فائدے کی دیگر اشیاء کے حصول کی جدوجہد کرسکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اندھیرے کو سکون سے اور روشنی کو حرکت و عمل سے خصوصی نسبت دی اور ایک نظام کے تحت تسلسل کے ساتھ اُن کا آنا جانا مقرر کیا۔

یہاں رات اور دن کی نعمت کے دو اہم فائدوں کی طرف انسان کو متوجہ کیا گیا ہے تاکہ وہ ان پر غور کرے اور اس میں شکر گزاری کا احساس پیدا ہو۔

ا۔اللہ تعالیٰ کے فضل کی جدوجہد یعنی خود کو مفید سرگرمیوں میں لگانا۔

۲۔رات اور دن کے آنے جانے سے برسوں کی گنتی اور اوقات کا حساب معلوم کرنا۔

ان دونوں چیزوں کا آپس میں گہرا تعلق بھی ہے۔ اگر انسان وقت کی تبدیلی کو محسوس نہ کرسکتا اور اس کے پاس کوئی ایسا ذریعہ اور آلہ نہ ہوتا جس کی مدد سے وہ یہ معلوم کرسکتا کہ کتنا وقت گزر گیا ہے تو زمین پر انسان کا بطور ایک مہذب انسان کے زندہ رہنا ممکن نہ ہوتا۔(یہ اتنی اہم اور انسانی تہذیب کا اتنا لازمی حصہ ہے کہ دور جدید میں قریب قریب ہر بالغ آدمی کی کلائی پر گھڑی بندھی ہوتی ہے اور ہر دفتر اور ہر گھر میں دیواری گھڑی ہوتی ہے اس کے علاوہ ملکوں میں معیاری اوقات کا ایک نظام مقرر ہے۔ اب دنیا نے ایک عالمی معیاری وقت بھی مقرر کرلیا ہے جسے گرینچ ٹائم کہتے ہیں)۔

رات اور دن بدلتے ہیں، اس سے انسان دنوں، ہفتوں، مہینوں اور برسوں کا شمار کرتا ہے۔ پھر یہ کہ نہ پوری رات ایک جیسی ہوتی ہے اور نہ پورا دن ایک جیسا ہوتا ہے۔ ان میں اوقات کی تبدیلی محسوس کی جاسکتی ہے اور بالخصوص دن کہ جس میں انسان کام کرتا ہے، اس تبدیلی کا مشاہدہ واضح طور پر کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ انسان نے مثلاً دن کے اوقات سحر، فجر، چاشت، دوپہر، ظہر،عصر، مغرب اور عشاء وغیرہ میں امتیاز کیا ہے۔ بہرحال رات اور دن میں اوقات کے محسوس طور پر بدلنے سے انسان وقت کا حساب کرسکتا ہے اور یوں اپنی زندگی ایک قاعدہ کے مطابق گزار سکتا ہے۔

تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ○ (17:44)

ساتوں آسمان اور زمین اور جو اُن میں ہیں[1]
سب اُسی کی تسبیح کرتے ہیں اور کوئی چیز بھی ایسی نہیں
جو اس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح نہ کرتی ہو لیکن تم
اُن کی تسبیح نہیں سمجھتے[2]۔ بے شک وہ بڑا ہی حلم والا
اور بخشنے والا ہے۔

1۔''ساتوں آسمان اور زمین'' کا یہ معنی ہوسکتا ہے کہ تمام کائنات (Universe) جس میں جدید اندازوں کے مطابق تقریباً ایک سو ارب کہکشائیں ہیں، اور ہر کہکشاں میں اربوں ستارے، سیارے اور دوسرے سماوی اجرام ہیں۔

ممکن ہے''ساتوں آسمان اور زمین'' سے بے جان مادی اجسام مراد ہوں۔جبکہ ''جو ان میں ہیں'' سے تمام ذی حیات مخلوق مراد ہوسکتی ہے۔

2۔کائنات کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کی حمد و تسبیح کرتی ہے لیکن انسان کے لئے یہ ممکن نہیں (یا ابھی تک ممکن نہیں ہوسکا) کہ وہ اس حمد اور تسبیح کو سمجھ سکے۔

تسبیح: اس بات کا اعلان کہ اللہ تعالیٰ ہر نقص اور عیب سے پاک ہے۔

تحمید: حمد کرنا، اس بات کا اعلان کہ اللہ تعالیٰ ہر صفتِ کمال سے متصف ہے۔

حمد و تسبیح کے دو طریقے ہیں۔ زبانِ قال اور زبانِ حال، زبانِ قال یہ ہے کہ لفظوں، جملوں اور عبارت کے ذریعے سے بول کر (یا لکھ کر) حمد و تسبیح بیان کی جائے۔

زبانِ حال یہ ہے کہ اپنی حالت اور کیفیت سے اللہ تعالیٰ کے فرمان اور

قانون کی اتباع کی جائے۔

زبان حال سے حمد و تسبیح تو واضح طور پر پوری کائنات اور اس کی ایک ایک چیز کا وظیفہ ہے جس پر وہ مسلسل طور پر ایک لمحے کے توقف کے بغیر بلا انقطاع کاربند ہے۔ یعنی ہر چیز اللہ تعالیٰ کے تابع فرمان ہے، اس کی مرضی اور منشاء کی تکمیل میں مسلسل طور پر لگی ہوئی ہے۔

اس کے ساتھ ہی باشعور مخلوق سے یہ مطلوب ہے کہ وہ زبانِ قال (لفظ، عبارت، آواز) کے ذریعے یا وسیع تر معنوں میں شعوری طور پر بھی اُس کی حمد و تسبیح بیان کرے۔

اگر ہم ''شعور'' کے عام معنی لینے کے بجائے اسے وسیع تر معنوں میں لیں اور اسے خالق کی پہچان اورشناخت کے مفہوم میں سمجھیں تو یہ ممکن ہے کہ کائنات کی ہر چیز، ہر ذرہ (ہر ایٹم، ہر الیکٹران اور باریک سے باریک ہر ذرہ) ''شعوری'' طور پر بھی اپنے خالق کی حمد و تسبیح کررہا ہو۔ یعنی یہ ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر '' ذرّے'' (یعنی باریک سے باریک شے) میں یہ صلاحیت رکھی ہو کہ وہ اپنے مالک کو پہنچانتا ہو، اُس سے ''ہم کلام'' ہوتا ہو، اُس کے سامنے عاجزی و انکساری کا اظہار کرتا ہو، اُس کے آگے ''سجدہ'' کرتا ہو، وغیرہ۔

رَبُّكُمُ الَّذِي يُزْجِي لَكُمُ الْفُلْكَ فِي الْبَحْرِ لِتَبْتَغُوا مِن فَضْلِهِ ۚ إِنَّهُ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا ۝
(17:66)

تمہارا رب وہی ہے جو تمہارے لئے سمندر میں کشتیوں کو چلاتا ہے[1] تاکہ تم (بحری ذریعے سے) اُس کے فضل کے طالب بنو۔ بے شک وہ تمہارے حال پر بڑا مہربان ہے[2]۔

1۔ ''جس نے یہ نظام قائم کیا ہے کہ کشتیاں پانی کی سطح پر تیر سکتی ہیں''۔

یہ اللہ تعالیٰ ہی کا قائم کردہ نظام ہے کہ انسان کے لئے یہ ممکن ہوا کہ وہ سمندر اور دریا وغیرہ کو حمل ونقل (Transportation) کے اہم ذریعہ کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ پانی میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ واسطہ (Medium) اور ''سواری'' کے طور پر کام کرسکتا ہے۔ وہ ایک مائع اور سیال ہے، اس میں بہنے کی صلاحیت ہے۔ بہت سی چیزوں سے بھاری ہے۔ پھر یہ کہ انسان چیزوں کو ایسی شکلوں میں ڈھال سکتا ہے جن کی کثافت (بھاری پن: Density) پانی کے مقابلے میں کم ہوتی ہے اور وہ پانی پر تیر سکتی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ان پر بھاری بوجھ لادا جاسکتا ہے۔

مزید براں، کشتی اور جہاز کو حرکت دینے والی قوت کی ضرورت ہوتی ہے۔ پہلے زمانے میں یہ کام یا تو ہوا سے لیا جاتا تھا (بادبانی کشتیاں) یا ملاح یہ کام چپوؤں کی مدد سے کرتے تھے۔ جدید دور میں یہ کام بھاپ اور بجلی کے ذریعے چلنے والے انجنوں سے لیاجاتا ہے۔

راستے کی پہچان کے لئے ستاروں (بشمول سورج، دن کے وقت) سے مدد لی جاسکتی ہے۔ جدید دور میں یہ کام قطب نما اور دوسرے آلات سے لیا جاتا ہے۔

یہ سارے عوامل اللہ ہی کے پیدا کردہ ہیں جو سب مل کر یہ ممکن کرتے ہیں کہ انسان سمندروں اور دریاؤں کو حمل ونقل اور آمد و رفت کے ذریعہ کے طور پر استعمال کرے۔

جدید دور میں صورت حال یہاں تک جاپہنچی ہے کہ نہایت عظیم الجثہ جہاز اور بحری بیڑے اور آبدوزیں سمندروں میں چلتی ہیں۔ بعض جہاز اتنے بڑے ہوتے ہیں کہ ان پر پورے پورے شہر آباد ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان پر ہوائی جہازوں کے اڑنے اور اترنے کا انتظام بھی ہوتا ہے۔

2۔ بحری سفر کی اہمیت اُجاگر کی جارہی ہے۔ بلکہ اس کا یہ مفہوم بھی ہے کہ خود سمندروں میں اللہ کا فضل تلاش کیا جائے۔ اس میں غذا اور دیگر فائدہ مند اشیاء کے حصول کی طرف اشارہ ہے۔

جولوگ قرآن کے وارث ہیں۔ نہ جانے کب وہ قرآن کو سمجھ کر پڑھیں گے اور صحیح معنوں میں اللہ تعالیٰ کے فضل کے طالب بن سکیں گے۔

یارانِ تیز گام نے محمل کو جالیا
ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے

آیت کو دوبارہ پڑھیں اور اس کی منشا کو سمجھیں:

تمہارا رب وہی ہے جو (اپنے قانونِ قدرت کے ذریعے) تمہارے لئے سمندر میں کشتیوں کو چلاتا ہے۔ تاکہ تم اس کا فضل تلاش کرو۔ بے شک وہ تمہارے حال پر بڑا مہربان ہے۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ۧ (17:70)

اور بے شک ہم نے اولادِ آدم کو بڑی عزت بخشی ہے[1]، اور انھیں خشکی اور تری میں (مختلف سواریوں پر) سوار کیا ہے[2]۔ اور ان کو پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا ہے[3]، اور انھیں اپنی بہت سی مخلوقات پر نمایاں فضیلت دی ہے[4]۔

1۔اس آیتِ کریمہ میں انسان کے بلند مقام کا ذکر ہے۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت اور ارادہ اور اختیار کی قوت عطا کی ہے۔ یہ وہ چیز ہے جو اسے اہم مقام بخشتی ہے۔(سورہ التین میں انسان کے اس امتیازی مقام کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ'' ہم نے انسان کو احسن تقوم میں تخلیق کیا ہے۔'')

2۔اللہ تعالیٰ نے انسان کو تخلیقی صلاحیت دی اور خشکی اور تری کو اُس کی اس صلاحیت کے سامنے مسخر کیا لہٰذا انسان نے خشکی اور تری میں سفر کے لئے

ذرائع حمل و نقل ایجاد کئے ہیں جن میں روز بروز ترقی ہوتی جارہی ہے۔ (بحر و بر دونوں انسان کے لئے مسخر ہیں، اُس کے خدمت گزار ہیں، اس کے سامنے مطیع ہیں۔)

انسان کو اللہ تعالیٰ نے ایسا بنایا ہے کہ پاکیزہ چیزیں ہی اس کی غذا ہیں، اور اُس نے انسان کو ضرورت کے مطابق پاکیزہ چیزیں غذا کے لئے مہیّا کر رکھی ہیں۔

انسان کے پاس عقل، ارادہ اور اختیار کی قوت ہے۔ زمین پر جو دیگر جاندار ہیں ان کا تسلط محدود ہے جبکہ انسان کا غلبہ تمام مخلوق پر ہے اس کی حکومت پورے کرۂ زمین پر ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انسان اللہ کی معرفت کے نہایت بلند مقام پر پہنچ سکتا ہے۔

سورہ کہف (18)

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّىْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّىْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا ۝ (18:109)

کہہ دو! اگر سمندر میرے رب کے کلمات (لکھنے) کے لئے روشنائی بن جائے تو میرے رب کے کلمات ختم ہونے سے پہلے سمندر ختم ہوجائے گا اگر ہم اس کے ساتھ اُسی کی مانند اور سمندر ملادیں (تب بھی میرے رب کے کلمات ختم نہ ہوں گے)۔

''کلمات''، ''کلمة'' کی جمع ہے۔ اس کا معنی ہے ''وہ لفظ جو کسی معنی پر دلالت کرتا ہو'' یعنی جس کے ذریعے سے کوئی بات کہی جائے۔ اس بنیاد پر بعض اوقات کلمہ کا لفظ زیادہ وسیع معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور اس کا معنی ہوتا ہے ''وہ چیز جو کسی حقیقت کو بیان کرسکے''۔ چونکہ کائنات کی گوناگوں مخلوقات میں سے ہر چیز اللہ تعالیٰ کی ہستی اور وجود اور اس کے علم و قدرت کی گواہی دیتی ہے۔ لہٰذا ہر شے کو اس معنی میں کلمہ سے تعبیر کیا جائے گا۔ اسی مناسبت سے یہ لفظ اللہ تعالیٰ کے علم کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

زیرِ نظر آیت میں کلمات کا لفظ موجودات کائنات کی طرف اشارہ کررہا ہے۔جن میں سے ہر ایک خالقِ کائنات کی لامحدود صفات کا مظہر ہے۔قرآن کہتا ہے کہ کائنات اس قدر وسیع ہے کہ ہزاروں سمندروں کی سیاہی بھی اس کے موجودات کے ناموں اور صفات کے لکھنے کے لئے کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ (ایک اور جگہ ارشاد ہے کہ اللہ کے لشکروں کو صرف اللہ ہی جانتا ہے)۔ دوسرے لفظوں میں اگر بے شمار سمندروں کی سیاہی استعمال کی جائے تب بھی یہ ممکن نہیں کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے وہ رقم کیا جاسکے۔ اللہ تعالیٰ کا علم لامتناہی ہے۔(مزید دیکھیں سورہ لقمان 31:27)

سورہ طٰہٰ (20)

قَالَ رَبُّنَا الَّذِیٓ اَعۡطٰی کُلَّ شَیۡءٍ خَلۡقَہٗ ثُمَّ ھَدٰی۔ (20:50)

اس نے کہا: ''ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی خلقت عطا فرمائی پھر اُس کی راہنمائی کی''۔

اس آیت میں تخلیق کے ایک بنیادی ضابطے، اصول اور فارمولا کی طرف اشارہ کیا جارہا ہے۔ کسی وجود کے لئے دو بنیادی چیزوں کی ضرورت ہے: خلقت (فطرت، ساخت، بناوٹ، شکل و صورت، Form)، اور ہدایت۔ ہر چیز کا ایک مقصدِ تخلیق ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو ایک مقصد کے تحت پیدا کیا ہے۔ اب ضروری ہے کہ ہر چیز کی خلقت ایسی ہو جو اُس کے مقصدِ تخلیق کے ساتھ مکمل ہم آہنگی رکھتی ہو۔ اور پھر یہ بھی ضروری ہے کہ ہر چیز کی اُس کی راہِ حیات پر راہنمائی کی جائے۔ اس آیت میں ارشاد ہے کہ اللہ نے ہر چیز کی یہ دونوں ضرورتیں پوری کی ہیں۔ ہر چیز کو اُس کے مقصدِ تخلیق کے مطابق خلقت دی گئی ہے اور ہر چیز کی راہنمائی کا اہتمام کیا گیا ہے۔

راہنمائی تین قسم کی ہوتی ہے۔ فطری رہنمائی جو ہر چیز کی فطرت اور خلقت میں ودیعت ہے۔ شعوری راہنمائی جس کو باشعور مخلوق اپنے عقل و شعور سے اخذ کرتی ہے اور وحی کے ذریعے رہنمائی جو انبیائے کرام علیہم السلام کے ذریعے پہنچائی گئی ہے۔

غالباً یہاں بطورِ خاص اشارہ فطری راہنمائی کی طرف ہے۔ یہی وہ ہمہ گیر رہنمائی ہے جو حیوانات کو جینے کا سلیقہ سکھاتی ہے۔

خلقت اور راہنمائی کو ایک مثال سے سمجھایا جاسکتا ہے۔مثال کے طور پر مچھلی کو ایسی ساخت اور بناوٹ دی گئی جو اُسے پانی میں تیرنے کے قابل بناتی ہے، اور ساتھ ہی اُسے یہ بھی ''سکھایا'' گیا کہ اس نے اپنے تیرنے کے اعضا کو کس طرح استعمال کرنا ہے۔

اَلَّذِیۡ جَعَلَ لَکُمُ الۡاَرۡضَ مَہۡدًا وَّ سَلَکَ لَکُمۡ فِیۡہَا سُبُلًا وَّ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ؕ فَاَخۡرَجۡنَا بِہٖۤ اَزۡوَاجًا مِّنۡ نَّبَاتٍ شَتّٰی ۝ کُلُوۡا وَ ارۡعَوۡا اَنۡعَامَکُمۡ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی النُّہٰی ۝

(20:53-54)

(وہی ہے) جس نے تمہارے لئے زمین کو گہوارہ[1] بنایا ہے اور تمہارے لئے اس میں راہیں نکالی ہیں[2] اور بادل سے پانی برسایا ہے۔ پھر ہم نے اس سے گوناگوں نباتات کے جوڑے پیدا کئے ہیں[3]۔ خود بھی کھاؤ اور اپنے مویشیوں کو بھی چراؤ۔ بے شک اس میں (ہماری قدرت اور حکمت کی) اہل دانش کے لئے نشانیاں ہیں[4]۔

1۔اصل میں ''مہد'' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ بنیادی طور پر یہ اس جگہ کو کہتے ہیں جس میں بچہ کو سلایا جاتا ہے یعنی گہوارہ، پنگھوڑا، اسی سے اس کا معنی ہوتا ہے: آرام و آسائش کی جگہ۔ مطلب یہ ہے کہ زمین کو انسانی ضرورتوں اور انسانی طبع و فطرت کے عین مطابق بنایا، جہاں انسان سکون کے ساتھ زندگی کے مقصد کے حصول کی جدوجہد کرسکتا ہے۔(مزید دیکھیں 2:22)

2۔یعنی دونوں مادی اور ذہنی وسائل اور ذرائع عطا کئے ہیں جن کو بروئے کار لاکر انسان اپنے مقصد حیات کی منزل تک پہنچ سکتا ہے۔

3۔''شتّٰی''، ''شیت'' کی جمع ہے۔ اس کا معنی ہے مختلف اور متفرق، خصوصیات میں ایک دوسرے سے مختلف۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے گوناں گوں اقسام کے نباتات پیدا فرمائے ہیں، بہت سے وہ ہیں جن سے براہ راست انسان اپنی غذا اور دوسرے فائدے حاصل کرتا ہے اور بہت سے وہ ہیں جنھیں جانور چارے کے طور پر

استعمال کرتے ہیں۔

4۔"اُولِی النُّھیٰ" یعنی اہل عقل و دانش۔ قرآن مجید وہ کتاب ہے جو عقل و دانش کو بیدار کرتی، جھنجھوڑتی اور اُسے کام میں لانے کی تحریک و ترغیب دیتی ہے۔ یہ قرآن کے امتیازی اوصاف میں سے ہے۔ بڑے افسوس کی بات ہوگی کہ وہ جو قرآن کی دعوت کا وارث و امین ہے اگر وہی سوچنا سمجھنا اور عقل و دانش کو کام میں لانا چھوڑ دے۔ قرآن بار بار اس غلط تصور کا رد کرتا ہے جو یہ کہتا ہے کہ مذہب اور عقل کا آپس میں کوئی تعلق نہیں۔

ان آیات میں چار اہم نعمتوں کی طرف انسان کی توجہ مبذول کرائی گئی ہے:

الف : زمین کا گہوارہ جس میں انسان سکون کے ساتھ اپنے مقصدِ حیات کی جد و جہد کرسکتا ہے۔

ب : راستے جو انسان کو اس کی زندگی کی منزل تک پہنچاتے ہیں۔اس میں زندگی کے تمام وسائل و ذرائع شامل ہیں۔

پ : تازہ پانی جس کا منبع بارش ہے۔ زندگی کا دارومدار پانی پر ہے۔

ت : طرح طرح کی نباتات جو انسان کی غذا کا بھی بنیادی ذریعہ ہیں اور انھیں جانور بھی چارے کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

آخر میں انسان کو کائنات کے مظاہر میں غور و فکر کرنے کی تحریک دی گئی ہے۔ تاکہ وہ اپنے خالق کی معرفت بھی حاصل کرے اور اس میں اپنے خالق کے لئے شکر گزاری کا احساس بھی پیدا ہو تاکہ انسان اپنے مقصدِ حیات کو حاصل کرسکے۔

قُلْ رَبِّیْ یَعْلَمُ الْقَوْلَ فِی السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ○ (21:4)

(رسول کریم ﷺ نے) فرمایا: میرا رب آسمان اور زمین میں کہی جانے والی ہر بات[1] کو جانتا ہے، اور وہ خوب سننے والا (اور) جاننے والا ہے۔(21:4)

1۔ یہاں آسمان اور زمین کے حوالے سے ایک خاص لفظ "قول" استعمال ہوا ہے جس سے ضمنی طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ زمین کی طرح "آسمان" یعنی سماوی اجسام مثلاً سیاروں میں بھی ایسی مخلوق ہوسکتی ہے جو آپس میں کلام کرتی ہو۔ چنانچہ اس میں ماورائے زمین زندگی (Extraterrestrial life) کی موجودگی کی پیشن گوئی ہوسکتی ہے۔
بہرحال آیت کا مقصود اللہ تعالیٰ کی لامحدود قدرت کو بیان کرنا ہے۔ اس کا علم ہر چیز کا احاطہ کئے ہوئے ہیں۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا لٰعِبِیْنَ ○ لَوْ اَرَدْنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّآ ۖ اِنْ كُنَّا فٰعِلِیْنَ ○ بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَیَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ ۚ وَلَكُمُ الْوَیْلُ مِمَّا تَصِفُوْنَ ○
(21:16-18)

ہم نے آسمان اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، دل لگی کرتے ہوئے پیدا نہیں کیا، اگر

(بالفرضِ محال) ہم کوئی کھیل تماشہ ہی اختیار کرنا چاہتے تو اپنے طور پر ہی اختیار کرلیتے، مگر ہم ایسا کرنے والے نہیں ہیں۔ بلکہ ہم باطل پر حق کی چوٹ لگاتے ہیں پس وہ اس کا سر کچل دیتا ہے، اور وہ نابود ہو کر رہ جاتا ہے۔ اور (اے باطل پرستو!) تمہارے لئے اس چیز کے سبب سے جو تم بیان کرتے ہو بڑی خرابی ہے۔(21:16-18)

یہ آیت اُن آیات میں سے جن میں قرآن کا یہ بنیادی دعویٰ بیان کیا گیا ہے کہ یہ کائنات اللہ تعالیٰ کی ایک بامقصد تخلیق ہے۔کائنات اور اس کے ہر مظہر کے پیچھے ایک بلند حکمت اور مصلحت کارفرما ہے۔

یہ جو انسانی دُنیا مین حق و باطل (خیر اور شر، نیکی اور بدی) کی ایک کشمکش جاری ہے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ خالق نے اپنا جی بہلانے کے لئے ایک کھیل تماشہ، ڈرامہ یا ناٹک رچایا ہوا ہے، جب تک وہ چاہے گا اس سے لطف اندوز ہوگا اور جب اُکتا جائے گا تو اسے ختم کرکے کوئی نیا کھیل ایجاد کرلے گا۔ قرآن کہتا ہے کہ کائنات کھیل تماشے کے طور پر نہیں بلکہ ایک ارفع حکمت اور مقصدیت کے تحت پیدا کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس بات سے پاک اور منزہ ہے کہ کوئی چیز محض دل لگی کرتے ہوئے تفریح کے طور پر پیدا کرے۔

اَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا ۭ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاۗءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ۭ اَفَلَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ (21:30)

کیا انکار کرنے والوں نے غور نہیں کیا کہ آسمان اور زمین باہم ملے ہوئے تھے، پھر ہم نے انھیں الگ

الگ کر دیا(1)۔ اور ہم نے پانی سے ہر زندہ چیز پیدا کی(2)۔ تو کیا وہ اب بھی ایمان نہیں لاتے۔

1۔ یہاں دو خاص لفظ ''رتق'' اور ''فتق'' استعمال ہوئے ہیں۔ ''رتق'' کا معنی ہے باہم پیوست ہونا، ایک دوسرے کے ساتھ ملا ہوا ہونا یعنی ضم و التحام (مفردات)، اور ''فتق'' کا معنی ہے دو ملی ہو چیزوں کو الگ الگ کر دینا یعنی الفصل بین المتصلین (مفردات) آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ابتداء میں آسمان اور زمین ایک دوسرے میں پیوست تھے، شئے واحد((Single unit) یعنی ایک ہی چیز تھے اللہ تعالیٰ کے تخلیقی عمل نے انھیں الگ الگ کر دیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ، الضحاک،عطا اور قتادہ رحھم اللہ علیھم جیسے بلند پایہ مفسرین سے اس آیت کریمہ کا یہی مفہوم منقول ہے۔

اس مفہوم کی اگر ہم سائنسی تعبیر کرنا چاہیں تو دو طرح سے کر سکتے ہیں: ایک کائنات کے حوالے سے اور دوسرے نظام شمسی کے حوالے سے۔

بگ بینگ سے کائنات کی تخلیق اور پھیلاؤ۔ کہکشاؤں کی تخلیق۔

کائنات کے حوالے سے:

تمام کائنات جو کہکشاؤں، ستاروں، سیاروں اور دوسرے اجرامِ سماوی کی شکل میں پھیلی ہوئی ہے وہ آج سے لگ بھگ 15ارب سال قبل ایک وحدت کی شکل میں موجود تھی۔ وہ ابتدائی شکل جس تک ہمارے طبیعاتی قوانین (Physical Laws کی رسائی ہوسکی ہے بلند توانائی کی حامل گاما شعاعوں (Gamma Rays) پر مشتمل تھی جن سے مادے کی تشکیل ہوئی۔ اور جس سے آگے چل کر اربوں سالوں میں وہ کائنات وجود میں آئی جس سے آج ہم واقف ہیں اور جسے زمین کی نسبت سے ''آسمان اور زمین'' کا نام دیتے ہیں۔

یہ بات توجہ طلب ہے کہ آیت میں آسمانوں کا لفظ جمع استعمال ہوا ہے یعنی سماوات اور زمین کا لفظ واحد یعنی ارض۔

نظامِ شمسی کے حوالے سے:

ہمارے نظامِ شمسی (Solar System) کی تشکیل آج سے تقریباً 5 ارب سال قبل ایک واحد وجود سے ہوئی۔ جسے شمسی سحابیہ (Solar nebula) کہا جاتا ہے۔ یہ سحابیہ گیس اور گرد (Gas and dust) کے ایک عظیم بادل کی شکل میں موجود تھا۔ اس میں ایک ارتقائی تخلیقی عمل ہوا جس کے نتیجے میں اس کا مرکزی حصہ سورج کی شکل میں اور بیرونی حاشیہ سیاروں (Planets) کی شکل میں وجود پذیر ہوا۔ ان میں ایک ہماری زمین بھی ہے۔گویا زمین ایک آزاد سیارہ کی شکل میں وجود میں آنے سے پہلے ایک آسمانی وجود یعنی شمسی سحابیّہ کا حصہ تھی۔ جس سے ایک تدریجی تخلیقی عمل کے ذریعے اُس سے علیحدہ ہوئی۔

2۔ اس آیت کی رو سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ تمام جانداروں یعنی نباتات، حیوانات اور انسان کو پانی سے پیدا کیا گیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ پانی سے جانداروں کی تخلیق سے کیا مراد ہے؟

اس کا ایک معنیٰ تو یہ ہے پانی جانداروں کے جسم کا لازمی حصہ ہے مثال کے طور پر انسان کے جسم میں تقریباً ستر فیصد پانی ہوتا ہے۔ پانی کی مخصوص فیصد کو جسم میں برقرار رکھنے کے لئے جانداروں کو مسلسل طور پر پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ لہٰذا جانداروں کی زندگی کا دارومدار پانی پر ہے۔

دوسرا مفہوم یہ ہے کہ جانداروں کی خلقت کا آغاز پانی کے

واسطے(Medium) میں ہوا ہے۔ آج سے کوئی ساڑھے تین ارب سال قبل سمندروں کے کناروں پر پانی میں موجود مادے میں نہایت لمبے کیمیائی عمل کے نتیجے میں اولیں جانداروں کی تخلیق ہوئی۔ ان اولیں جانداروں کے طویل ارتقاء کے نتیجے میں بالآخر آج کے تمام جاندار وجود میں آئے۔ اس تصور کو زندگی کا آبی آغاز یا (Aquatic Origin of life) کہا جاتا ہے۔

وَجَعَلْنَا فِي الْأَرْضِ
رَوَاسِيَ أَن تَمِيدَ بِهِمْ وَجَعَلْنَا فِيهَا فِجَاجًا
سُبُلًا لَّعَلَّهُمْ يَهْتَدُونَ ۝ وَجَعَلْنَا السَّمَاءَ سَقْفًا
مَّحْفُوظًا ۖ وَهُمْ عَنْ آيَاتِهَا مُعْرِضُونَ ۝
وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۖ
كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ ۝

(21:31-33)

اور ہم نے زمین میں پہاڑ بنائے ہیں تاکہ وہ ان کو لے کر لرزتی نہ رہے، اور اس میں کشادہ راہیں بنائیں ہیں تاکہ وہ راہ پائیں[1]۔

اور ہم نے آسمان کو ایک محفوظ چھت بنایا ہے[2]،

اور (لوگوں کا حال یہ ہے کہ) وہ اُس کی نشانیوں سے روگردانی کئے ہوئے ہیں۔ اور (اللہ) وہی ہے جس نے رات اور دن، اورسورج اور چاند بنائے ہیں۔ سب ایک ایک مدار میں تیر رہے ہیں[3]۔

1۔ پہاڑوں کی افادیت پر نوٹ پہلے گزر چکا ہے، دیکھیں سورہ النحل 16:15۔ دوسری بات جو یہاں کہی جارہی ہے وہ کشادہ راہیں ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ زمین میں صرف بلندو بالا پہاڑ ہی نہیں ان کے درمیان درّے اور کشادہ راہیں

بھی ہیں جن کے ذریعے انسان ایک علاقہ سے دوسرے علاقہ میں منتقل ہوسکتا ہے۔ اگر پہاڑوں کے درمیاں یہ راستے نہ ہوتے تو انسانوں کا بہ آسانی ایک خطے سے دوسرے خطے میں سفر ممکن نہ ہوتا اور یوں مختلف خطوں کے لوگ ایک دوسرے سے بڑی حد تک کٹے رہتے۔

2۔ ''آسمان'' ایک محفوظ چھت کے طور پر ہمارے سروں پر قائم ہے۔ امکانِ غالب یہ ہے کہ یہاں'' سماء'' (آسمان) کا لفظ زمین کے کرۂ ہوائی (Atmosphere) کے معنوں میں ہے یہ کرہ ہوائی ہی ہے جو ہمارے سروں پہ چھت کی طرح تنا ہوا ہے۔ اور ہماری اور دوسرے جانداروں کی بیرونی خطرات سے حفاظت کرتا ہے۔ مزید تفصیل کے لئے دیکھیں سورہ البقرہ 2:22۔
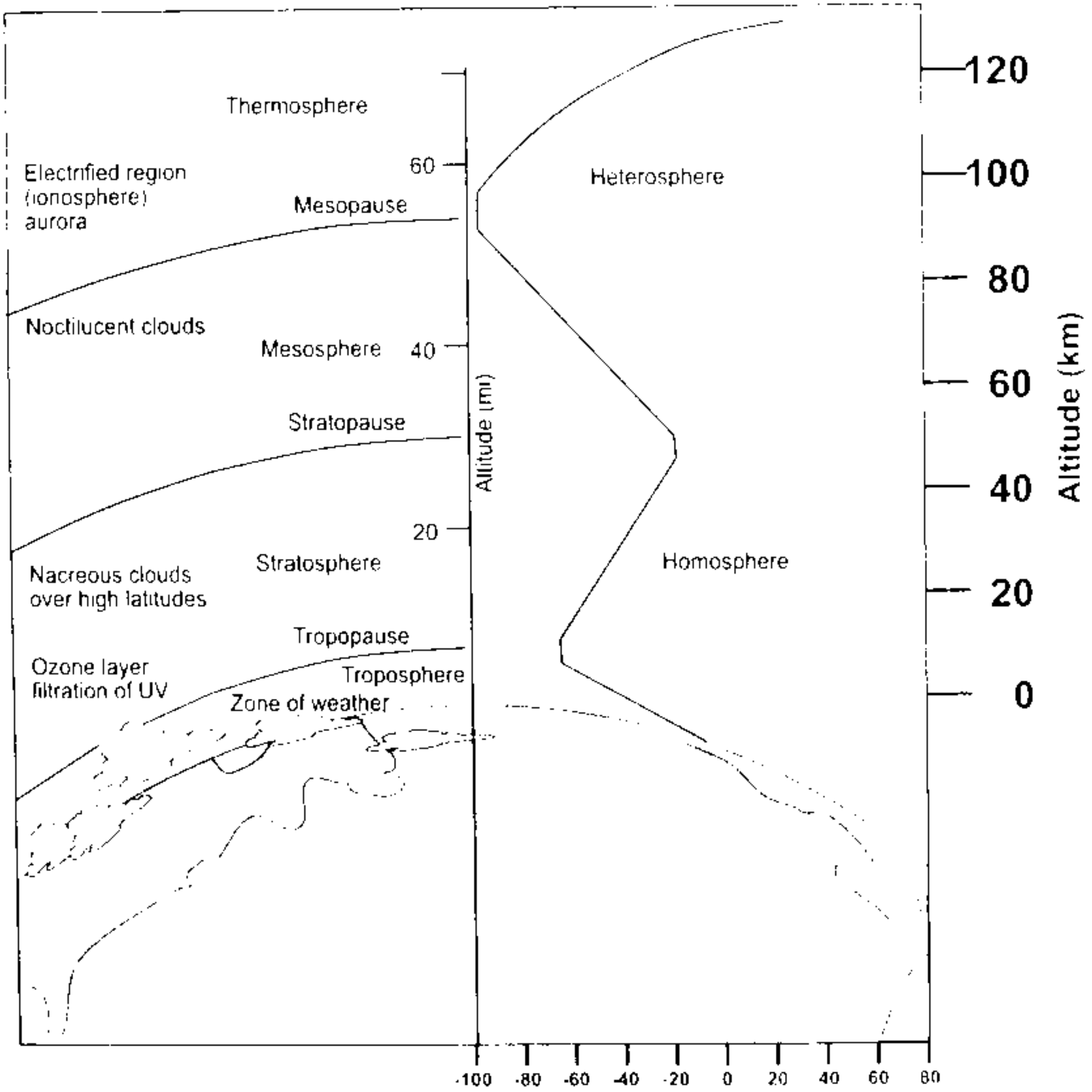
زمین کا کرہ ہوائی (محفوظ چھت)، زمین کا آسمان۔

3۔ سورج، چاند اور دوسرے اجرامِ سماوی (Heavenly bodies)

خلاء کی وسعتوں میں اپنے اپنے مداروں (Orbits) پر تیر رہے ہیں۔

"لیل و نہار" (رات اور دن) کی گردش زمین کی محوری گردش (Spin) کو ظاہر کرتی ہے۔ زمین ایک سیارہ (Planet) ہے۔ سورج ایک ستارہ (Star) ہے جبکہ چاند ایک ذیلی سیارہ یا نواحیہ (Satellite) ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کائنات کے تمام ستارے، سیارے اور چاند گردش میں ہیں۔

"فلک" ستاروں، سیاروں اور دوسرے اجرامِ سماوی کے حرکت کے راستوں یا مداروں کو کہتے ہیں۔

"یسبحون"،"سَبَح" کے مادے سے ہے اس کا معنی ہے کسی واسطے (پانی، فضا، خلاء) میں حرکت کرنا (تیرنا)، اور تیز حرکت کرنا۔ یہاں یہ لفظ اجرام سماوی کی تیز حرکت کے لئے استعمال ہوا ہے۔

نزولِ قرآن کے زمانے میں بطلیموس (Ptolemy) کا تصور کائنات چھایا ہوا تھا جس کے مطابق ستارے، سیارے اور دوسرے اجرامِ سماوی "آسمانوں" میں جڑے ہوئے تھے۔ یہ آسمان حرکت کرتے ہوئے مانے جاتے تھے جن کے ساتھ اُن میں جڑے ہوئے اجرام بھی حرکت کرتے تھے اجرام کی اپنی کوئی حرکت نہیں تھی۔ یہ تصور بہت دیر تک قائم رہا ہے۔ حتیٰ کہ اس کے اثرات شاعری تک پڑے۔ مثال کے طور پر غالب کا شعر ہے:

رات دن گردش میں ہیں سات آسمان
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

لیکن قرآن مجید نے بطلیموس کے تصور کے برعکس قرار دیا کیا اجرام سماوی اپنے اپنے مداروں میں تیزی سے حرکت کر رہے ہیں۔ یہ وہ بات ہے جس کو دور جدید کے سائنسی مشاہدات نے ثابت کیا ہے۔ قرآن کا اپنے زمانہ کے غلط نظریہ کو نہ لینا اور ایک ایسی بات کا اعلان کرنا جس کی تصدیق آئندہ کئے جانے والے سائنسی انکشافات ہی سے ہوئی تھی، قرآن کا ایک سائنسی معجزہ ہے۔

يَوْمَ نَطْوِي السَّمَآءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ ۚ كَمَا بَدَاْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ ۚ وَعْدًا عَلَيْنَا ۚ اِنَّا كُنَّا فٰعِلِيْنَ ۝ (21:104)

جس دن ہم آسمان کو اس طرح لپیٹ لیں گے
جیسے لکھے ہوئے طومار لپیٹ لیتے ہیں، جس طرح ہم
نے (کائنات کو) پہلے پیدا کیا تھا اُسی طرح دوبارہ
پیدا کریں گے۔ یہ وعدہ ہے ہم پر، ہم (ایسا) ضرور
کرنے والے ہیں۔

قدیم زمانے میں تحریریں (مثلاً خطوط) ایسے کاغذوں پر لکھی جاتی تھی جن کو لکھ کر لپیٹ لیتے تھے۔ انھیں "سِجل" یا طومار کہا جاتا ہے۔ انگریزی میں ان کے لئے Scrolls کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔

اس آیت میں کائنات، اس کے انجام اور اس کے اعادے کو ایک نہایت خوبصورت تشبیہ کے ذریعے سمجھایا گیا ہے۔ اس وقت طومار کھل رہے ہیں (کائنات وسعت پذیر ہے) اور اس کے نقوش و خطوط پڑھے جارہے ہیں، ایک وقت آئے گا جب یہ طومار مکمل طور پر کھل چکے ہوں گے (کائنات اپنے حدِ امکان تک وسعت پاچکی ہوگی) اس کے بعد ان طوماروں کو لپیٹ دیا جائے گا (کائنات اپنے اختتام کو پہنچ جائے گی)۔

کائنات کے خاتمے کے بعد اللہ تعالیٰ ایک نئی دنیا تخلیق کرے گا، جس کا کوئی تصور ہم اپنی موجودہ زندگی اور سمجھ کی سطح پر نہیں کرسکتے۔

"The world the universe as we know it will be folded up like a scroll of parchment, for it will have done its work".(A.Yousf Ali).

"This is an allusion to the cataclysmic change on the last day of all natural phenomena, and thus of the universe known to man." (Asad).

يَاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ ؕ وَنُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ ۚ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْـًٔا ؕ وَتَرَى الْاَرْضَ هَامِدَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَاَنْۢبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍ بَهِيْجٍ ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّهٗ يُحْيِ الْمَوْتٰى وَاَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ (22:5-6)

اے لوگو! اگر تم دوبارہ جی اُٹھنے کے بارے میں شک میں ہو تو دیکھو کہ ہم نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا[1]۔ پھر نطفہ سے، پھر علقہ سے، پھر مضغہ سے، جو مکمل بھی ہوتا ہے اور نامکمل بھی[2]۔ یہ اس لئے کہ ہم تم پر (اپنی قدرت کا کمال) واضح کر دیں[3]۔ اور ہم جسے چاہتے ہیں ایک معین مدت کے لئے رحموں میں قرار بخشتے ہیں۔ پھر ہم تمہیں ایک بچہ کی شکل میں پیدا

کرتے ہیں۔ پھر ایک وقت دیتے ہیں کہ تم اپنی جوانی کو پہنچو، اور تم میں سے بعض پہلے ہی وفات پا جاتے ہیں، اور بعض بڑھاپے کی آخری تک کو پہنچتے ہیں یہاں تک کہ وہ جاننے کے بعد کچھ بھی نہیں جانتے۔

اور تم دیکھتے ہو کہ زمین بالکل خشک پڑی ہے، پھر جب ہم اس پر پانی برساتے ہیں تو وہ لہلہانے لگتی ہے، اور پھولتی ہے اور طرح طرح کی خوشنما نباتات اُگاتی ہے[4]۔

یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ (تم جان لو کہ) یقیناً اللہ حق ہے اور (یہ کہ) وہ مردوں کو زندہ کرے گا، اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

1۔ یہاں انسان کی دو تخلیقوں کا ذکر ہے: ۱۔ مٹی سے تخلیق، ۲۔ رحم مادر میں جنینی نشوونما کے ذریعے تخلیق۔

مٹی سے تخلیق کا معنی: یہاں لفظ ''تراب'' استعمال ہوا ہے۔ جس کا معنی مٹی ہے۔ سائنسی زبان میں مٹی سے مراد وہ چیز ہے جسے جدید دور میں مادہ (Matter) کہا جاتا ہے۔ قدیم زمانے میں مادے کے چار عناصر مانے جاتے تھے۔ مٹی، پانی، ہوا اور آگ۔ مگر یورپ میں نشاۃ الثانیہ کے بعد کیمیائی تجزیہ (Chemical analysis) کے طریقوں میں جو ترقی ہوئی اس سے یہ بات ثابت ہوئی کہ مٹی ایک عنصر نہیں بلکہ بہت سے عناصر کا مجموعہ ہے جو کیمیائی مرکبات (Chemical compounds) کی شکل میں مٹی میں موجود ہوتے ہیں۔ اسی طرح پانی دو عناصر آکسیجن اور ہائیڈروجن کا مرکب ہے اور یہ عناصر مٹی میں بھی موجود ہوتے ہیں۔ ہوا کئی گیسوں کا آمیزہ ہے جس میں تقریباً 78 فیصد نائٹروجن گیس ہوتی ہے جبکہ تقریباً 20 فیصد آکسیجن گیس، ایک فیصد ارگان گیس 0.03 فیصد کاربن ڈائی آکسائیڈ گیس اور بقیہ تھوڑی سی مقدار میں دوسری گیسیں ہوتی ہیں۔ ہوا کی جن گیسوں کا ابھی ذکر ہوا ہے ان میں کاربن ڈائی آکسائیڈ ایک مرکب ہے

جو کاربن اور آکسیجن سے مل کر بنا ہوتا ہے۔ جبکہ باقی گیسیں عناصر ہیں۔ آگ بھی ایک عنصر نہیں۔ آگ کی مرکزی چیز حرارتی توانائی ہے جب کہ آگ کے شعلوں میں حرارتی توانائی کی موجوں کے ساتھ کاربن ڈائی آکسائیڈ، آبی بخارات اور دھوئیں کے ذرات وغیرہ پائے جاتے ہیں۔ یہ تمام عناصر بھی مٹی میں موجود ہوتے ہیں۔

لہذا، عناصر کے جدید فہم کی بنیاد پر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انسان کی مٹی سے تخلیق کا سائنسی زبان میں معنی ہے بے جان مادے سے تخلیق۔

اب، آیت کے مفہوم میں دو احتمالات ہیں:

ا۔ یہ کہ ابتدائی طور پر انسان کی تخلیق مادے سے ہوئی ہے۔ یعنی بے جان مادے سے جاندار انسان کی تخلیق (Abiogenesis) اور

۲۔ دوسرا یہ کہ ہر انسان مادے سے بنا ہوا ہے اور تغذیہ کے ذریعے بے جان مادی اجزاء جن پر کہ غذا مشتمل ہوتی ہے، انسانی بدن کا حصہ بن جاتے ہیں۔ یعنی ہم جو غذا کھاتے ہیں وہ بے جان مادی اجزاء پر مشتمل ہوتی ہے مگر جب یہ اجزاء ہمارے بدن کا حصہ بنتے ہیں تو زندہ مادے کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

اگر دوسرا احتمال درست ہے تو اس کا طریقہ تو واضح ہے۔ لیکن اگر آیت کی تشریح کا پہلا احتمال درست ہے تو سوال یہ ہے کہ اس کا طریقہ یہ تھا یعنی بے جان مادے سے اولیں انسان کیسے وجود میں آیا یعنی بے جان مادے سے انسان کے "بننے کا طریقہ" کیا تھا۔ اس کے بارے میں دو تصورات ہیں ایک "تخلیق خاص" (Special Creation) کا نظریہ کہتے ہیں اور دوسرا ارتقاء (Evolution) کا نظریہ۔ تخلیق خاص کا نظریہ یہ کہتا ہے کہ بے جان مادے اور انسانِ اول کے درمیان کوئی اور جاندار شامل نہیں۔

اس نظریہ کی عمومی شکل یہ ہے کہ انسان اول حضرت آدم علیہ السلام ہیں اور ان کی تخلیق اس طرح ہوئی کہ مٹی کا ایک پتلا بنایا گیا اور اس میں روح ڈالی گئی یوں براہ راست ایک مکمل انسان وجود میں آ گیا۔

نظریہ ارتقا یہ کہتا ہے کہ آج سے کروڑوں سال پہلے سمندروں کے کنارے مخصوص حالات کے تحت کیچڑ میں نہایت سادہ جاندار وجود میں آئے جن میں جسمانی سطح پر تبدیلیاں ہوتی رہیں جس سے رفتہ رفتہ لاکھوں کروڑوں سالوں میں دُنیا کے تمام جاندار پیدا ہوئے اور سلسلہ کی آخری کڑی کے طور پر انسان نمودار ہوا۔ گویا بے جان مادے اور انسان کے درمیان جسمانی سطح کے تغیرات کی کروڑوں

سالوں پر پھیلی ہوئی ایک لمبی زنجیر موجود ہے۔

رحمِ مادر میں جنینی نشوونما (Embryonic Development): ماں کے رحم میں بچہ مختلف مراحل سے گزرتا ہے۔ اس پر تفصیلی گفتگو سورہ المؤمنون (23:12-14) میں کی جائے گی۔

2۔ مخلقہ و غیر مخلقہ (مکمل بھی اور نامکمل بھی) کا مفہوم:

''مضغہ'' جنین کی ''علقہ'' کے بعد کی حالت ہے، یہ وہ حالت ہے جس میں جنین اپنی ظاہری شکل و صورت میں ایک چبائی ہوئی بوٹی کی طرح ہوتا ہے۔ (تفصیل کے لئے دیکھیں سورہ المومنون (23:12-14)۔

مخلقہ: وہ شے جس کی تخلیق کا نقشہ وجود میں آجائے۔ لہٰذا مخلقہ اور غیر مخلقہ کے الفاظ کا معنی یہ ہے کہ جب جنین مضغہ کی حالت سے گزر رہا ہوتا ہے تو اس میں بعض اعضا نمایاں ہونا شروع ہوجاتے ہیں اور بعض ابھی نمایاں ہونا شروع نہیں ہوتے۔ دوسرے لفظوں میں بعض اعضا کا ابتدائی نقشہ ظاہر ہوجاتا ہے۔ اور بعض کا ابتدائی نقشہ ابھی ظاہر نہیں ہوتا یعنی جنین قدرے مکمل اور قدرے غیر مکمل ہوتا ہے۔

3۔لِنُبَيِّنَ لَكُمْ: (تاکہ ہم تم پر واضح کردیں [اپنی قدرت کا کمال]) کے الفاظ بہت غور طلب ہیں۔ ان کے ذریعے انسان کی عقل و فکر کو تحریک دی جاری ہے، مقصد یہ ہے کہ انسان اپنی خلقت کے مختلف مراحل پر غور کرے تاکہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور ربوبیت کا کمال اُس پر واضح ہوسکے۔

4۔خشک زمین میں کوئی چیز نہیں اُگتی۔ پودوں کو اُگنے اور نشوونما پانے کے لئے پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ کسان اگر خشک مٹی میں بیج بو دے تو وہ ضائع چلے جائیں گے۔

دریاؤں، نہروں، چشموں اور کنوؤں کے پانی کا بالآخر دارومدار بارش پر ہی ہوتا ہے، لیکن بارانی زمینوں کو تو پانی براہِ راست بارش ہی سے ملتا ہے۔ جب بارش نہیں ہوتی تو یہ زمینیں خشک پڑی ہوتی ہیں۔ کسان انتظار کرتا ہے کہ کب بارش ہو اور وہ بوائی کرے۔

اس کے علاوہ جو جڑی بوٹیاں، جھاڑیاں، درخت اور گھاس وغیرہ جن کو پانی براہ راست بارش سے ملتا ہے، ان کے باریک باریک بیج زمین میں بکھرے ہوتے ہیں، جب تک انھیں پانی نہیں ملتا، خوابیدہ (Dormant) پڑے رہتے

ہیں۔ جب بارش ہوتی ہے تو ان بیجوں کو پانی ملتا ہے جسے یہ جذب کرتے ہیں اور ان میں چھپا ہوا ننھا جنین (Embryo) نشوونما پانا شروع کر دیتا ہے، اور دیکھتے ہی دیکھتے زمین گھاس، جڑی بوٹیوں اور دوسرے پودوں سے لہلہانے لگتی ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ وَالْفُلْكَ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ۭ وَيُمْسِكُ السَّمَاۗءَ اَنْ تَقَعَ عَلَي الْاَرْضِ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ؀ (22:65)

کیا تم دیکھتے نہیں کہ اللہ نے تمہارے لئے زمین کی ہر چیز کو مُسخر کیا ہوا ہے[1]، اور کشتی کو بھی کہ سمندر میں اُس کے حکم سے چلتی ہے[2]۔ اور اس نے آسمان کو روکا ہوا ہے کہ مبادا وہ زمین پر گر پڑے مگر یہ کہ اُس کے حکم سے۔ بے شک اللہ لوگوں کے ساتھ بہت مہربانی فرمانے والا، ہمیشہ رحم کرنے والا ہے۔

1۔زمین کی ہر چیز انسان کی مطیع اور فرماں بردار بنادی گئی ہے۔ زمین کی ہر چیز انسان کی خدمت گزار ہے۔ انسان اس سے اپنے فائدے کا کام لے سکتا ہے۔ مادی اشیاء اور مظاہر (ہوا، دریا، معدنیات وغیرہ) نباتات اور حیوانات میں انسان کے لئے طرح طرح کے فائدے رکھے گئے ہیں، انسان جنھیں حاصل کرسکتا ہے۔

2۔کشتی (اس میں تمام بحری اور آبی ذرائع آمدو رفت شامل ہیں) پانی میں اللہ کے امر سے چلتی ہے یعنی اللہ کے ودیعت کردہ قانون کے مطابق۔ انسان کی توجہ سمندروں کی طرف مبذول کروائی جارہی ہے۔ ایک تو آمدورفت کے لئے مگر اس کے ساتھ ساتھ اس کے غذائی اور دوسرے فوائد کے حصول کے لئے ۔

3۔ ایک طرف مرکز مائل اور مرکز گریز قوتوں کے توازن نے تمام اجرامِ سماوی کو اپنے اپنے مداروں پر مصروفِ حرکت رکھا ہوا ہے، اور دوسری طرف،

زمین کے گرد موجود کرۂ ہوائی کا دبیز غلاف آسمانی پتھروں (شہابیوں: Meteorites) سے زمین کی حفاظت کرتا ہے۔ اجرام سماوی (اور شہابیوں) کی ہر حرکت اللہ تعالیٰ کے قانون کے تحت ہے۔
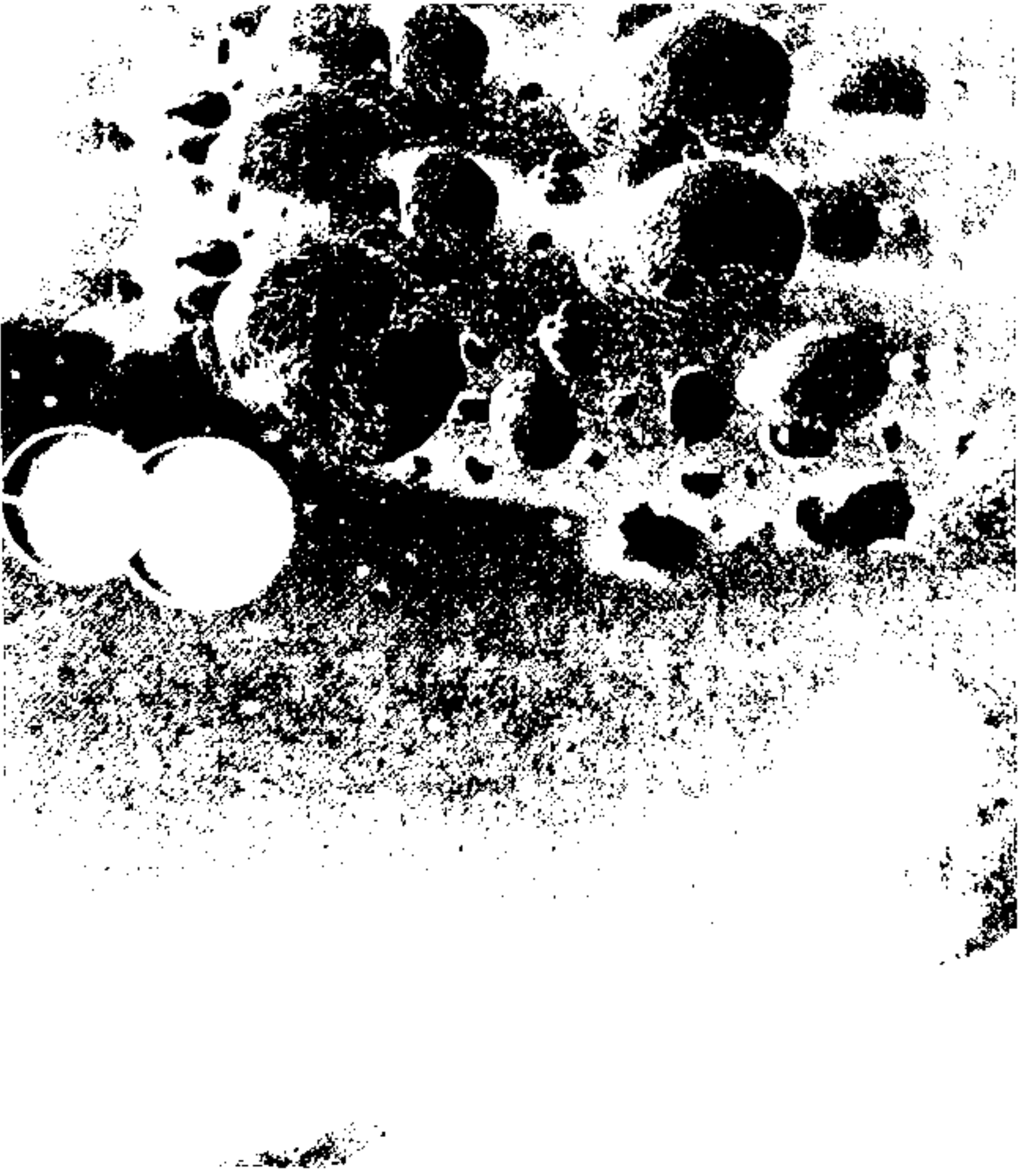
سورہ المؤمنون (23)

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن سُلَالَةٍ مِّن طِينٍ ۝ ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ ۝ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَامًا فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا ثُمَّ أَنشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ ۚ فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ ۝

(23:12-14)

اور بے شک ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصہ[1] سے تخلیق کیا۔ پھر (یہ کہ) ہم نے اُسے ایک نُطفہ[2] کی شکل میں ایک محفوظ مقام میں ٹھہرایا، پھر اس نطفہ کو علقہ کی شکل دی، پھر علقہ سے مضغہ بنایا اور مُضغہ میں ہڈیاں تشکیل دیں اور ہڈیوں پر گوشت چڑھایا[3]۔ پھر ہم نے نشوونما دیتے ہوئے اُسے ایک مختلف مخلوق بنادیا[4]۔ پس بڑا ہی بابرکت ہے اللہ جو بہترین پیدا کرنے والا ہے۔

1۔یہاں ایک خاص لفظ ''سُلالہ'' استعمال ہوا ہے۔ اس کا معنی خلاصہ (Extract) کیا جاسکتا ہے۔ کئی اشیاء کے آمیزے (Mixture) میں سے اپنی مرضی کے اجزاء کو جب الگ کیا جاتا ہے تو انھیں سلالہ کہا جاتا ہے۔ یہاں قرآن مجید کہتا ہے کہ انسان کو مٹی کے سلالہ سے پیدا کیا گیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ مٹی کے

سلالہ کا کیا معنی ہے۔ جدید کیمیا ہمیں بتاتی ہے کہ اس کا معنی ہے مادے کے منتخب عناصر (Selected Elements of Matter)یعنی انسان کی تخلیق مٹی (مادے) کے تمام عناصر سے نہیں بلکہ منتخب عناصر سے ہوئی ہے۔ یہ عناصر انسانی جسم میں مخصوص تناسب میں ہوتے ہیں۔

دوسرا لفظ یہاں ''طین'' استعمال ہوا ہے۔ جو گیلی مٹی، گارے یا کیچڑ کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اب ایک معنی یہ ہوگا کہ انسان کی ابتدائی تخلیق گیلی مٹی یا گارے یا کیچڑ کے منتخب اجزا سے ہوئی ہے۔ اور دوسرا معنی یہ ہوگا کہ انسان کی جسمانی ساخت مٹی (یا مادے) کے منتخب عناصر سے ہوتی ہے۔

2۔ نطفہ، علقہ اور مضغہ کا معنی:

''نطفه'': وہ تھوڑا سا پانی جو ڈول کو خالی کرنے پر اُس میں باقی رہ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ صاف نتھرے ہوئے پانی کو بھی نطفہ کہتے ہیں (لسان العرب، مفردات)۔ اس کا اطلاق مرد کے تولیدی مادے پر بھی ہوتا ہے اور عورت کے تولیدی مادے پر بھی۔ مرد اور عورت کے نطفوں کے ملاپ سے بننے والے مادے پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

''اُسے نطفہ بنا کر محفوظ مقام میں رکھا'' کے الفاظ سے یہ اشارہ ملتا ہے اس سے مراد وہ تولیدی مادہ ہے جو شکمِ مادر میں مرد اور عورت کے تولیدی مادوں کے ملاپ سے بنتا ہے۔ ممکن ہے اس میں جنین (Embryo) کی بالکل ابتدائی حالت کی طرف اشارہ ہو جس کا آغاز زائی گوٹ (Zygote)سے ہوتا ہے۔

''علقه'': (العلق کے مادے سے ہے)۔ اس کے بنیادی معنی، وابستہ ہونا، پھنسا اور لٹکنا وغیرہ ہیں۔ کہا جاتا ہے عَلِقَ الصَّیدُ فِیْ حُبالة (شکار جال میں پھنس گیا۔مفردات) ابن فارس نے کہا ہے کہ العلق کے بنیادی معنی کسی بلند چیز کے ساتھ کسی چیز کو باندھنا یا وابستہ کر دینا ہے۔

العلق جونک کو بھی کہتے ہیں جو حلق کے ساتھ وابستہ ہوجاتا ہے۔ لوتھڑے کی شکل میں جمے ہوئے خون کو بھی علق کہتے ہیں (مفردات)، وہ چیز جو معلق ہو (المنجد)۔

جن آیات میں علقہ (یاعلق) لفظ آیا ہے اُن پر غور کرنے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اس سے مراد جنین کی وہ ابتدائی حالت ہے جب وہ خود کو رحمِ

مادر کے ساتھ چسپاں کر کے معلق ہو جاتا ہے۔

اس کا ترجمہ معلق وجود (Hanging mass) اور چمٹی ہوئی چیز (Somthing that clings) اور جونک کی طرح کا جسم (Leech-like structure) بھی کیا گیا ہے۔

علم جنینیات (Embryology) کی رو سے علقہ کا لفظ Pre-embryonic دور جب جنین خود کو رحم کے ساتھ چسپاں (یعنی Implant) کرتا ہے، اور Embryonic دور کے ابتدائی دنوں کی حالت کی تصویر کشی کرتا ہے۔

رحم مادر میں بارووری اور بعد کے مراحل پہلے ہفتہ کے دوران۔
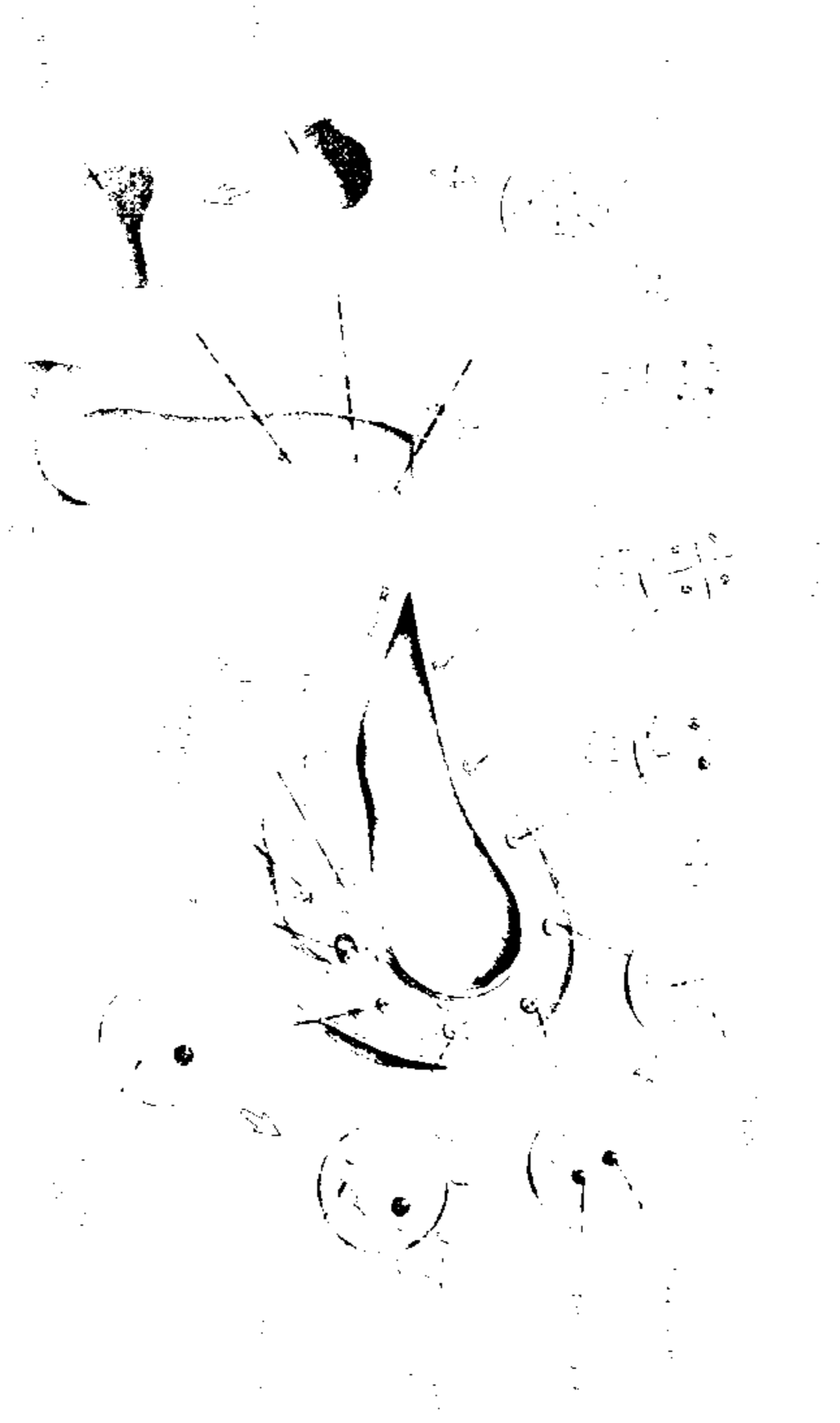
مختلف ہفتوں کے دوران انسانی جنین کی شکل۔
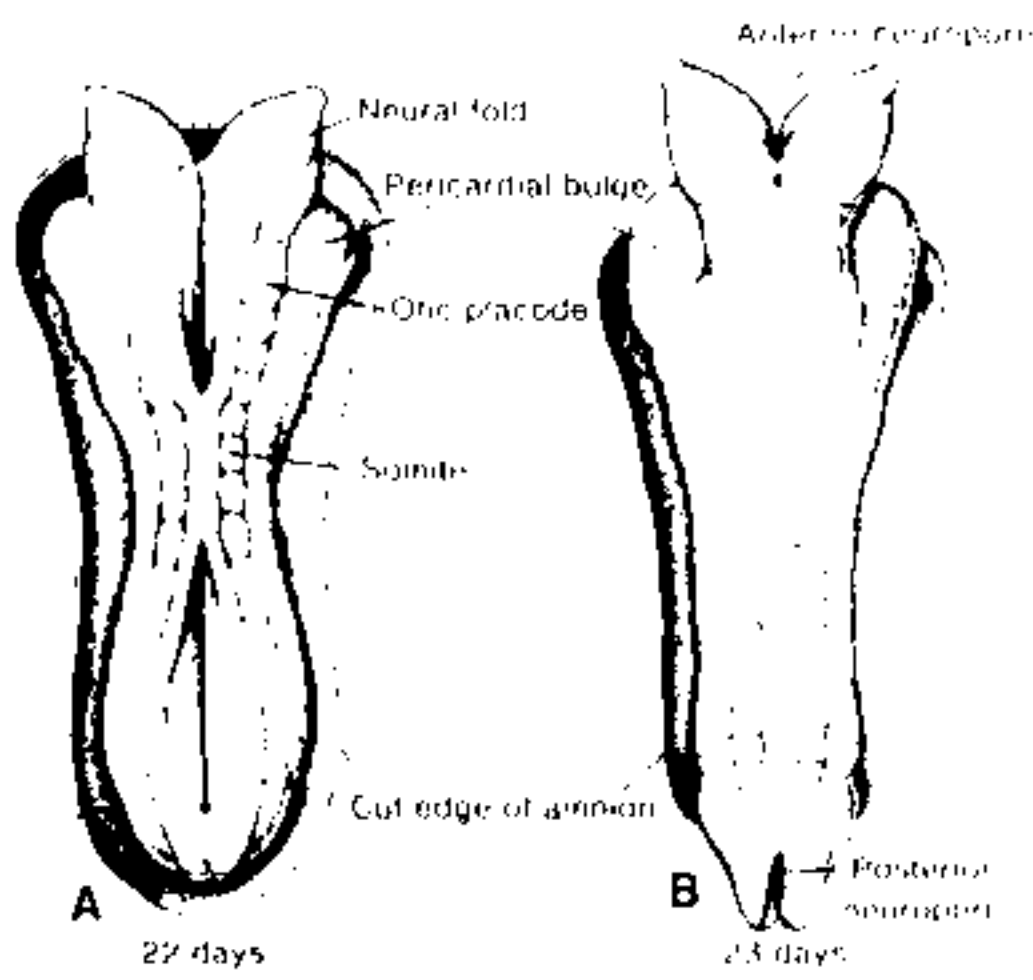
انسانی جنین کا ظہری منظر۔
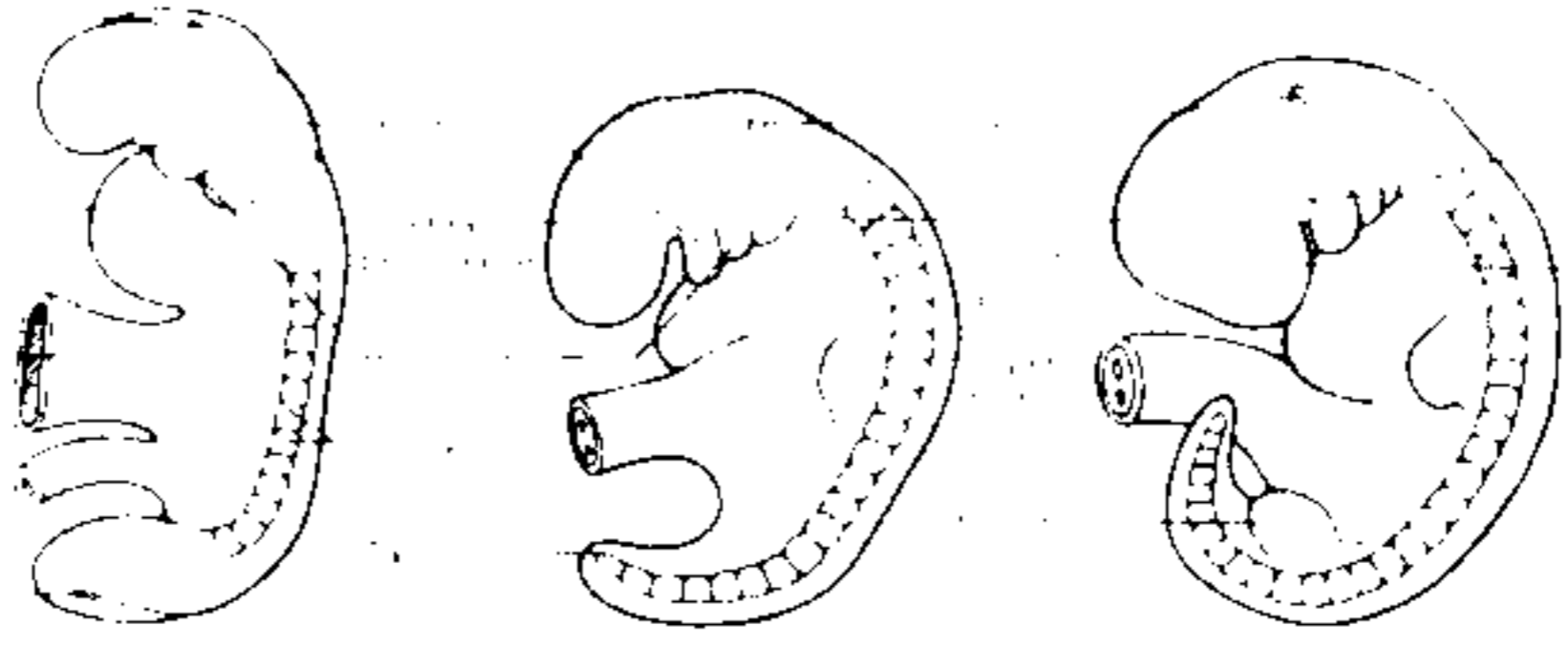
چوتھے ہفتے کے دوران جنین میں ہونے والی تبدیلیاں۔

نویں ہفتے سے اڑتیسویں (38) ہفتے کے دوران
بچے کی ظاہری شکل میں تبدیلیاں۔
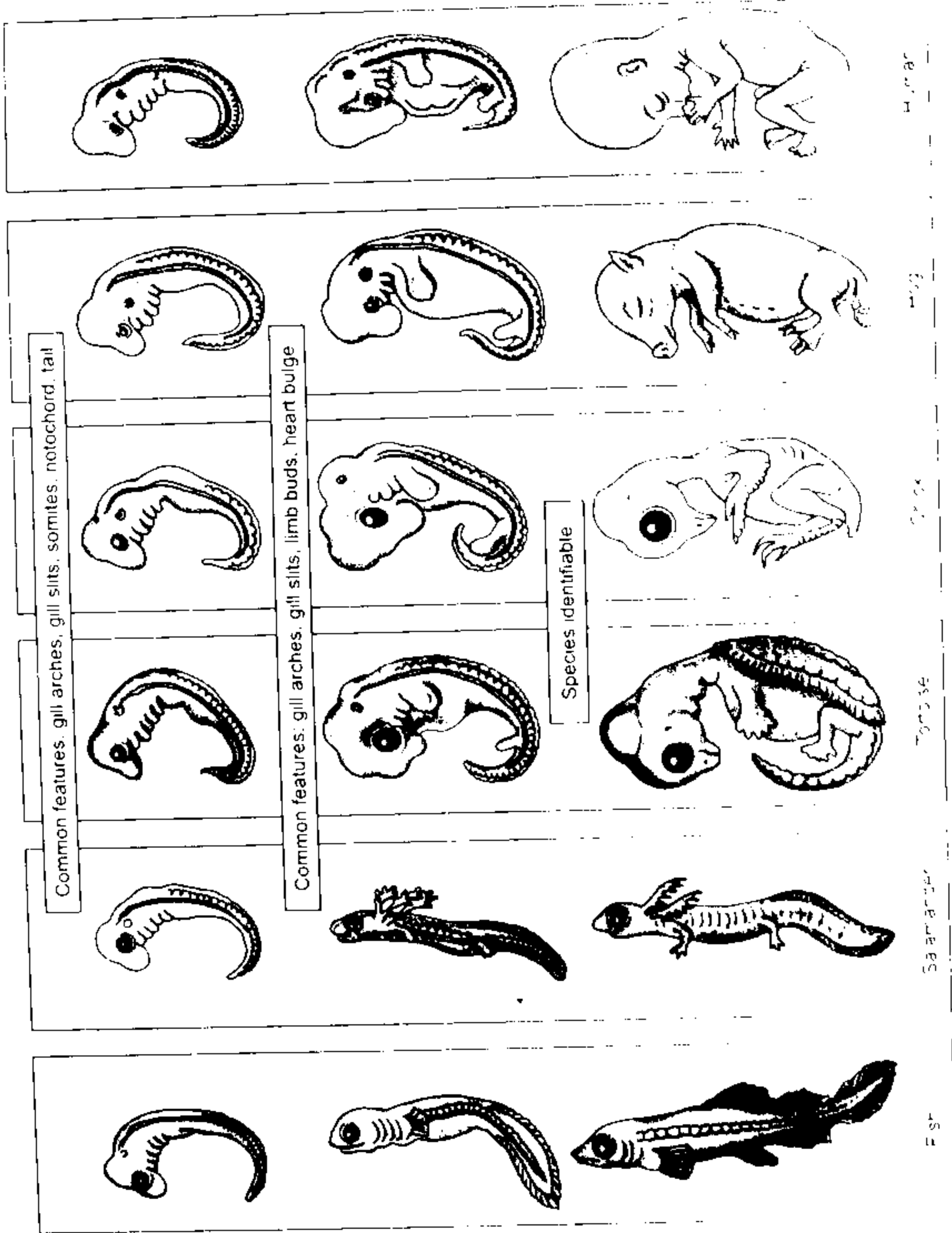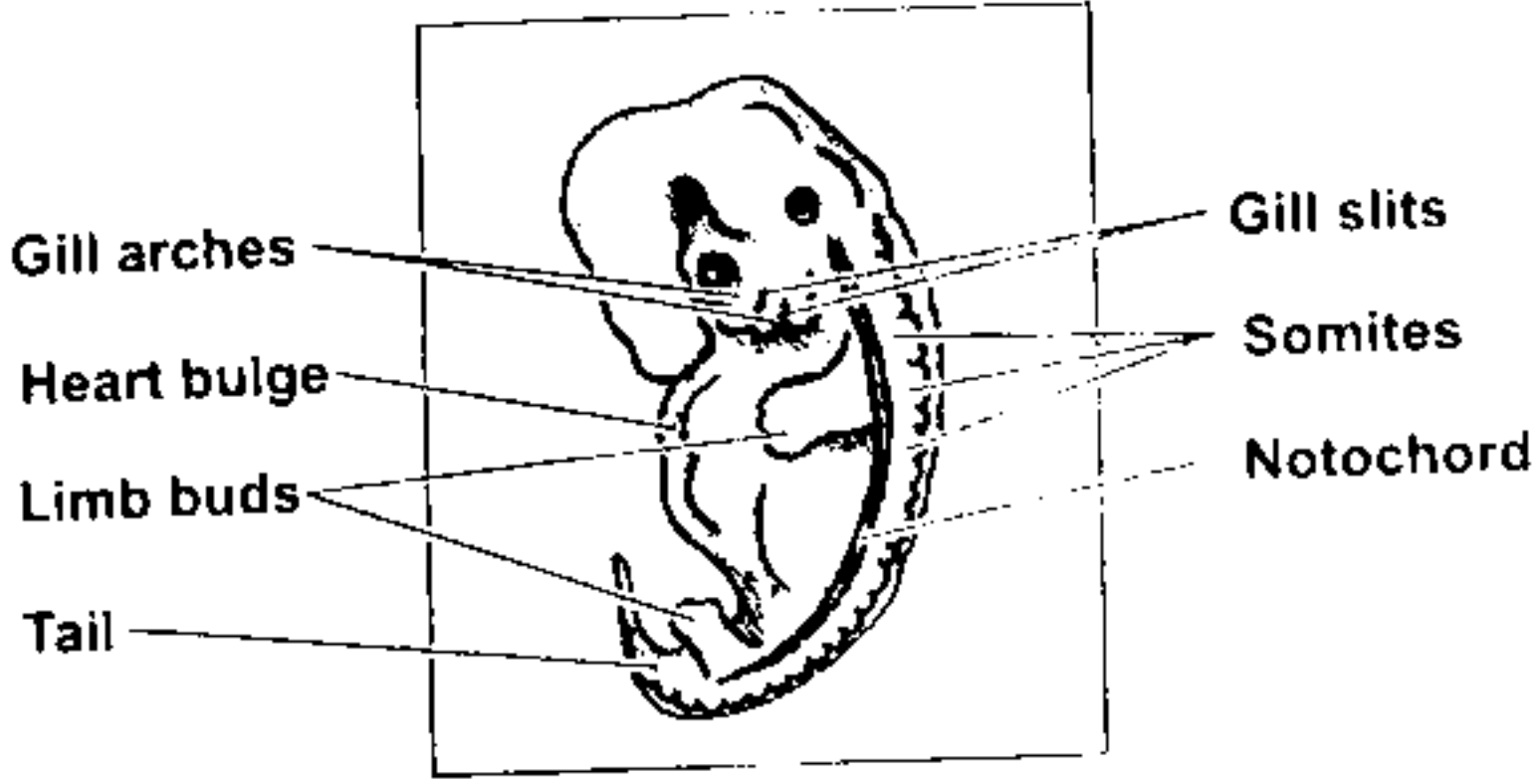
انسان کا جنین ابتدائی مراحل میں ظاہری طور پر دوسرے حیوانات کی طرح ہوتا ہے۔ لیکن بعد کے مراحل میں اس کی امتیازی شکل واضح ہوتی جاتی ہے۔ (خلقا اخر)

"مضغہ": گوشت کا چھوٹا سا ٹکڑا جو چبانے کے لئے منہ میں ڈالا جائے" (مفردات)۔ اس کا معنی چبائی ہوئی چیز یا چبائی ہوئی بوٹی بھی کیا گیا ہے (Chewed substance)۔

مضغہ، علقہ کے بعد کی حالت ہے، یہ وہ حالت ہے جب جنین اپنی ظاہری شکل و صورت کے اعتبار سے ابھی گوشت کے لوتھڑے کی شکل میں ہوتا ہے اور اس میں ابھی ہڈیاں سخت نہیں ہوتیں۔ جنینیات (Embryology) کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ایک ماہ کے لگ بھگ کا جنین اپنی ظاہری شکل و صورت میں چبائی ہوئی چھوٹی سی بوٹی کی طرح نظر آتا ہے۔ ریڑھ کی ہڈی نمودار ہونا شروع ہوتی ہے تو بالکل آغاز میں اُس کے مہرے دانتوں کے نشانوں کی طرح نظر آتے ہیں۔(ایک ماہ کے جنین کی لمبائی تقریباً 5 ملی میٹر ہوتی ہے)

3۔مضغہ میں ہڈیوں کا نظام تشکیل پاتا ہے جن پر عضلات (Muscles) بنتے ہیں۔ جنین کی نشوونما کا وہ زمانہ جسے اصطلاح میں جنینی دور(Embryonic priod) کہتے ہیں اور جو تیسرے ہفتے سے آٹھویں ہفتے تک پھیلا ہوتا ہے، وہ زمانہ ہے جب جنین میں مختلف اعضاء نمودار ہونا شروع ہوتے ہیں۔ نظام استخوان (Skeletal System:ہڈیوں کا نظام) کا آغاز ہوتا ہے اور وہ آہستہ آہستہ وجود میں آتا ہے اور اس پر گوشت (یعنی عضلات) نشو ونما پاتا ہے۔

مطلب یہ نہیں کہ پہلے ہڈیوں کا ڈھانچہ بن جاتا ہے، اور پھر بعد میں اس پر گوشت چڑھتا ہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے جب جنین میں ہڈیوں کے بننے کا آغاز ہوتا ہے تو ساتھ ہی ان پر عضلات کے بننے کا آغاز بھی ہوجاتا ہے۔ یعنی ہڈیاں برہنہ نہیں بنائیں جاتی بلکہ ان پرساتھ ہی ساتھ گوشت چڑھایا جاتا ہے جو اُن پر لباس کی طرح ہوتا ہے۔

عضلات کا لباس ہڈیوں یعنی استخوانی ڈھانچہ (Skeleton) کی حفاظت کرتا ہے۔ جس طرح کہ لباس انسانی جسم کی حفاظت کرتا ہے۔ اگر گوشت پوست کا یہ لباس نہ ہوتا تو دوسرے مسائل کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہوتا کہ جسم پر لگنے والی ہر چوٹ براہ راست ہڈیوں کو نقصان پہنچاتی اور انھیں توڑ کر رکھ دیتی۔

4۔جنین نشو و نما پاکر ایک ایسی حالت کو پہنچتا ہے جب اُس میں انسانی خواص نمایاں ہوجاتے ہیں اور مشاہدہ کرنے پر معلوم ہوجاتا ہے کہ یہ ایک انسانی

جنین ہے۔ شروع میں انسانی جنین ظاہری شکل و صورت میں دوسرے حیوانات خصوصاً دودھ پلانے والے جانوروں کے جنین کی طرح ہی ہوتا ہے۔ لیکن نشوونما کے آٹھویں ہفتے کے اختتام پر اُس میں انسانی خصوصیات نمایاں ہوجاتی ہے۔ اور اب جنین کا جو دور شروع ہوتا ہے اُسے اصطلاح میں Fetal Period (نوخیز بچے کا دور) کہا جاتا ہے۔

رحمِ مادر ایک محفوظ مقام ہے جہاں بچہ پوری حفاظت کے ساتھ نشوونما پاتا ہے۔ ماں کی ریڑھ کی ہڈی کا مضبوط ستون، پینڈے کی مانند کمر کی مضبوط ہڈیاں اور پیٹ کے تہہ بہ تہہ پردے رحم کو ایک محفوظ مقام بناتے ہیں۔ اس کے علاوہ خود رحم کی دیواریں اُسے ایک محفوظ مقام بناتی ہیں۔ بچہ جب نشوونما پاتا ہے تو اس کے گرد ایک غلاف بن جاتا ہے جس میں ایک سیال (Amniotic fluid) بھرا ہوتا ہے۔ یہ بچے کی جھٹکوں وغیرہ سے حفاظت کرتا ہے۔

رحمِ مادر میں بچے کی نشوونما پر ایک نظر:

جدید جنینیات (Embryology) شکمِ مادر میں بچے کی نشو و نما کے زمانہ کو تین ادوار میں تقسیم کرتی ہے۔

۱۔پیش جنینی دور (Pre-embryonic period)

۲۔جنینی دور (Embryonic period)

۳۔نوخیز بچے کا دور (Fetal Period)

شکم مادر میں اسپرم (زیادہ صحیح لفظوں میں اسپرمیٹوزون : Spermatozoon) اور بیضہ (ovum) کا ملاپ رحم کی نالی (uterine tube) میں بیضہ دان (Ovary) کے قریب ہوتا ہے۔ ملاپ کے اس عمل کو باروری (Fertilization) کہتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں جو چیز بنتی ہے اُسے بارورشدہ بیضہ یا زائی گوٹ (Zygote) کا نام دیا جاتا ہے۔ زائی گوٹ ایک نہایت باریک وجود ہے یہ اگلے 30 گھنٹوں میں تقسیم ہوکر دوخلیات (Cells) بناتا ہے جنھیں Blastomeres (بلاسٹومیرز) کہتے ہیں۔ تقسیم کا یہ سلسلہ جاری رہتا ہے حتیٰ کہ تقریباً تیسرے دن یہ 16 یا کچھ زیادہ خلیات کا ایک گچھا بن جاتا ہے جو اپنی شکل میں شہتوت کے پھل کی طرح ہوتا ہے اس لئے اسے Morula (شہتوتیہ) کہتے

ہیں۔ اس دوران میں مورولا رحم کی نالی میں چلتا ہوا رحم میں داخل ہو چکا ہوتا ہے۔ مورولا میں خلیات کی تقسیم کا عمل جاری رہتا ہے۔ اس دوران میں رحم کے اندر کا سیال (Fluid) مورولا میں داخل ہوتا ہے جس سے مورولا کا اندرونی حصہ بھر جاتا ہے۔ سیال بھری ہوئی یہ جگہ حجم میں بڑھتی جاتی ہے۔ اب مورولا ایک نئی شکل اختیار کرلیتا ہے جسے Blastocyst کہا جاتا ہے۔

بلاسٹوسسٹ (Blastocyst) پانچویں اور ساتویں دن کے درمیان خود کو رحم کی اندرونی دیوار کے ساتھ چسپاں کرنا شروع کرتا ہے اس عمل کو Implantation کہتے ہیں۔ یہ عمل دوسرے ہفتے کے اختتام تک مکمل ہوجاتا ہے۔ یہاں پیش جنینی دور اپنے اختتام کو پہنچتا ہے اور جنینی دور کا آغاز ہوتا ہے۔

جنینی دور تیسرے ہفتے کے آغاز سے آٹھویں ہفتے کے اختتام تک پھیلا ہوا ہے۔ اور آٹھویں ہفتے کے اختتام پر جنین کی لمبائی تقریباً 40 ملی میٹر تک ہوتی ہے۔ اس میں مختلف اعضاء نمودار ہوتے ہیں اور عصبی نظام جسمانی سرگرمیوں میں رابطے کے کام کا آغاز کرتا ہے۔ جنین انسانی امتیازات حاصل کرلیتا ہے اور انسان کے جنین کے طور پر پہچانا جاسکتا ہے۔

اس کے بعد جنین کی نشونما کا تیسرا دور شروع ہوتا ہے جو نوویں ہفتے سے شروع ہوکر پیدائش پر ختم ہوتا ہے۔ اگرچہ بعض اعضا کے مُشکّل ہونے کا عمل ابھی ہوتا ہے مگر اس دور میں جو کام زیادہ تر ہوتا ہے وہ بالیدگی یا Growth ہے۔ یعنی جنینی دور میں جو اعضا نمودار ہوئے ہیں، اس دور میں وہ ترقی کرتے ہیں۔

بارہویں ہفتے کے دوران (جبکہ جنین دو چالیسویں گزار چکا ہے) عصبی نظام (Nervous System) اتنا ترقی کرجاتا ہے کہ اگر بچے کے پاؤں پر خراش کی جائے تو وہ اس کو کھینچ لے گا۔

16ویں ہفتے کے دوران بچے کے دل کی دھڑکن ماں کے پیٹ پر اسٹیتھواسکوپ (Stethoscope) لگا کر سُنی جاسکتی ہے۔ اب بچہ کی لمبائی تقریباً 140 ملی میٹر ہوتی ہے اور اس کا وزن تقریباً 200 گرام۔

17ویں اور 20ویں ہفتے کے دوران ماں اپنے شکم میں بچہ کی مخصوص حرکت جسے Quickening کہتے ہیں محسوس کرسکتی ہے۔

38ویں ہفتے کے اختتام پر بچہ پیدائش کے لئے تیار ہوتا ہے اور شکم مادر میں اس کی مدت مکمل ہوجاتی ہے۔

پروفیسر کیتھ ایل مور کی رائے:

ڈاکٹر کیتھ ایل مور((Keith L.Moore PhD, F.I.A.C
یونیورسٹی آف ٹورانٹو(کنیڈا) میں ایناٹمی کے اعزازی پروفیسر اور نامور سائنس دان، جنینیات (Embryology) کے ماہر اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ آپ نے شاہ عبدالعزیز یونیورسٹی جدہ (سعودی عرب) کے اسلامی تعلیمات کے پروفیسر شیخ عبدالماجد زندانی کی مدد سے اپنی ایک کتاب میں انسانی جنین کی نشو و نما کے بارے میں قرآنِ پاک میں استعمال ہونے والے الفاظ کی تشریح کی ہے۔

یہاں (سورہ المؤمنون میں) استعمال کئے گئے لفظ نطفہ کے بارے میں وہ کہتے ہیں:

The drop or "nutfa" has been interpreted as the sperm or spermatozoon, but a more meaningful interpretation would be the zygote which divides to form a blastocyst which is implanted in the uterus ("a place of rest").

علقه کے بارے میں کہتے ہیں:

The word "alaca" refers to a leach or bloodsucker. This is an appropriate description of the human embryo from the days 7-24 when it clings to the endometrium of the uterus, in the same way that a leech clings to the skin. Just as the leech derives blood from the host, the human embryo drives blood from the decidua or pregnant endometruim. It is remarkable how much the embryo of 23-24 days resembles a leach.

مضغه کے بارے میں کہتے ہیں:

The Arabic word "Mudghah" means "chewed substance or chewed lump". Toward the end of the

fourth week, the human embryo looks somewhat like a chewed lump of flesh. The chewed appearance results form the somites which resemble teeth marks. The somites represent the beginnings or primordia of the vertebrae.

(The Developing Human, by Moore)

موریس بوکیلے (Maurice Bucaille) فرانسیسی سرجن اور ''بائبل، قرآن اور سائنس'' کے مشہور مصنف کے نزدیک ''علقه'' کی صحیح تشریح '' چسپاں ہونے والی چیز'' (The thing which clings) ہے۔ جبکہ مضغہ کا معنی وہ بھی Chewed flesh یا Chewed lump of flesh کرتے ہیں۔

"We fashioned the thing which clings into a chewed lump of flesh and We fashioned the chewed flesh into bones and We clothed the bones with intact flesh." (23:14)

وہ لکھتے ہیں:

The embryo is initially a small mass. At a certain stage in its development it looks to the naked eye like chewed flesh. The bone structure develops inside this mass in what is called the mesenchyma. The bones that are formed are covered in muscles; the word lahm applies to them.

(دی بائبل دی قرآن اینڈ سائنس)

وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَآئِقَ ۖ وَمَا كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ غٰفِلِيْنَ ۝ (23:17)

اور ہم نے تمہارے اوپر سات راستے بنائے ہیں اور ہم مخلوق سے غافل نہیں ہیں۔

"طرائق" "طریقہ" کی جمع ہے۔ اس کا معنی ہے راستے۔ ممکن ہے اس سے مراد اجرام سماوی (ستارے، سیارے وغیرہ) کے مدار اور حرکت کے راستے ہوں۔ اسی طرح ہوسکتا ہے کہ "سات" عددِ تکثیری ہو اور اس سے مراد بہت سے مدار اور راستے ہوں۔ اس اعتبار سے "سبع طرائق" (سات راستوں) کے لفظوں میں اجرام سماوی کے تنوع اور کثرت کی طرف اشارہ ہوسکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے کائنات کو حکمت کے ساتھ پیدا کیا ہے وہ ہر چیز کی مصلحتوں کو جانتا ہے اور اُن کی ضرورت کے مطابق اُن کی تکمیل کرتا ہے۔

وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ
مَآءًۢ بِقَدَرٍ فَاَسْكَنّٰهُ فِى الْاَرْضِ ۖ وَاِنَّا عَلٰى
ذَهَابٍۭ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ ۚ فَاَنْشَاْنَا لَكُمْ بِهٖ
جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ ۘ لَكُمْ فِيْهَا فَوَاكِهُ
كَثِيْرَةٌ وَّمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ۙ وَشَجَرَةً تَخْرُجُ مِنْ
طُوْرِ سَيْنَآءَ تَنْۢبُتُ بِالدُّهْنِ وَصِبْغٍ لِّلْاٰكِلِيْنَ ۝

وَاِنَّ لَكُمْ فِى الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ۭ نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا
فِىْ بُطُوْنِهَا وَلَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ كَثِيْرَةٌ وَّمِنْهَا
تَاْكُلُوْنَ ۙ وَعَلَيْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ ۧ
(23:18-22)

اور ہم نے آسمان سے ایک حساب کے مطابق پانی برسایا[1]، اور اسے زمین میں ٹھہرادیا۔ اور یقیناً ہم اُس کے لے جانے پر بھی قادر ہیں[2]۔ پھر اُسی سے ہم نے تمہارے لئے کھجوروں اور انگوروں کے باغات اُگائے ہیں، ان (باغوں) میں تمہارے لئے بہت سے پھل ہیں (جن سے تم لطف اندوز بھی ہوتے ہو) اور

ان سے تم اپنی غذا کا سامان بھی کرتے ہو[3]۔ اور وہ درخت بھی (اُگایا) جو طورِ سینا میں پیدا ہوتا ہے وہ تیل بھی لئے ہوئے اُگتا ہے اور کھانے والوں کے لئے سالن بھی[4]۔

اور تمہارے لئے جانوروں میں بھی غوروفکر کا مقام ہے[5]، ہم تمہیں اُن چیزوں سے جو اُن کے پیٹوں میں ہیں (خوش ذائقہ دودھ) پلاتے ہیں اور تمہارے لئے ان میں دوسرے بھی بہت سے فائدے ہیں، اور ان سے تم اپنی غذا بھی حاصل کرتے ہو، اور ان پر اور کشتیوں پر تم سواری بھی کرتے ہو[6]۔

1۔کسی خطہ میں بارش ایک نظام اور حساب اور اندازہ کے مطابق نازل ہوتی ہے۔ مِنَ السَّمَاءِ (آسمان سے) کا مطلب ہے اوپر سے، بلندی سے، بادل سے، وغیرہ۔

2۔ بادل سے بارش یا برف وغیرہ کی شکل میں تازہ پانی نازل ہوتا ہے۔ پانی زمین میں کئی طرح سے جمع ہوتا ہے:

ا۔ برف کی شکل میں بلند پہاڑوں کی چوٹیوں پر: سارا سال اس کا پانی دریاؤں اور چشموں وغیرہ کی شکل میں رواں رہتا ہے۔

۲۔زیرِ زمین پانی (Ground water) کی شکل میں جسے کنویں کھود کر نکالا اور کام میں لایا جاسکتا ہے۔

۳۔بارش کا پانی ندی نالوں کی شکل میں بہہ کر نشیبی علاقوں میں جمع ہوتا ہے۔

جس اللہ نے پانی کی فراہمی کا یہ عظیم نظام قائم کیا ہے وہ اس بات پر بھی پوری قدرت رکھتا ہے کہ اس پانی کو نابود کردے، لے جائے۔ یہ بہہ کر سمندروں میں آسکتا ہے، زمین کی گہرائی میں اتر کر انسان کی پہنچ سے نکل سکتا ہے،

بخارات بن کر اُڑ سکتا ہے، اور یہ کہ کسی ملاوٹ کی وجہ سے پینے کے لئے ناموزوں ہو سکتا ہے۔

زمین کی اوپر کی تہہ نفوذ پذیر(Permeable) ہوتی ہے جس سے پانی گزرسکتا ہے لیکن اس کے نیچے چٹانوں کی غیر نفوذ پذیر تہہ ہوتی ہے جس سے پانی نہیں گزرسکتا۔ اگر زمین کی اوپر کی تہہ بھی غیر نفوذ پذیر ہوتی تو پانی سطح کے اوپر ہی کھڑا رہتا ہے جس سے وہ تعفن زدہ ہوکر پینے کے قابل نہ رہتا اور زندگی ناممکن ہوجاتی اور اگر نیچے کی تہہ بھی نفوذ پذیر ہی ہوتی تو پانی اتنی زیادہ گہرائی میں چلا جاتا کہ انسان اُسے حاصل ہی نہ کرسکتا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ آج کسی کنویں سے جو پانی نکالا جاتا ہے ہوسکتا ہے کہ وہ ہزاروں برس قبل برسنے والی کسی بارش کا ہو جو خراب ہوئے بغیر آج تک زیر زمین پانی کی شکل میں محفوظ ہے۔

3۔ پانی سے طرح طرح کے نباتات اُگتے ہیں۔ کھجور، انگور اور بہت سے دوسرے پھل۔ ان میں انسان کی غذا کا سامان بھی ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ دوسرے فائدے بھی ہیں۔

4۔ طورِ سینا سے سے صحرائے سینا کا مشہور پہاڑ ''کوہ طور'' مراد ہے۔ عرب کے لوگ اس سے بخوبی واقف تھے۔ جس درخت کی طرف اشارہ ہے وہ زیتون کا درخت ہے۔ طور سینا کا علاقہ زیتون کے درختوں کے لئے مشہور تھا۔

یہ بھی ممکن ہے کہ طورِ سینا بطورِ صفت استعمال ہوا ہو اور اس سے مراد درختوں سے بھرے ہوئے خوبصورت پہاڑ ہوں۔ اس صورت میں ''طور'' بمعنی پہاڑ اور ''سینا'' بمعنی خوبصورت ، بابرکت، سرسبز و شاداب ہوگا (تفسیر نمونہ)۔

''صبغ'' کا معنی رنگ ہے یہاں اس سے مراد سالن ہے جس کے ساتھ روٹی کھائی جاتی ہے۔ زیتون کا تیل سالن کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس کے اور بھی بہت سے فائدے ہیں۔

یہاں بے شمار قسم کے پھلوں میں صرف تین کا نام لے کر ذکر کیا گیا ہے یعنی کھجور، انگور اور زیتون۔ ان میں طرح طرح کے فائدے ہیں۔ عرب کے لوگ ان سے بخوبی آگاہ تھے۔ آج بھی ان کی ایک نمایاں حیثیت ہے۔

5۔ جانوروں میں انسان کے لئے عبرت اور غور و فکر کا مقام ہے۔ اس کی تشریح کرتے ہوئے قرآن نے ایک مثال دی ہے کہ تم ان سے دودھ

حاصل کرتے ہو۔ ان میں تمہارے لئے اور بھی بہت سے فائدے ہیں اور یہ کہ تم ان میں سے بعض کا گوشت بھی کھاتے ہو۔

دودھ Mammary Glands میں بنتا ہے، اس کا بننا بذات خود خالق کی قدرت کا ایک کرشمہ ہے۔ یہ ایک مکمل غذا ہے۔ اس میں کاربوہائی ڈریٹس (Carbohydrates)، پروٹینز (Proteins) اور فیٹس (Fats) تینوں قسم کے بنیادی غذائی اجزا ہوتے ہیں۔

دودھ اور گوشت کے علاوہ جانوروں کے اور بھی بہت سے فائدے ہیں:

ا۔ان کے بالوں اور اونوں سے پہننے اور برتنے کی کئی چیزیں بنائی جاتی ہیں۔

۲۔ان کی کھالوں سے بھی اسی طرح کی چیزیں بنائی جاتی ہیں۔

۳۔حتیٰ کے ان کا گوبر بھی کھاد کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔

۴۔یہ سواری اور بار برداری کے کام آتے ہیں۔

۵۔ان کی ہڈیوں اور بعض اعضا سے دوائیں بھی تیار کی جاتی ہیں۔

6۔ انسان زمین میں حرکت کرتا ہے۔ خشکی پر وہ جانوروں کو سواری اور بار برداری کے لئے استعمال کرسکتا ہے، جدید دور میں دوسرے بہت سے ذرائع پیدا ہوگئے ہیں۔ جب کہ سمندروں اور دریاؤں میں نقل وحمل کا کام کشتیوں اور جہازوں سے لیا جاتا ہے۔

وَهُوَ الَّذِيٓ اَنْشَاَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝ وَهُوَ الَّذِيْ ذَرَاَكُمْ فِي الْاَرْضِ وَاِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝ وَهُوَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ وَلَهُ اخْتِلَافُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ (23:78-80)

اور وہ (اللہ) وہی ہے جس نے تمہارے لئے کان، آنکھیں اور دل بنائے ہیں مگر تم بہت کم شکر ادا کرتے ہو[1]۔ اور وہی ہے جس نے تمہیں زمین میں پھیلایا ہے پھر تم اُسی کے پاس اکھٹے کئے جاؤ گے[2]۔

اور وہی ہے جو زندگی دیتا ہے اور موت سے ہم کنار
کرتا ہے، اور اُسی کے اختیار میں ہے رات اور دن کا
آنا جانا(3)۔ تو کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے(5)۔

1۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو حواس اور عقل کی نعمتیں عطا کی ہیں۔ انسان کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان صلاحیتوں کا صحیح استعمال کرے اور ان سے کام لے کر ......

ا۔اپنے رب کی معرفت اور پہچان حاصل کرے اور
۲۔اپنے اندر اپنے رب کے لئے شکر گزاری کا جذبہ پروان چڑھائے۔
یہاں حواسِ خمسہ میں سے دو کا ذکر ہوا ہے یعنی کان اور آنکھیں، اگر غور کیا جائے تو انسان کی فکری راہنمائی کے اعتبار سے یہ حواس بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔
افئِدہ (فواد کی جمع) یہاں سوچنے سمجھنے کی قوت یعنی عقل و ذہن کے معنوں میں ہے۔

2۔ آج انسان زمین کے کونے کونے میں موجود ہے۔ جس اللہ نے ان کو زمین میں پھیلایا ہے وہ ان کو جمع بھی کرے گا۔ آخر کار یہ سب اُس کی بارگاہ میں اکٹھے کئے جائیں گے۔

3۔ رات اور دن کا وجود اور ان کا ایک دوسرے کے پیچھے تسلسل کے ساتھ آتے رہنا اللہ تعالیٰ کی قدرت کی عظیم نشانی اور اس کی عظیم نعمت ہے۔ (دیکھیں سورہ البقرہ 2:164 نوٹ 4۔)

4۔ ملاحظہ کریں کہ قرآن مجید کتنی کثرت سے عقل و فکر اور سوچنے سمجھنے کی اہمیت کو اُجاگر کررہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک انسان تمام تر تعصّبات سے آزاد ہو کر خالص عقل سے کام نہیں لیتا وہ سچائی کو دریافت نہیں کرسکتا۔
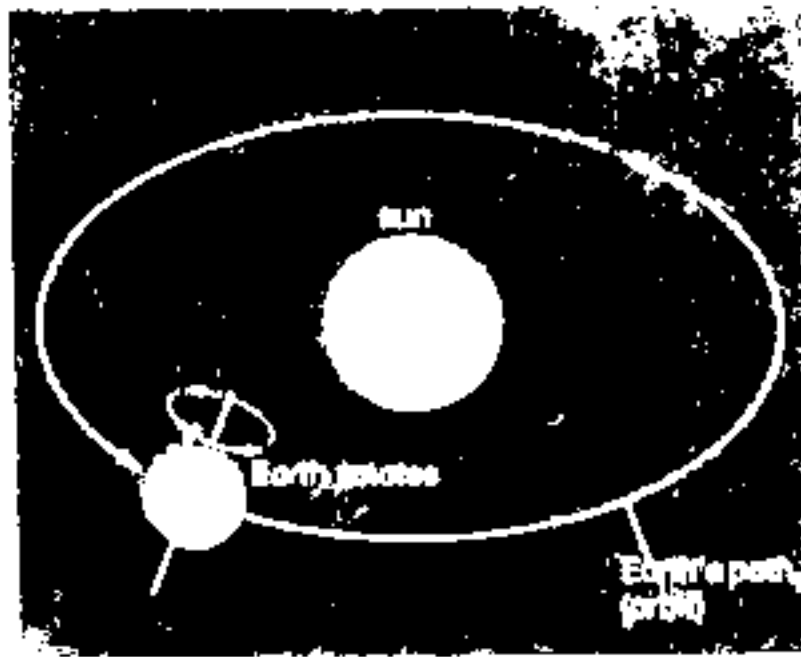
اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ ؕ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ○
(24:41)

کیا تم نے غور نہیں کیا کہ بلاشبہ اللہ ہی کی تسبیح کرتے ہیں جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور پرندے بھی پروں کو پھیلائے ہوئے۔ ہر ایک کو اپنی نماز اور تسبیح معلوم ہے۔ اور اللہ باخبر ہے اس سے جو وہ کرتے ہیں۔

آسمانوں اور زمین کی تمام مخلوقات اللہ کی تسبیح کرتی ہیں۔ پرندے بھی اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتے ہیں جب وہ ہوا میں پروں کو پھیلائے اُڑتے ہیں۔ ہر مخلوق اپنی نماز اور تسبیح کو جانتی ہے وہ جانتی ہے کہ اُسے اللہ کی بندگی کس طرح کرنی ہے۔

''صلاۃ'' کا لفظ ممکن ہے کہ یہاں دُعا کے معنی میں استعمال ہوا ہو یعنی ہر موجود اپنے وجود و عمل کے لئے زبانِ قال یا زبانِ حال سے اللہ تعالیٰ سے اُس کا فیض طلب کررہا ہے۔ اور اعلان کررہا ہے کہ اُس کا خالق ہر نقص اور عیب سے پاک ہے۔

مخلوقات کی عبادت دو طرح سے ہوتی ہے:

۱۔ تکوینی

۲۔ اختیاری

باشعور مخلوق کی عبادت اپنے شعور کے دائرے میں اختیاری طور پر ہوتی ہے جب کہ بے شعور مخلوق اپنے فعل و عمل اور کیفیت و حالت سے عبادت بجالارہی

ہوتی ہے۔(مزید دیکھیں 17:44)

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یُزْجِیْ سَحَابًا ثُمَّ یُؤَلِّفُ بَیْنَہٗ ثُمَّ یَجْعَلُہٗ رُکَامًا فَتَرَی الْوَدْقَ یَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِہٖ ۚ وَیُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ جِبَالٍ فِیْھَا مِنْ بَرَدٍ فَیُصِیْبُ بِہٖ مَنْ یَّشَآءُ وَیَصْرِفُہٗ عَنْ مَّنْ یَّشَآءُ ؕ یَکَادُ سَنَا بَرْقِہٖ یَذْھَبُ بِالْاَبْصَارِ ؕ (24:43)

کیا تم نے غور نہیں کیا کہ بلاشبہ اللہ ہی ہے جو بادلوں کو آہستہ آہستہ چلاتا ہے، پھر ان کو آپس میں ملا دیتا ہے، پھر ان کو تہہ بہ تہہ کر دیتا ہے، پھر تم دیکھتے ہو کہ ان کے بیچ سے مینہ نکلتا ہے[1]۔ اور (وہی ہے جو) آسمان سے اس کے اندر کے پہاڑوں (کی طرح کے بادلوں) سے اولے برساتا ہے، پھر انھیں جن پر چاہتا ہے نازل کرتا ہے اور جن سے چاہتا ہے ان کو دور لے جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بجلی کی کوند نگاہوں کو اچک لے جائے گی[2]۔

1۔ "یُزجی" ، "ازجاء" کے مادے سے ہے اس کا معنی ہے آہستہ آہستہ اور نرمی کے ساتھ بکھری ہوئی چیزوں کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر حرکت دینا۔ بادل کے مختلف ٹکڑے (جو کہ ابتدائی طور پر آبی بخارات سے بنتے ہیں) سمندر کے مختلف حصوں سے اُٹھتے ہیں جن کو ہوائیں حرکت دیتی ہیں۔
اس آیت کریمہ میں کئی چیزوں کی طرف انسان کی توجہ مبذول کرائی گئی ہے : بادلوں کی حرکت ، بادل میں موجود اُس کے مختلف ٹکڑوں اور ذرّوں کا آپس

میں جڑنا، ان کا تہہ بہ تہہ ہونا، پھر ان کے اندر سے بارش کا برسنا۔ فضا میں بادلوں کا پہاڑوں کی طرح بلند و بالا ہونا، ان عمودی طور پر پھیلے ہوئے بادلوں سے برف اور اولوں کا برسنا۔ ایسے بادلوں میں بجلی کا کوندنا۔

یہ حقائق قرآن مجید نے جدید سائنسی دریافتوں سے چودہ سو سال پہلے بیان کئے ہیں جب نہ موسمی سیارے تھے، نہ بادلوں کا مشاہدہ کرنے کے دوسرے جدید آلات، نہ دوربینیں تھی اور نہ ہوائی جہاز۔ آج سائنسی سطح پر بادلوں کے بننے، آپس میں باہمی عمل کرنے اور ان سے بارش کے برسنے کے لئے تبخیر(evaporation) تکثیف (Condensation) اور ترسیب (Precipitation) وغیرہ کی جو اصطلاحیں استعمال کی جاتیں ہیں قرآن مجید نے اس آیت کے اندر انتہائی جامعیت کے ساتھ انھیں بیان کردیا ہے۔

2۔ پہاڑوں جیسے بادلوں اور ان سے برف اور اولوں کے برسنے اور بجلی کے کوندنے کے الفاظ کی معنویّت کو پوری طرح سمجھنے کے لئے مثال کے طور پر Cumulonimbus بادلوں اور Thunderstorms کا مطالعہ کریں۔

يُقَلِّبُ اللّٰهُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ؕ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِى الْاَبْصَارِ ۞ (24:44)

اللہ ہی ہے جو رات اور دن کو گردش دیتا ہے بے شک اس (حقیقت) میں اہل نظر کے لئے بڑا سامانِ عبرت ہے۔

یُقَلِّبُ: الٹ پھیر اور بدلنے کے معنی میں ہے۔ اللہ تعالٰی کی مشیّت رات اور دن کو بدلتی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ رات اور دن کی گردش اور الٹ پھیر میں اُن لوگوں کے لئے درسِ عبرت ہے جو آنکھیں رکھتے ہیں۔ آپ دیکھیں کہ قرآن مجید کس طرح دوہرا دوہرا کر انسان کو دعوت دے رہا ہے کہ وہ کائناتی مظاہر پر غور و فکر کرے اور اس طرح وہ دنیاوی فائدے بھی حاصل کرے اور اپنے خالق کی معرفت کی منازل بھی طے کرے جو اس کی زندگی کا حقیقی مقصد ہے۔

(مزید دیکھیں البقرہ 2:164 نوٹ 4)

وَاللّٰہُ خَلَقَ
كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى
بَطْنِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى رِجْلَيْنِ ۚ وَ
مِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰٓى اَرْبَعٍ ۭ يَخْلُقُ اللّٰهُ
مَا يَشَآءُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝
(24:45)

اور اللہ نے ہر جاندار پانی سے پیدا فرمایا ہے[1]۔ ان میں سے بعض تو اپنے پیٹ کے بل رینگتے ہیں، بعض دو ٹانگوں سے چلتے ہیں، اور بعض چار (ٹانگوں) سے چلتے ہیں[2]۔ اللہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے[3]۔

1۔ دابّہ: وہ مخلوق جس میں حرکت کی صلاحیت ہو۔ یہاں جاندار یا حیوان (Animal) کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ آیت کہتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر جاندار کو پانی سے خلق کیا ہے۔ اس کا ایک معنی تو یہ ہے کہ پانی جانداروں کے جسم کا جزو اعظم (Major component) ہے۔ مثلاً انسان کے جسم میں تقریباً ستر فیصد پانی ہوتا ہے۔ جانداروں کی زندگی کا دارومدار پانی پر ہے۔

دوسرا معنی یہ ہے کہ زندگی کی ابتدا پانی سے ہوئی ہے۔ زندگی کے آغاز کا جدید سائنسی نظریہ یہی ہے۔ جس کے مطابق آج سے تقریباً ساڑھے تین ارب سال قبل سمندروں کے کنارے پانی کے اندر کیچڑ میں پہلے جاندار وجود میں آئے۔ اس تصور کو (Aquatic Origin of life) یعنی پانی میں زندگی کے آغاز کا تصور کہا جاتا ہے۔

یہاں تین قسم کے حیوانات کا صراحت سے ذکر کیا گیا ہے:

ا۔ پیٹ کے بل رینگنے والے (ہوامیئ: Reptiles)۔ مثلاً سانپ،

مگرمچھ وغیرہ۔

۲۔دو ٹانگوں کے ساتھ چلنے والے: مثلاً انسان اور پرندے وغیرہ۔

۳۔ چار ٹانگوں کے ساتھ چلنے والے: مثلاً چوپائے۔

3۔یعنی اللہ تعالیٰ کے تخلیقی امکانات لامحدود ہیں، اس کا تخلیقی عمل کسی خاص مرحلے پر آکر رک نہیں گیا۔ بلکہ یہ ایک مسلسل عمل (continuous process) ہے۔

یہ جملہ اوپر مذکور حیوانات کی تین اقسام کے علاوہ دوسرے جانداروں کو بھی اپنے احاطے میں لے آتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ زندگی کے بے شمار مظاہر ہیں ان میں وہ حیوانات بھی ہیں جو پانی میں رہتے ہیں اور وہ بھی جو خشکی پر رہتے ہیں۔ صرف حشرات (insects) کی ہزاروں اقسام ہیں۔

''دابہ'' کے اگر وسیع تر معنی لئے جائیں تو اس میں پودے بھی شامل ہوں گے۔ کیونکہ یہ بھی جاندار ہیں اور ان میں نشوونما (Development) اور بالیدگی (Growth) پائی جاتی ہے اور یہ بھی ایک قسم کی حرکت ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ ۚ وَلَوْ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا ۚ ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَيْهِ دَلِيْلًا ۙ ثُمَّ قَبَضْنٰهُ اِلَيْنَا قَبْضًا يَّسِيْرًا ۝
(25:45-46)

کیا تم نے اپنے رب کی اس قدرت کی طرف نگاہ نہیں کی کہ کس طرح وہ سایہ کو پھیلاتا ہے اور اگر وہ چاہتا تو اس کو ٹھہرا ہوا بنا دیتا! پھر (یہ کہ) ہم نے سورج کو اس پر ایک دلیلِ راہ بنایا ہے، پھر ہم اسے آہستہ آہستہ اپنی طرف سمیٹ لیتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے سایے اور روشنی کا نظام قائم کیا ہے۔ زمین پر زندگی کے وجود، بقا اور نشو و نما کے لئے دونوں کی موجودگی ضروری ہے۔ اگر صرف روشنی ہوتی، سایہ نہ ہوتا تو زمین کی ہر چیز جل کر بھسم ہو جاتی، اور اگر صرف سایہ ہوتا روشنی نہ ہوتی تو ہر چیز منجمد ہو کر رہ جاتی۔ روشنی اور سایہ دونوں کی موجودگی دیکھنے کے عمل کے لئے بھی ضروری ہے۔ اگر روشنی کسی جسم میں سے ساری کی ساری گزر جائے یعنی وہ چیز کامل طور ایسی شفاف ہو کہ اس کا سایہ نہ بنتا ہو تو وہ ہمیں نظر نہیں آئے گی۔

سائے کی حرکت وقت کی پیمائش اور اندازے کا ایک قدرتی پیمانہ ہے۔ سائے کی سمت اور اس کی لمبائی سے وقت کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ قدیم زمانے میں جبکہ گھڑیاں موجود نہ تھیں اس چیز کی اہمیت بہت زیادہ تھی۔

جب سورج طلوع ہوتا ہے تو ہر چیز کا سایہ طویل ترین ہوتا ہے۔ سورج جیسے جیسے بلند ہوتا ہے، تو سایہ چھوٹا ہوتا جاتا ہے۔ دوپہر کو سایہ شے کے قدموں میں ہوتا ہے۔ پھر جیسے جیسے سورج ڈوبنے کی طرف جاتا ہے سایہ مخالف سمت میں

آہستہ آہستہ بڑھتا جاتا ہے حتیٰ کہ غروبِ آفتاب کے ساتھ ہر طرف رات کا اندھیرا چھا جاتا ہے۔

رات اصل میں زمین کے نصف کرہ کا سایہ ہے جو زمین کے سورج کے سامنے ہونے کی وجہ سے بنتا ہے۔ یہ سایہ عمودی مخروطی شکل کا ہوتا ہے۔ جو زمین کے نصف کرہ اور اس کے اوپر کی فضا کو ڈھانپے رہتا ہے اور ہمیشہ رواں دواں رہتا ہے۔ سورج نہ ہوتا تو یہ سایہ بھی نہ ہوتا۔ سورج طلوع ہونے سے پہلے ہر چیز اس سے لپٹی ہوتی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو سورج طلوع نہ ہو (یعنی زمین حرکت کرنا بند کردے) تو یہ سایہ مستقل طور پر زمین پر قائم رہے۔ اللہ تعالیٰ سورج کو طلوع کرتا ہے جس سے رات کا سایہ ختم ہوجاتا ہے۔

یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ اندھیرا آہستہ آہستہ روشنی میں تبدیل ہوتا ہے اور روشنی آہستہ آہستہ اپنی انتہائی شدت کو پہنچتی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک عظیم نعمت ہے کہ یہ تبدیلی تدریجی طور پر وقوع پذیر ہوتی ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو دنیا کا نظام درہم برہم ہوکر رہ جاتا۔

وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ اللَّيْلَ لِبَاسًا وَالنَّوْمَ سُبَاتًا وَجَعَلَ النَّهَارَ نُشُورًا ۝ (25:47)

اور وہی ہے جس نے رات کو تمہارے لئے پردہ پوش[1] اور نیند کو راحت بنایا ہے اور دن کو ازسرنو اٹھنے کا وقت بنایا ہے[2]۔

1۔ رات لباس کی طرح انسانوں اور دوسری چیزوں کو اپنے اندر چھپالیتی ہے۔ رات کا اندھیر نیند کی آمادگی کے ساتھ گہرا تعلق رکھتا ہے۔ جب انسان سونا چاہتا ہے تو آنکھیں بند کرلیتا ہے، بتیاں بجھا دیتا ہے یا پھر آنکھوں پر کوئی پردہ ڈال لیتا ہے۔

2۔ "سباتا"، "سبت" کے مادے سے ہے جس کا معنی ہے کاٹ دینا اور منقطع کرنا۔ یہ آرام کی غرض سے کام کاج کو روک دینے کے معنی میں استعمال

ہوتا ہے۔ جب نیند آتی ہے تو جسم کی غیر ارادی حرکات کو چھوڑ کر باقی تمام سرگرمیاں معطل ہوجاتی ہیں۔

نیند انسان کی کھوئی ہوئی توانائی کو بحال کرکے اُسے تروتازہ کرتی ہے۔ اس سے اعضائے بدن اور بالخصوص اعصاب کو سکون ملتا ہے۔ دن حرکت اور جد وجہد اور طلبِ معاش کے لئے دوڑ دھوپ کا وقت ہے۔ روشنی کا حرکت اور زندگی سے گہرا تعلق ہے۔

وَهُوَ الَّذِىٓ
اَرْسَلَ الرِّيٰحَ بُشْرًاۢ بَيْنَ يَدَىْ رَحْمَتِهٖ ۚ
وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا ۙ لِّنُحْیِۦَ بِهٖ
بَلْدَةً مَّيْتًا وَّنُسْقِيَهٗ مِمَّا خَلَقْنَآ اَنْعَامًا وَّ
اَنَاسِىَّ كَثِيْرًا ۝ (25:48-49)

اور وہی ہے[1] جو ہواؤں کو اپنی رحمت کے آگے خوشخبری بنا کر بھیجتا ہے۔ اور ہم آسمان سے پاک پانی[2] اُتارتے ہیں کہ اس سے مردہ زمین کو، ازسرِنو زندہ کردیں، اور اُسے اپنی مخلوقات میں سے کثیر التعداد چوپایوں اور انسانوں کو پلائیں[3]۔

1۔ اس آیت میں اللہ کے وجود اور قدرت کی نشانیوں کے طور پر کئی چیزوں کا ذکر ہوا ہے۔

ا۔ہواؤں کا چلنا جو بادلوں کو اٹھا کر ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف لے جاتی ہیں۔ ہوائیں ایک مربوط نظام کے تحت چلتی ہیں۔ ان کے بہت سے فائدے ہیں۔

۲۔بادلوں سے بارش کا برسنا۔

۳۔پانی سے نباتات کا اُگنا اور یوں مردہ زمین کا زندہ ہوجانا۔

۴۔ پانی کا انسانوں اور حیوانوں کے پینے کے کام آنا۔

2۔ یہاں پانی کی صفت کے طور پر "طھور" کا لفظ استعمال ہوا ہے یہ "طہارت" کا مبالغے کا صیغہ ہے۔ اس کا مفہوم "پاک ہونا" بھی ہے اور "پاک کرنا" بھی۔ یہ بارش کے پانی میں یہ خاصیت ہے کہ یہ خود بھی پاک و صاف ہوتا ہے اور دوسری چیزوں کو بھی پاک و صاف کرتا ہے۔

پانی کو آفاقی محلل (Universal Solvent) کہا جاتا ہے اس میں چیزوں کو اپنے اندر حل کرنے کی زبردست صلاحیت پائی جاتی ہے۔ اس صلاحیت کی بنیاد پر یہ دھونے اور صاف کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ لہذا پانی انسان کو صاف ستھرا اور صحت مند رکھنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

3۔ یہ پانی نباتات، حیوانات اور انسان کے کام آتا ہے۔ بے آب و گیاہ زمین پانی کی بدولت ہی سرسبز و شاداب ہوتی ہے۔ انسان اور حیوان اُسے پیتے ہیں۔ اس آیت میں پہلے نباتات کا ذکر ہے، پھر حیوانات کا اور پھر انسان کا۔ غذائی زنجیر (Food Chain) کی ترتیب بھی یہی ہے۔

وَهُوَ الَّذِي مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هَٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَهَٰذَا مِلْحٌ أُجَاجٌ وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَحِجْرًا مَّحْجُورًا ٥(25:53)

اور (اللہ) وہی ہے جس نے دو بحر[1] ساتھ ساتھ جاری کئے ایک کا پانی شیریں اور خوشگوار ہے اور دوسرے کا نہایت نمکین اور تلخ۔ اور ان کے درمیان اُس نے آڑ اور مضبوط رکاوٹ بنائی ہے۔

1۔ بحر کا معنی بعض لوگوں نے دریا اور بعض نے سمندر کیا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ سمندر سارے نمکین اور دریا میٹھے ہوتے ہیں۔ لہٰذا سوچنا پڑے گا کہ یہاں بحر کا معنی کیا ہے۔

بات یہ ہے کہ عربی زبان میں بحر پانی کے وسیع اور عظیم ذخیرے کے

معنی میں استعمال ہوتا ہے یعنی Great body of water۔ لہٰذا اس کا اطلاق دریا اور سمندر دونوں پر ہوتا ہے۔

یہ قدرتِ خداوندی کا حیرت انگیز کرشمہ ہے کہ زمین پر دو قسم کا پانی پایا جاتا ہے میٹھا پانی جسے انگریزی میں Fresh water کہتے ہیں اور نمکین یا کھاری پانی (Salt water)۔

دونوں پانی زمین پر مستقل طور پر اپنی اپنی جگہ قائم ہیں اور آبی چکر (Water cycle) کے ذریعے آپس میں جڑے ہوئے ہیں۔ میٹھا پانی دریاؤں کے ذریعے سمندروں میں جاکر گرتا رہتا ہے اور سمندروں کا پانی تبخیری عمل (Evaporation) کے ذریعے اپنے نمک کو پیچھے چھوڑ کر بخارات کی شکل میں تبدیل ہوتا رہتا ہے جو بادل بنتے ہیں اور بارش یا برف وغیرہ کی شکل میں زمین پر برستے ہیں۔ یوں زمین پر میٹھے اور کھاری پانی کا ایک چکر قائم رہتا ہے۔

یہ دو اقسام کے پانی زمین پر ساتھ ساتھ جاری ہیں۔ یہ آپس میں ملے ہوئے ہیں مگر ان کے درمیان قانونِ فطرت کی ایک مضبوط آڑ اور رکاوٹ ہے جو انھیں مکمل طور پر باہم ہم آمیز (Mix) ہونے سے روکتی ہے۔ یعنی ایسا نہیں ہوتا کہ زمین کا سارا میٹھا اور نمکین پانی مل جائیں (یعنی Mix ہوجائیں)۔ اور دُنیا سے میٹھے پانی کا وجود ختم ہوجائے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں اور دوسرے جانداروں کو میٹھا پانی فراہم کرنے کا یہ ایک قدرتی نظام قائم کیا ہے۔

''مرج'': کھلا چھوڑ دینا، یہاں دو قسم کے پانیوں کا آزادی کے ساتھ ہم وقت طور پر (Simultaneously) زمین میں ساتھ ساتھ جاری رہنا مراد ہے۔

''برزخ'': دو چیزوں کے درمیان حائل آڑ اور پردہ (چاہے مادی ہو یا معنوی)۔ یہاں اس سے مراد قانونِ فطرت کی آڑ ہے۔

''حجر'': اس علاقے کو کہتے ہیں جس کے اردگرد پتھر چن دیئے جائیں اور اس طرح اس کی حد بندی کردی جائے کہ اس کی حدود میں کوئی داخل نہ ہوسکے۔ ''حجراً محجوراً'' عربوں کی خاص اصطلاح ہے جب کوئی شخص اپنے دشمن سے امان حاصل کرنا چاہتا تو یہ جملہ استعمال کرتا۔ مطلب یہ ہوتا کہ اُسے ایسی امان دے دی جائے جس میں کوئی تبدیلی نہ ہو۔

وَهُوَ الَّذِىْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّ صِهْرًا ؕ وَكَانَ رَبُّكَ قَدِيْرًا ۝ (25:54)

اور (اللہ) وہی ہے جس نے انسان کو پانی سے
پیدا کیا ہے[1]، اور اُسے نسبی اور سسرالی رشتوں سے
جوڑ دیا[2]۔

اور تیرا رب بڑی قدرت رکھنے والا ہے۔

1۔انسان سے کیا مراد ہے۔ اگر اس سے ہر فردِ بشر انفرادی طور پر مراد ہوتو انسان کی پانی سے تخلیق کے دو مفہوم ہوسکتے ہیں۔

ا۔ہر انسان کے جسم کا جزوِ اعظم پانی ہے۔ اس کی زندگی کا دار و مدار پانی پر ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ انسان کے جسم میں تقریباً ستر فیصد پانی ہوتا ہے۔

۲۔یا پھر یہ کہ اس سے مرد اور عورت کا تولیدی پانی مراد ہے۔ ہم جانتے ہیں ہر فردِ بشر کی تخلیق مرد اور عورت کے تولیدی پانیوں یعنی Spermاور ovumکے ملاپ سے ہوتی ہے۔

اگر انسان سے مراد انسان بطورِ نوع (Species) ہے یا دوسرے لفظوں میں اس سے مراد نوعِ انسانی کی اوّلیں تخلیق ہے تو اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ انسان کی تخلیق پانی سے ہوئی ہے۔ پانی کے واسطہ (Medium)میں مادی عناصر سے ایک طویل اور پیچیدہ عمل کے ذریعے انسان کی اوّلیں تخلیق ہوئی۔

راقم کی رائے میں دوسرا مفہوم زیادہ صحیح ہے۔ یا پھر ہوسکتا ہے کہ آیت کے مفہوم میں یہ سارے معنی شامل ہوں۔

2۔ انسان ''مدنیُ الطبع'' ہے وہ دوسرے انسانوں کے ساتھ مختلف رشتوں کے ذریعے بندھا ہوتا ہے۔

''نسب'': وہ رشتہ ہے جو ماں باپ سے اولاد کو یا بہن بھائیوں کو آپس میں جوڑتا ہے۔

"صہر": وہ رشتہ جو داماد اور سسرال کے درمیان ہوتا ہے اور دو خاندانوں اور قبیلوں کو آپس میں جوڑتا ہے۔

اَلَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ وَمَا بَیۡنَہُمَا فِیۡ سِتَّۃِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسۡتَوٰی عَلَی الۡعَرۡشِ ۚۛ اَلرَّحۡمٰنُ فَسۡـَٔلۡ بِہٖ خَبِیۡرًا ﴿۵۹﴾ (25:59)

(اللہ وہی ہے) جس نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے چھ ادوار میں پیدا کیا اور وہ تختِ اقتدار پر تمکن کئے ہوئے ہے[1]۔ وہ رحمٰن ہے پس اُس کی شان اُس سے پوچھو جو باخبر ہے[2]۔

1۔ اللہ تعالیٰ نے کائنات کو چھ ادوار (Stages, periods) میں تخلیق کیا اور وہی ہے جو اس کے تختِ اقتدار پرجلوہ فرما ہے۔تفصیل کے لئے دیکھیں الاعراف 7:54)۔

2۔ کائنات کی تخلیق اُس کی رحمت کی جلوہ گری ہے۔ اس کی رحمت کائنات کی ایک ایک چیز کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔

"اُس کے بارے میں اُس سے پوچھو جو باخبر ہے" کا ایک مفہوم ہے کہ اگر تمہیں پروردِگار کی قدرت کے بارے میں سوال کرنا ہے تو خود اُسی سے کرو کیونکہ وہ ہر چیز سے باخبر ہے۔ وہی بتاسکتا ہے۔

دوسرا مفہوم یہ ہوسکتا ہے کہ اگر مانگنا چاہتے ہوتو اُسی سے مانگو وہ اپنے بندوں کی ضرورتوں کو خوب جانتا ہے۔ اُسی سے طلب کرو کیونکہ وہی ہر چیز سے آگاہ ہے۔

تَبٰرَكَ الَّذِیْ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِیْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِیْرًا ۝ وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ یَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا ۝ (25:61-62)

بڑی ہی بابرکت ہے وہ ذات جس نے آسمان میں بروج[1] بنائے اور اس میں ایک چراغ اور ایک منور چاند بنایا[2]۔ اور وہی ہے جس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کے پیچھے آنے والا بنایا[3]۔ یہ نشانیاں ہیں ان کے لئے جو یاد دہانی حاصل کریں یا شکر گزار بننا چاہیں[4]۔

1۔ ''بروج'' یہ ''برج'' کی جمع ہے۔ وہ چیز جو ظاہر اور نمایاں ہو۔ یہاں بروج سے مراد ستارے ہیں۔ مزید دیکھیں سورہ الحجر 15:16۔

2۔ ''سراج'' روشن چراغ، مراد ہے سورج جو کہ سائنسی اصطلاحوں میں زمین کا قریب ترین ستارہ ہے۔ اس کے اندر نیوکلیائی تعاملات (Nuclear Reactions) ہورہے ہیں جن سے اتنی زیادہ حرارت اور روشنی پیدا ہورہی ہے۔

غور طلب بات یہ ہے کہ یہاں سورج کے لئے ''سراج'' (روشن چراغ) کا لفظ استعمال کیا ہے، سورج کی روشنی خود اس کے اپنے اندر سے نکلتی ہے۔ چاند کے لئے ''منیر'' (نور بکھیرنے والا) کی صفت استعمال کی گئی ہے۔ چاند اپنی چاندنی سے راتوں کو منور کرتا ہے، اس کی یہ روشنی اس کی ذاتی نہیں بلکہ سورج ہی کی روشنی ہے جسے یہ اپنی سطح سے منعکس (Reflect) کرتا ہے۔

3۔ رات اور دن کا تسلسل کے ساتھ ایک دوسرے کے پیچھے لگے چلے آنا اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمتوں میں سے ایک ہے۔ زمین کی محوری گردش کے دوران اس کا جو حصہ سورج کے سامنے آتا ہے وہاں دن ہوتا ہے اور جو حصہ دوسری طرف

ہوتا ہے وہاں رات ہوتی ہے۔ اگر زمین پر صرف رات ہوتی تو زمین یخ ٹھنڈی ہوتی، اس کا سارا پانی جمی ہوئی حالت میں ہوتا اور اس کا درجۂ حرارت اتنا پست ہوتا کہ اس پر کسی جاندار کے پیدا ہونے کا امکان ہی نہ ہوتا۔ اگر صرف دن ہوتا تو زمین کا درجہ حرارت بہت زیادہ ہوتا اور نتیجتاً اس پر کوئی جاندار زندہ نہ رہ سکتا۔

4۔ان تمام نعمتوں کا مقصد یہ ہے کہ انسان اپنے اندر اللہ تعالیٰ کی یاد، اس کی معرفت اور پہچان پیدا کرے، اور ثانیاً اپنے اندر شکر گزاری کا احساس پروان چڑھائے۔

اَوَلَمۡ يَرَوۡا اِلَى الۡاَرۡضِ كَمۡ اَنۡۢبَتۡنَا فِيۡهَا مِنۡ كُلِّ زَوۡجٍ كَرِيۡمٍ ۝ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكۡثَرُهُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ ۝ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الۡعَزِيۡزُ الرَّحِيۡمُ ۝ؒ (26:7-9)

کیا انھوں نے زمین کی طرف نہیں دیکھا! ہم نے اس میں کتنی قسم قسم کی فیض بخش چیزیں اگائی ہیں[1]۔ یقیناً اس میں (اللہ کی قدرت کی) بڑی نشانی ہے لیکن ان میں اکثر ایمان لانے والے نہیں ہیں[2]۔ اور بیشک تمہارا رب غالب بھی ہے، مہربان بھی[3]۔

1۔ زمین میں اللہ تعالیٰ کے وجود، اورقدرت کی گوناگوں نشانیاں بکھری ہوئی ہیں۔ یہاں خاص طور پر قسم قسم کے مفید نباتات کی طرف انسان کو متوجہ کیا جارہا ہے۔

کریم۔ فیض بخش، مفید اور قابل قدر چیز۔ تمام نباتات مفید ہیں یہ افادیت سائنس کی ترقی کے ساتھ ساتھ مزید اُجاگر ہوتی جارہی ہے۔

2۔لیکن جو لوگ تعصبات اور ہٹ دھرمی میں گرفتار ہوتے ہیں وہ قبول حق کی طرف آمادہ نہیں ہوتے۔

3۔ عزیز: غالب، زبردست، جو ناقابل شکست ہو۔

رحیم: بہت رحم کرنے والا۔

وہ زبردست طاقت والا ہے، غالب ہے، ناقابل شکست ہے مگر اس کے ساتھ ہی وہ بہت رحم کرنے والا، شفیق اور مہربان ہے۔

اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ ۚ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ ؕ

اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّجَعَلَ خِلٰلَهَآ اَنْهٰرًا وَّجَعَلَ لَهَا رَوَاسِیَ وَجَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ؕ

اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ؕ

اَمَّنْ يَّهْدِيْكُمْ فِیْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَنْ يُّرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَیْ رَحْمَتِهٖ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ؕ

اَمَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَمَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ (27:60-64)

ابھلا(1) وہ کون ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو

پیدا کیا اور جس نے بادل سے تمہارے لئے پانی اتارا۔ پس ہم نے اس سے خوش منظر باغات اُگائے، تمہارے امکان میں نہ تھا کہ تم ان کے درخت اُگا سکتے۔ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہے؟ بلکہ یہ (راہ حق سے) انحراف اختیار کرنے والے لوگ ہیں۔

بھلا کس نے زمین کو جائے قرار بنایا اور اس میں نہریں جاری کیں اور اس میں پہاڑ بنائے۔ اور جس نے دو بحروں[2] کے درمیان آڑ بنائی۔ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہے؟ بلکہ ان میں سے اکثر بے علم ہیں۔

بھلا وہ کون ہے جو کسی بے قرار کی التجا قبول کرتا ہے جب وہ اُسے پکارتا ہے، اور کون اس کی تکلیف کو دور کرتا ہے اور تمہیں زمین کے خُلفاء[3] بناتا ہے۔ کیا اللہ کے سوا کوئی اور معبود ہے؟ تم بہت کم غور کرتے ہو۔

بھلا کون ہے جو خشکی اور تری[4] کی تاریکیوں میں تمہاری راہنمائی کرتا ہے اور جو ہواؤں کو اپنی بارانِ رحمت سے پہلے خوشخبری بنا کر بھیجتا ہے، کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہے؟ اللہ بہت ہی برتر ہے اُن چیزوں سے جن کو یہ اُس کا شریک ٹھہراتے ہیں۔

بھلا کون ہے جو تخلیق کی ابتداء کرتا ہے پھر اُس کا اعادہ کرے گا، اور جو تمہیں آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے۔ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہے؟ کہو

کہ تم اپنی دلیل لاؤ اگر تم سچے ہو[5]۔

1۔ان آیات میں اللہ کے وجود، قدرت اور توحید کی نشانیاں کھول کر بیان کی گئیں ہیں۔

۱۔آسمانوں اور زمین کی تخلیق۔

۲۔بارش کا برسنا۔

۳۔پانی سے طرح طرح کے خوش منظر باغات کا اُگنا۔

۴۔زمین کا انسان کے لئے جائے قرار بنایا جانا۔

۵۔زمین میں نہروں(دریاؤں) کا جاری ہونا جو تازہ پانی فراہم کرتی ہیں۔

۶۔ زمین میں پہاڑوں کی تخلیق جن کے گوناگوں فائدے ہیں۔

۷۔زمین دو اقسام کے پانی کا پیدا کیا جانا (میٹھا اور نمکین)۔

۸۔انسان کو زمین کا خلیفہ بنایا جانا۔

۹۔خشکی اور تری میں راہنمائی کا اہتمام۔

۱۰۔ہواؤں کا چلنا۔ جو بادلوں کو ایک مقام سے دوسرے مقام پر لے کر جاتی ہیں۔

۱۲۔بارش سے طرح طرح کے نباتات کا اُگنا۔

2۔بحر دریا کو بھی کہتے اور سمندر کو بھی؛ اس کا لغوی معنی ہے پانی کا وسیع اور عظیم ذخیرہ (Great body of water)۔ یہاں دو بحروں کا ذکر ہے۔ یعنی دوقسم کے پانیوں کا: ایک میٹھا پانی اور دوسرا کھاری پانی۔ دونوں کے درمیان اللہ کے قانونِ فطرت کی آڑ ہے۔ یہ پانی زمین میں ساتھ ساتھ موجود ہیں مگر ایک دوسرے کے وجود کو ختم نہیں کرتا۔ ایسا نہیں ہوتا کہ زمین کا سارا پانی نمکین ہوجائے۔ بلکہ دونوں موجود ہیں اور زمین پر حیات کی بقا اور نشو و نما کے لئے دونوں کی ضرورت ہے۔ مزید دیکھیں (الفرقان 25:53)

3۔اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل،ارادہ اور اختیار کی طاقت عطا کی اور اُسے زمین پر ایک طرح کا غلبہ اور تسلط عطا کیا۔ انسان زمین کا خلیفہ ہے یعنی اُسے زمین کی مخلوقات پر ایک طرح کی حکومت دی گئی ہے۔

4۔ خشکی یعنی Land اور تری یعنی Oceans۔

قرآن مجید کا ایک بہت اہم امتیازی وصف یہ ہے کہ وہ لوگوں سے دلیل کا مطالبہ کرتا ہے اور کہتا ہے اگر کوئی سمجھتا ہے کہ وہ سچ کہہ رہا ہے تو اس پر دلیل لائے۔

اَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا الَّيْلَ لِيَسْكُنُوْا فِيْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ۝ (27:86)

کیا انھوں نے غور نہیں کیا کہ ہم نے رات (تاریک) بنائی ہے تاکہ وہ اس میں آرام کریں اور دن کو روشن بنایا ہے (تاکہ اس میں کام کریں)[1]۔ بے شک اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو ایمان لانا چاہیں[2]۔

1۔رات اور دن کا وجود اور ان کا یکے بعد دیگرے آنا جانا اللہ کی قدرت کا عظیم کرشمہ اور انسانوں کے لئے اس کی عظیم نعمت ہے۔

رات کی تاریکی انسان اور بہت سے دوسرے حیوانات کے اعصاب پر گہرا اثر مرتب کرتی ہے جس کی وجہ سے وہ سوتے اور آرام کرتے ہیں۔ اسی طرح دن کی روشنی بیداری، حرکت اور فعالیت کا سبب بنتی ہے۔

یہاں دن کی صفت کے طور پر ''مُبْصِر'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کا لفظی معنی ہے: بینا، دیکھنے والا۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے دن کو ایسا بنایا ہے کہ لوگ اس میں ''دیکھ'' سکتے ہیں یعنی زندگی کی نعمتوں اور معاش کے وسائل تک پہنچ سکتے اور ان سے فائدہ اٹھاسکتے ہیں۔

راتیں روشن دنوں کے درمیان میں آرام کرنے، کھوئی ہوئی توانائی کو بحال کرنے اور تروتازہ ہوکر پھر سے کام کے لئے تیار ہوجانے کے فطری وقفے (Intervals) ہیں۔

2۔ رات اور دن کے اس نظام میں اللہ تعالیٰ کی ہستی اور قدرت کے

روشن دلائل موجود ہیں ان لوگوں کے لئے جو ایمان رکھتے ہیں، یا ایمان لانا چاہیں۔

وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ ۭ صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ ۭ اِنَّهٗ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَفْعَلُوْنَ ○ (27:88)

اور تو جب پہاڑوں کو دیکھے گا تو گمان کرے گا کہ یہ ٹھہرے ہوئے ہیں حالانکہ وہ چل رہے ہوں گے بادل کی سی چال[1]۔ یہ اُس اللہ کی کاریگری ہے جس نے ہر چیز کو (اپنی حکمت سے) محکم بنایا ہے[2]۔ بے شک وہ اُن کاموں سے بھی باخبر ہے جنھیں تم انجام دیتے ہو۔

1۔اس آیت میں پہاڑوں کے بادل کی مانند چلنے کا انکشاف ہے۔ یعنی......

اے انسان تو پہاڑوں کو دیکھتا ہے تو گمان کرتا ہے کہ وہ ٹھہرے ہوئے ہیں حالانکہ وہ بادل کی مانند چل رہے ہوتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پہاڑ اگرچہ ہمیں ٹھہرے ہوئے لگ رہے ہوتے ہیں مگر وہ بڑی تیزی سے حرکت کررہے ہوتے ہیں۔

بادلوں کی حرکت کے ساتھ تشبیہ کا مطلب یہ ہے کہ کسی شور وغل اور دھماکے کے بغیر نرمی کے ساتھ حرکت کررہے ہیں۔ پھر جس طرح بادل عظیم الجثہ ہوتے ہیں اُسی طرح پہاڑ بھی بہت بڑی جسامت کے حامل ہوتے ہیں۔

مگر سوال یہ ہے کہ پہاڑ کیسے حرکت کررہے ہیں۔ اس کی ایک واضح تعبیر یہ ہے کہ یہ آیت اصل میں بالواسطہ طور پر زمین کی حرکت کا انکشاف کررہی ہے۔ وہ زمین کا حصہ ہیں۔ یہ بات پہاڑوں کے حوالے سے اس لئے کہی گئی ہے کہ پہاڑوں کا ٹھہراؤ اور جمود اور بھاری پن ضرب المثل ہے لہٰذا پہاڑوں کی حرکت

کے الفاظ استعمال کر کے زمین کی حرکت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

بہت سے مفسرین نے اس آیت میں پہاڑوں کی حرکت سے قربِ قیامت کے حالات کی طرف اشارہ سمجھا ہے جب کہ پہاڑ ریزہ ریزہ ہوکر دھنی ہوئی روئی کے گالوں کی طرح اُڑیں گے۔ لیکن بہت سے قرآئن اس تشریح کی تائید کرتے ہیں جو اوپر ہم نے بیان کی ہے۔ مثلاً

1۔ یہ کہنا کہ تم پہاڑوں کو ساکن و جامد ''گمان'' کرو گے یا کرتے ہو۔ حالانکہ کہ قربِ قیامت کے موقع پر جو تبدیلیاں آئیں گی وہ بالکل واضح اور آشکارا ہوں گی (نہ کہ انھیں گمان کیا جائے گا)۔

2۔ آیت کا اگلا ٹکڑا کہتا ہے کہ ''یہ اللہ تعالیٰ کی کاریگری ہے جس نے ہر چیز کو محکم بنایا ہے''۔ یہ بات اُس صورتِ حال سے زیادہ ہم آہنگ معلوم ہوتی ہے جب کہ نظامِ کائنات برقرار ہے نہ کہ اُس وقت کے ساتھ جب کہ وہ تباہ ہورہا ہو۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَآ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ ۝ وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ ۝ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَابْتِغَآؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ۝ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَيُحْيٖ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝ وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ تَقُوْمَ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ بِاَمْرِهٖ ؕ ثُمَّ اِذَا دَعَاكُمْ دَعْوَةً ۖ مِّنَ الْاَرْضِ اِذَآ اَنْتُمْ تَخْرُجُوْنَ ۝ (30:20-25)

اور اس کی نشانیوں میں سے ہے[1] کہ اُس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا پھر تم اچانک بشر بن کر (زمین میں) پھیل رہے ہو[2]۔

اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ اُس نے

تمہاری ہی جنس سے تمہارے لئے جوڑے پیدا کئے
تا کہ تم اُن سے سکون حاصل کرو، اور اُس نے تمہارے
درمیان محبت اور رحمت پیدا کی۔ بے شک اس میں
بڑی نشانیاں ہیں اُن کے لئے جو غور کرتے ہیں[3]۔

اور اس کی نشانیوں میں سے آسمانوں اور زمین کی
تخلیق[4]، اور تمہاری زبانوں اور تمہارے رنگوں کا تنوع
بھی ہے۔ بے شک اس میں بڑی نشانیاں ہیں اُن کے
لئے جو علم رکھتے ہیں[5]۔

اور اس کی نشانیوں میں سے ہے رات اور دن
میں تمہارا سونا، اور تمہارا اُس کے فضل کا تلاش کرنا،
بے شک اس میں بڑی نشانیاں ہیں اُن کے لئے جو
سنتے ہیں[6]۔

اور اس اُس کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ وہ
تمہیں بجلی دکھاتا ہے جو خوف بھی پیدا کرتی ہے اور
امید بھی[7]، اور آسمان سے پانی اتارتا ہے، پس اُس
سے زمین کو اس کے مردہ ہوجانے کے بعد زندہ کردیتا
ہے، بے شک اس میں بڑی نشانیاں ہیں اُن لوگوں
کے لئے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔
اور اس کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ آسمان
اور زمین اُس کے حکم سے قائم ہیں[8]۔پھر جب وہ
تمہیں زمین سے پکارے گا تو تم فوراً نکل پڑو گے[9]۔

1- یہ چھ آیات ہیں جن میں سے ہر ایک ''وَمِنْ اٰیٰتِہٖ'' (اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ......) کے الفاظ سے شروع ہوتی ہے۔ اس قسم کی آیات قرآنِ پاک میں کل گیارہ ہیں۔ ان چھ کے علاوہ ایک اسی سورہ میں آیت نمبر46 ہے دو آیات سورہ حم سجدہ (41) میں ہیں (آیات:37 اور 39)۔ جب کہ دو آیات سورہ الشوریٰ (42) میں ہیں (آیات 29 اور 32)۔

2- بے جان مٹی (بے جان مادہ) سے جاندار اور ذی شعور انسان کی تخلیق اللہ کی ہستی اور قدرت کی عظیم شہادت ہے۔ (تشریح کے لئے دیکھیں سورہ الحج 22:5 اور سورہ المومنون 23:12)۔

اللہ تعالیٰ نے انسان میں افزائشِ نسل کی صلاحیت رکھی ہے جس کے نتیجے میں نسلِ انسانی تیزی کے ساتھ زمین میں پھیل رہی ہے۔

3۔مرد اور عورت ایک ہی جنس اور نوع سے پیدا کئے گئے ہیں۔ ان کی تخلیق اس طرح کی گئی ہے کہ دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے بغیر نامکمل اور ادھورے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان میں ایک دوسرے کے لئے محبت اور رحمت کے جذبات پیدا کئے ہیں۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ اس آیت میں شادی کا مقصد میاں بیوی کا باہمی سکون و راحت بیان کیا گیا ہے۔

یہاں مودّت اور رحمت کے دو الفاظ استعمال ہوئے ہیں جن پر غور کی ضرورت ہے۔ مودّت ایک دو طرفہ تعلق ہے جب کہ ''رحمت'' میں ایثار ہوتا ہے اور وہ یک طرفہ ہوتی ہے۔ معاشرے کی بقا کے لئے دونوں کی ضرورت ہے۔ مودت کا جذبہ باہمی تعاون پر آمادہ کرتا ہے اور رحمت کا جذبہ صلے اور فریقِ ثانی کے عمل کا خیال رکھے بغیر اپنے طور پر شفقت کی تحریک دیتا ہے۔

4۔ کائنات کی تخلیق اللہ تعالیٰ کی ہستی اور قدرت کی گواہی دیتی ہے، انسان کا کائنات اور اس کے مظاہر کے متعلق علم جس قدر بڑھتا جائے گا اسی قدر اللہ کی قدرت کے تازہ نکات اس پر آشکار ہوتے جائیں گے۔

5۔انسانوں میں پایا جانے والا زبانوں اور رنگوں کا اختلاف بھی اپنے اندر اللہ کی قدرت کی گوناگوں نشانیاں رکھتا ہے مگر ان تک رسائی کے لئے علم کی ضرورت ہے۔

تمام انسان ایک وحدت سے پھوٹے ہیں مگر ان میں بہت سی زبانیں بولی جاتی ہیں اور رنگ کے اعتبار سے بھی ان میں تنوع پایا جاتا ہے ہر زبان

خوبصورت اور ہر رنگ دلکش ہے۔ یہ بوقلمونی اور رنگا رنگی بذات خود ایک عظیم نعمت ہے۔ فرض کریں کہ اگر ساری دنیا کے انسان اپنی زبان اور رنگ و روپ میں ایک جیسے ہوتے۔ تو ان کی ایک دوسرے سے پہچان بہت مشکل ہوجاتی۔

امام فخر الدین رازی نے اس آیت کے ذیل میں کہا ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان کو یا تو آنکھ سے دیکھ کر پہچانتا ہے یا اُس کی آواز سن کر اس لئے اللہ تعالیٰ نے بذریعہ چشم شناخت کرنے کے لئے انسانوں کے رنگ، صورتوں اور شکلوں کو مختلف بنایا ہے اور کان کے ذریعے شناخت کرنے کے لئے آوازوں اور لہجوں میں اختلاف پیدا کردیا ہے۔

زبانوں کے اختلاف سے مراد بولی جانے زبانوں (Languages) کا فرق بھی ہے اور آوازوں اور لہجوں کا فرق بھی۔ جب کہ رنگوں کے فرق سے مراد قوموں کے رنگوں کا فرق بھی ہے اور کسی ایک ہی قوم کے افراد کے رنگ و روپ کا فرق بھی۔

آخر میں کہا گیا ہے کہ ان میں اُن لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو علم رکھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان حقائق میں پوشیدہ اسرار تک اہل علم کی نظر ہی بہتر طور پر پہنچ سکتی ہے۔

6۔ رات اور دن میں سونا اور معاش کے لئے دوڑ دھوپ کرنا بھی اپنے اندر اللہ تعالیٰ کی قدرت کی وسیع نشانیاں رکھتا ہے۔ مگر ان نشانیوں کی گہرائی تک وہی پہنچ سکتے ہیں جو حق کی آواز سنتے ہوں۔ تعصّبات اور ہٹ دھرمی میں جکڑے ہوئے لوگ اللہ کی کارفرمائی کے نتیجے تک نہیں پہنچ سکتے۔ مزید دیکھیں الفرقان (25:47)۔

آیت کے الفاظ و عبارت پر ایک بار پھر غور کریں۔ یہاں ''رات اور دن میں تمہارا سونا اور اس کا فضل تلاش کرنا'' کے الفاظ توجہ طلب ہیں۔ اگرچہ بطور معمول انسان رات کو سوتا اور دن کو کام کرتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے انسان کو یہ اختیار بھی دیا ہے کہ وہ بوقتِ ضرورت، اپنے معمولاتِ حیات کو بدل سکتا ہے۔ انسان کو زندگی میں بعض حالات ایسے پیش آجاتے ہیں جن میں اُسے رات کو کام کرنا اور دن کو سونا پڑجاتا ہے۔ آج کی تہذیب یافتہ دُنیا میں بعض اداروں، کارخانوں اور ہسپتالوں میں رات دن کام جاری رہتا ہے اور لوگ تین شفٹوں میں کام کرتے ہیں۔ اگر سونے کے اوقات انسان کے اختیار میں نہ ہوتے تو کتنی

دشواری ہوتی۔

آیت میں ''نیند'' کا ذکر پہلے اور ''رزق کی تلاش'' کا ذکر بعد میں ہے۔ اس میں بھی یہ نکتہ ہے کہ اگر انسان سو نہ سکے، آرام نہ کرسکے ، اپنی کھوئی ہوئی توانائی کو بحال کرکے تروتازہ نہ ہو تو وہ کام بھی نہیں کرسکتا۔

7۔بادلوں میں بجلی کے چمکنے میں انسانوں کے لئے خوف کا پہلو بھی ہے اور اُمید کا بھی۔خوف یہ ہے کہ وہ کبھی ٹوٹ پڑتی ہے اور جو چیز اس کے احاطہ میں آئے اُسے جلا کر راکھ کر دیتی ہے۔ اُمید یہ ہے کہ عموماً گرج چمک کے بعد تندو تیز بارش ہوتی ہے جو نباتات کے اُگنے اور تازہ پانی کی فراہمی کا ذریعہ ہے۔ اس بنا پر بجلی کا چمکنا نزول بارش کا پیش خیمہ ہے، اس کے علاوہ بجلی کے چمکنے میں اور بھی کئی فائدے ہیں۔

8۔ کائنات اللہ تعالیٰ کے حکم سے قائم ہے وہ جب تک چاہے گا قائم رہے گی اور اس کی منشاء کے مطابق اختتام کو پہنچ جائے گی۔

آیت نمبر22میں ارشاد ہے کہ آسمانوں اور زمین کی تخلیق اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہے اور یہاں اُن کی بقا کو نشانی قرار دیا گیا ہے۔ کائنات کی تخلیق اور بقا دونوں میں اللہ تعالیٰ کی ہستی اور قدرت کی گوناگوں نشانیاں ہیں۔

9۔ اوپر پہلی آیت میں انسانوں کی خلقت کا ذکر ہے اور یہاں روزِ قیامت دوبارہ جی اُٹھنے کا۔

کن لوگوں کے لئے نشانیاں:

اوپر آیات میں جن لوگوں کے لئے نشانیوں کا ذکر ہے اُن کی ترتیب یہ ہے۔

۱۔غور وفکر کرنے والے (آیت نمبر21)

۲۔علم والے (آیت نمبر22)

۳۔سننے والے (آیت نمبر23)

۴۔عقل سے کام لینے والے (آیت نمبر24)

غور و فکر کے بغیر علم حاصل نہیں ہوتا، غور و فکر اور علم انسان کو آمادہ کرتا ہے کہ وہ حق کی بات سنے۔ ان تینوں چیزوں کی موجودگی ہی میں انسان عقلِ کامل کی منزل پر پہنچ سکتا ہے۔

ان آیات پر غور کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ:

جو بات غور و فکر کے بغیر سمجھ میں نہیں آسکتی وہاں فکر کرنے والوں کے الفاظ آئے ہیں۔ جس بات کو سمجھنے کے لئے علم کی ضرورت ہے وہاں علم والوں کے الفاظ آئے ہیں جس بات کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ آدمی حق کی بات سنے وہاں سننے والوں کے الفاظ آئے ہیں اور جہاں بات کو سمجھنے کے لئے گہرے تعقل کی ضرورت ہے وہاں عقل سے کام لینے والوں کے الفاظ آئے ہیں۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ يُّرْسِلَ الرِّيَاحَ مُبَشِّرٰتٍ وَّلِيُذِيْقَكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَلِتَجْرِيَ الْفُلْكُ بِاَمْرِهٖ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ٥ (30:46)

اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ وہ ہواؤں کو (اپنی رحمت کی) خوش خبری دینے والی بنا کر بھیجتا ہے......اور تا کہ وہ تم کو اپنی رحمت سے نوازے اور تا کہ کشتیاں اُس کے حکم سے چلیں اور تا کہ تم اُس کے فضل کے طالب بنو، اور تا کہ تم اس کا شکر ادا کرو۔

زمین پر ہوائیں ایک نظام کے تحت چلتی ہیں۔ ہواؤں کا چلنا بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک ہے۔ اگر ہوا ساکن ہوتی تو اتنا تعفّن پھیلتا کہ انسان کے لئے زمین پر رہنا مشکل ہوجاتا۔ ہواؤں کے بہت سے فوائد میں سے یہاں دو فوائد کی طرف انسان کی توجہ مبذول کرائی گئی ہے۔ پہلا یہ کہ ہوائیں سمندروں اور دوسرے آبی ذخیروں سے آبی بخارات کو اٹھاتی اور انھیں بادلوں کی شکل میں جمع کرتی ہیں اور پھر ان بادلوں کو ایک مقام سے دوسرے مقام پر حرکت دے کر لے جاتی ہیں۔ اس طرح یہ انسانوں کے لئے بارانِ رحمت کی خوشخبری بن جاتی ہے۔ دوسرا یہ کہ ہواؤں کی مدد سے کشتیاں سمندروں (اور دریاؤں وغیرہ) کی سطح پر چلتی ہیں۔

انسان کے لئے لازمی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو پہچانے۔ اشیاء

و مظاہرِ فطرت کو استعمال کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا فضل تلاش کرے۔ اور اس طرح اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے متمتع ہو کر صحیح معنوں میں خود کو اللہ تعالیٰ کا شکرگزار بندہ بنائے۔

اَللّٰہُ الَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیٰحَ فَتُثِیْرُ سَحَابًا فَیَبْسُطُهٗ فِی السَّمَآءِ کَیْفَ یَشَآءُ وَیَجْعَلُهٗ کِسَفًا فَتَرَی الْوَدْقَ یَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ۚ فَاِذَآ اَصَابَ بِهٖ مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖۤ اِذَا هُمْ یَسْتَبْشِرُوْنَ ۝ وَاِنْ کَانُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ یُّنَزَّلَ عَلَیْهِمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمُبْلِسِیْنَ ۝ (30:48-49)

اللہ ہی ہے جو ہوائیں بھیجتا ہے پس وہ بادلوں کو اُٹھاتی ہیں پھر وہ جس طرح چاہتا ہے ان کو فضا[1] میں پھیلا دیتا ہے، اور ان کو تہہ بہ تہہ کردیتا ہے۔ پس تم بارش کو ان کے بیچ سے نکلتے ہوئے دیکھتے ہو[2]۔ جب وہ اسے اپنے بندوں میں سے جن پر چاہتا ہے نازل کرتا ہے تو وہ یکایک خوش ہوجاتے ہیں۔ اگرچہ وہ اس کے نازل کئے جانے سے قبل بالکل مایوس ہوچکے تھے۔(30:48-49)

1۔یہاں ''سماء'' کا لفظ زمین کے اوپر کی اُس فضا اور بلندی کے معنی میں استعمال ہوا ہے جس میں بادل پھیلتے ہیں۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا جاچکا ہے عربی زبان میں ''سماء'' وسیع معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ یہ بلندی کے لئے، اوپر کی جہت کے لئے، بادل کے لئے، اوپر کی فضا کے لئے، کرۂ ہوائی کے لئے، کائناتی خلأ (Cosmic space) کے لئے اور حتیٰ کہ گھر کی چھت کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اس لئے کہتے ہیں کہ جو تمہارے پاؤں کے نیچے ہے وہ ''ارض''

ہے اور جو تمہارے سر کے اوپر ہے وہ ''سماء'' ہے۔

2۔ بادل فضائے آسمانی میں پھیلتے، سفر کرتے اور تہہ بہ تہہ ہوتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں اُن سے بارش برستی ہے۔ ''تہہ بہ تہہ ہونا'' غالباً اس حالت کی طرف اشارہ ہے جس میں بادلوں میں آبی بخارات باریک قطروں (droplets) اور پھر بڑے قطروں کی شکل اختیار کرتے ہیں اس عمل کو جدید سائنسی زبان میں ترسیب (Precipitation) کہا جاتا ہے۔

بارش اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت ہے جو انسان کو تازہ پانی (Fresh water) فراہم کرتی ہے، دریاؤں، چشموں اور کنوؤں کو بنیادی طور پر اپنے لئے پانی بارش (بشمول برف وغیرہ) ہی کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔

تازہ پانی نہ صرف پینے کے کام آتا ہے بلکہ فصلوں، پھلوں اور سبزیوں کی آب پاشی کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔

ہوائیں بادلوں کو ایک مقام سے دوسرے مقام تک لے جاتی ہیں۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا وَاَلْقٰى فِى الْاَرْضِ رَوَاسِىَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۭ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ ۝
(31:10)

اُس نے آسمانوں کو بغیر ایسے سہاروں کے تخلیق کیا جنھیں تم دیکھ سکتے[1] اور اس نے زمین میں پہاڑ بنائے کہ وہ تمہیں لے کر لرزتی نہ رہے[2]۔ اور اس نے اس میں ہر قسم کے جاندار پھیلائے۔

اور ہم نے بادل سے پانی برسایا اور اس میں قسم قسم کی فیض بخش چیزیں اُگائیں[3]۔

1۔ سیاق و سباق سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں سماوات (آسمانوں) کا لفظ اجرامِ سماوی (یعنی کہکشاؤں، ستاروں اور سیاروں وغیرہ) کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ مزید تشریح کے لئے ملاحظہ کریں سورہ الرعد 13:2-4 نوٹ (2)۔

2۔تشریح کے دیکھیں سورہ النحل 16:15-16 نوٹ (1)۔

3۔ دیکھیں سورہ الشعراء 26:7-9 نوٹ (1)۔

وَلَوْ اَنَّ مَا فِى الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝
(31:27)

اور زمین میں جتنے درخت ہیں اگر وہ قلم بن
جائیں اور سمندر، مزید سات سمندروں کے ساتھ،
روشنائی بن جائیں جب بھی اللہ کی باتیں قلم بند نہیں
ہوسکتیں۔ بے شک اللہ غالب اور حکیم ہے۔

اللہ تعالیٰ لامحدود علم کا مالک ہے۔ اس کے علم کا احاطہ ناممکنات میں سے ہے۔ ایک درخت سے بلامبالغہ ارب ہا ارب قلم بنائے جاسکتے ہیں۔ دنیا کے سارے درختوں سے ممکنہ طور پر جو قلم بنائے جاسکتے ہیں اُن کی تعداد شمار سے باہر ہے۔ پھر یہ کہ ایک قلم کوئی لفظ یا صفحہ یا کتاب لکھ کر ختم نہیں ہوجاتا بلکہ اس کی استعداد نہایت زیادہ ہوتی ہے کیونکہ لکھنے میں جو چیز خرچ ہوتی ہے وہ روشنائی ہے نہ کہ قلم۔ قلم کو تراشنے کی ضرورت یقیناً پڑتی ہے لیکن ایک تراشے ہوئے قلم کی لکھنے کی گنجائش بہت زیادہ ہے۔ اگر ان تمام قلموں سے ممکنہ حد تک تیزی کے ساتھ لکھنے کا کام شروع ہوجائے اور اس مقصد کے لئے دنیا کے تمام سمندر روشنائی بن جائیں اور ان کے ساتھ بے شمار اور سمندر بھی شامل کرلئے جائیں تو بھی اللہ تعالیٰ کے کلمات کو لکھنا ممکن نہیں (مزید دیکھیں سورہ کہف 18:109)۔

اس طرف بھی توجہ رہے کہ یہاں سبعہ (سات) کا لفظ کثرت کے معنوں پر دلالت کرتا ہے یعنی اگر بے شمار سمندر بھی روشنائی بن جائیں تب بھی اللہ تعالیٰ کے کلمات سپردِ قلم نہیں کیے جاسکتے۔ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم لا متناہی ہے۔ سات کیا سات ارب سمندر بھی ہوں تو اللہ تعالیٰ کے علم کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۡ كُلٌّ يَّجْرِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّاَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝ (31:29)

کیا تم نے غور نہیں کیا کہ اللہ ہی ہے جو رات کو

دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے[1]۔ اور اس نے سورج اور چاند کو مسخر کر رکھا ہے[2]۔ ہر ایک، ایک مقررہ وقت تک چل رہا ہے[3] اور یہ کہ جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اُس سے باخبر ہے۔

1۔ رات اور دن کے تدریجی طور پر ایک دوسرے میں داخل ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ سال میں رات اور دن چھوٹے بڑے ہوتے رہتے ہیں ایک میں کمی دوسرے میں اضافہ کا باعث بنتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زمین اپنے مدار پر 23 درجے کے زاویہ سے جھکی ہوئی ہے۔ اسی بنیاد پر چار موسم وجود میں آتے ہیں۔ (ماسوائے قطبین اور خطِ استواء کے، قطبین یعنی قطب شمالی اور قطب جنوبی میں چھ ماہ کی رات اور چھ ماہ کا دن ہوتا ہے، جبکہ خطِ استوا پر سارا سال رات اور دن کا دورانیہ برابر رہتا ہے۔ (مزید دیکھیں سورہ آل عمران 3:27 نوٹ 1۔)

2۔ سورج اور چاند اللہ کے حکم اور قانون کے پابند ہیں۔ اُسی کے ارادہ اور مشیت کے مطابق اپنا فعل سرانجام دے رہے ہیں۔ اور طرح طرح سے انسان کے فائدہ کا باعث بنتے اور اس کی ضروریات کی تکمیل کرتے ہیں۔ نیز، انسان اپنے ذہن، شعور اور علم کو بروئے کار لاکر ان سے نئے نئے طریقوں سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ (مزید دیکھیں سورہ ابراہیم 14:33)

3۔ یہ نظام ہمیشہ جاری نہیں رہے گا بلکہ اس کا ایک دورانیۂ حیات ہے جسے بالآخر ختم ہوجانا ہے۔ اجرامِ سماوی میں سے ہر ایک، ایک خاص مدت تک جو اس کے لئے معین ہے، اپنی حرکت جاری رکھے گا۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ الْفُلْكَ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِنِعْمَتِ اللّٰهِ لِیُرِیَكُمْ مِّنْ اٰیٰتِهٖ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ۝ (31:31)

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ ہی کے فضل سے
کشتی دریا میں چلتی ہے[1]۔ تاکہ وہ تمہیں اپنی نشانیوں
کا مشاہدہ کرائے۔ بے شک اس میں بڑی نشانیاں ہیں
ہر اُس شخص کے لئے جو بہت صبر کرنے والا اور بہت
شکر کرنے والا ہے[2]۔

1۔پانی میں کشتیوں اور جہازوں کے چلنے لئے کچھ ضروری حالات اور شرائط ہیں۔ اس کے لئے دیکھیں سورہ البقرہ 2:164 نوٹ 5۔
یہ اللہ تعالٰی کی مشیت ہے جس نے یہ حالات پیدا کئے ہیں۔

2۔سخت حوادث کے مقابلے میں صبر اور نعمتوں کے ملنے پر شکر، بحری سفر میں سخت مشکلات بھی ہیں اور اس میں طرح طرح کی نعمتیں بھی ہیں۔ اگر انسان میں صبر اور شکر کا جذبہ نہ ہوتو وہ ان نشانیوں سے روشنی حاصل نہیں کرسکتا جن کا تعلق کشتیوں اور جہازوں کے پانیوں میں حرکت کرنے سے ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِىۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ وَمَا بَيۡنَهُمَا فِىۡ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسۡتَوٰى عَلَى الۡعَرۡشِ‌ؕ مَا لَـكُمۡ مِّنۡ دُوۡنِهٖ مِنۡ وَّلِىٍّ وَّلَا شَفِيۡعٍ‌ؕ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوۡنَ ۝ يُدَبِّرُ الۡاَمۡرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الۡاَرۡضِ ثُمَّ يَعۡرُجُ اِلَيۡهِ فِىۡ يَوۡمٍ كَانَ مِقۡدَارُهٗۤ اَلۡفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوۡنَ ۝ ذٰلِكَ عٰلِمُ الۡغَيۡبِ وَالشَّهَادَةِ الۡعَزِيۡزُ الرَّحِيۡمُ ۝

(32:4-6)

اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ اُن کے درمیان ہے، چھ ادوار میں تخلیق کیا اور تختِ اقتدار پر متمکن ہوا[1]۔ اس کے سوا تمہارا نہ کوئی کارساز ہے اور نہ اُس کے مقابل میں کوئی سفارشی۔ کیا تم نصیحت حاصل نہیں کرتے۔ وہ آسمان سے زمین تک کام کی تدبیر کرتا ہے[2]۔ پھر یہ کہ ہر امر اُسی کی طرف صعود کرتا ہے ایک ایسے یوم (عرصۂ وقت) میں جس کی مقدار تمہارے شمار سے ہزار سال کے برابر ہے[3]۔ وہ پوشیدہ اور ظاہر کا جاننے والا ہے، زبردست قوت والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔

1۔ تشریح کے لئے دیکھیں سورہ الاعراف 7:54۔
2۔ اگر ہم اس کا یہ معنی لیں کہ امور کی تدبیر ''آسمان'' سے ''زمین''

کی طرف ہوتی ہے تو ممکنہ طور پر" آسمان" (سماء) اور "زمین" (ارض) اپنے معروف معنوں میں نہیں بلکہ زیادہ گہرے معنوں میں استعمال ہوئے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ وہ معنی کیا ہیں۔ اس کے لئے ہمیں یہ دیکھنا پڑے گا کہ امور کی تدبیر سے کیا مراد ہے۔ قرآن کا بنیادی نظریہ یہ ہے کہ مادی کائنات میں کوئی واقعہ اس وقت تک ظہور پذیر نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ علمِ الٰہی میں پہلے سے موجود نہ ہو۔ امور کی تدبیر یوں ہوتی ہے کہ ارادۂ الٰہی اس چیز کو جو علمِ الٰہی میں موجود ہے، وجود پذیر کرنا چاہتا ہے اور وہ چیز ویسے ہی ظہور پذیر ہوتی ہے جیسے کہ وہ علمِ الٰہی میں ہوتی ہے اور جیسے اُسے ارادۂ الٰہی وجود پذیر کرنا چاہتا ہے۔

اس گفتگو سے بہ آسانی ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ یہاں "سماء" سے مراد عالمِ بالا یا عالمِ غیب (یا مابعد الطبیعاتی دُنیا) ہے جبکہ "ارض" سے مراد عالم شہود (یا طبیعاتی اور مادّی دُنیا) ہے۔ اگلی آیت سے اس تصور کو تقویت ملتی ہے جہاں صاف طور پر کہا گیا ہے کہ اللہ غیب اور شہادت کا جاننے والا ہے۔ جو بھی واقعہ عالمِ شہود میں وقوع پذیر ہوتا ہے، اُس کی تحریک عالمِ غیب میں پائی جاتی ہے۔

[سمجھنے کے لئے فرض کریں مثال کے طور پر جب کوئی کمہار گھڑا بنانا چاہتا ہے تو یہ گھڑا جیسا کہ وہ اُسے بنانا چاہتا ہے اُس کے ذہن میں موجود ہوتا ہے۔ یعنی گھڑا مادی دُنیا میں وجود پذیر ہونے سے پہلے کمہار کے ذہن میں موجود ہوتا ہے۔

کمہار کے ہاتھ (دیگر اسباب کو بروئے کار لاتے ہوئے) عالم شہود میں گھڑے کو ایسا ہی بناتے ہیں جیسا کہ وہ کمہار کے ذہن میں ہوتا ہے، یہ تدبیر ہے]۔

3۔"ہر امر اُسی کی طرف صعود کرتا ہے" کا معنی:

ارادہ الٰہی جب کسی چیز کو وجود میں لانا چاہتا ہے تو اس کا آغاز پست ترین حالت سے کرتا ہے [جیسے مثال کے طور پر کمہار گھڑے کا آغاز پست ترین حالت یعنی گارے سے کرتا ہے]۔ پھر اُسے تدریجی طور پر نشوونما دیتا ہوا بالآخر اُس کی کامل شکل میں وجود پذیر کرتا ہے۔ یہ ارتقائی عمل جو کسی چیز کو اُس کی پست ترین حالت سے اُس کے نقطۂ عروج تک پہنچاتا ہے، اس چیز کا عروج یا صعود کہلاتا ہے [یہ اللہ تعالٰی کی صفتِ ربوبیّت کا ظہور ہے۔

یہ عروج یا صعود چونکہ ایک ارتقائی عمل ہے لہٰذا اسے وقوع پذیر ہونے کے لئے عرصۂ وقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ کائناتی، حیاتیاتی اور انسانی مظاہر کے اعتبار سے یہ عرصہ ہائے وقت بڑے طویل ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر گیس اور گرد سے نظامِ شمسی کا وجود میں آنا، یا بے جان مادے سے زندگی کا ظہور پذیر ہونا، یا کسی قوم کا عروج حاصل کرنا سب ایسے مظاہر ہیں جو طویل عرصۂ وقت کے طالب ہوتے ہیں۔ ''ایسے یوم میں جس کی مقدار تمہارے شمار کے مطابق ہزار سال کے برابر ہوتی ہے۔'' کا یہی مفہوم ہے۔

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ ''ہزار سال'' کے الفاظ ریاضیاتی عدد کے مفہوم میں استعمال نہیں ہوئے بلکہ اس سے مراد عام زمینی دنوں کے مقابلے میں طویل مدت ہے اور بتانا یہ مقصود ہے کہ کائناتی واقعات طویل مدتوں میں وقوع پذیر ہوتے ہیں ۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا ایک دن ہزاروں، لاکھوں بلکہ کروڑوں، اربوں سالوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر دیکھیں سورہ الحج 22:47 جہاں ارشاد ہے:

> ''اور یہ لوگ تم سے عذاب کے لئے جلدی مچائے ہوئے ہیں حالانکہ اللہ اپنے وعدے کی ہرگز خلاف ورزی کرنے والا نہیں ہے۔ اور تمہارے رب کے ہاں کا ایک دن تمہارے شمار کے اعتبار سے ایک ہزار سال کی طرح کا ہوتا ہے۔''

سورہ المعارج 70:4 میں ہے:

> ''ملائکہ اور روح اس کی طرف صعود کرتے ہیں ایک ایسے یوم میں جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہوتی ہے''۔

ممکنہ طور پر یہاں ملائکہ اور روح سے مراد وہ قوتیں ہیں جو ارادۂ الٰہی کو وجود میں لاتی ہیں اور اُن کے عروج و صعود سے مراد ان کا ارتقائی عمل ہے جس کے تحت وہ کسی چیز (کسی واقعہ، کسی مظہر) کو اس کی پست ترین حالت سے اس کے نقطۂ عروج تک پہنچاتی ہیں۔

الَّذِیٓ اَحْسَنَ کُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِیْنٍ ۚ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِیْنٍ ۚ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ؕ قَلِیْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝ (32:7-9)

وہ وہی ہے جس نے جو چیز بھی پیدا کی بہترین پیدا کی(1)اور اس نے انسان کی تخلیق کی ابتدا مٹی سے کی(2)، پھر اس کی نسل ادنی درجے کے پانی کے خلاصہ سے جاری کی(3)۔

پھر اس کی تکمیل(4)کی، اور اس میں اپنی روح پھونکی۔ اور تمہارے لئے کان، آنکھیں اور دل قرار دیئے مگر تم بہت ہی کم شکر گزار ہوتے ہو۔

1۔ ہر چیز کو اُس کے مقصدِ تخلیق کے مطابق پیدا کیا گیا ہے۔ خلقت اور مقصدِ خلقت میں مکمل ہم آہنگی ہے۔ ہر موجود کو جو کچھ اس کی تخلیق کے لئے ضروری تھا، عطا کیا گیا ہے، گویا، ہر موجود کو وہی کچھ عطا کیا گیا ہے جو وہ ''زبانِ حال'' سے چاہتا تھا۔ اسے وہ سب کچھ دیا گیا ہے۔ جس کی اُسے ضرورت تھی۔

2۔انسان کی تخلیق کے حوالے سے یہ آیت کلیدی حیثیت رکھتی ہے۔ آیت کہہ رہی ہے کہ انسان کی خلقت کی ابتدا مٹی سے کی گئی۔

لفظ ''بدا'' (ابتدا) غور طلب ہے۔ انسان کی تخلیق کا آغاز مٹی سے ہوا ہے۔ اس کا کیا مطلب ہے؟

طین کا لفظ بھی توجہ طلب ہے۔ یہ مٹی کے لئے استعمال ہوتا ہے مگر زیادہ قطعی معنی پانی ملی ہوئی مٹی ہے جسے ہم گارا یا کیچڑ کہہ سکتے ہیں۔ ''انسان کی تخلیق کی مٹی سے ابتداء'' کی تشریح نظریہ ارتقاء اور خصوصی تخلیق(Special

(creation) کے نظریہ، دونوں کے مطابق کی جاسکتی ہے۔ نظریہ ارتقا کے مطابق اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے سمندروں کے کنارے کیچڑ میں پیچیدہ اور لمبے کیمیائی تعاملات کے ذریعے تدریجی طور پر سادہ ترین جاندارتخلیق فرمائے جو درجہ بدرجہ ترقی کرتے ہوئے اربوں سالوں میں انسان کی شکل میں ظہور پذیر ہوئے۔ یوں پہلا انسان وجود میں آیا۔ یعنی اُس کا آغاز مٹی سے ہوا۔ اربوں سالوں کے ارتقائی عمل کے نتیجے میں اس کی جسمانی ساخت اُس شکل میں ظہور پذیر ہوئی جو ہماری جانی پہچانی انسانی شکل ہے۔ اس کو تسویہ (درست کرنا، موزوں کرنا، تکمیل کرنا وغیرہ) کہہ سکتے ہیں۔

خصوصی تخلیق کا نظریہ یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے انسان (حضرت آدم علیہ السلام) کو براہ راست گارے سے بنایا۔ گارے سے ان کا جسم بنایا اور اپنے اذن سے انھیں زندہ اور باشعور مخلوق بنادیا۔

راقم کے خیال میں تدریجی تخلیق کا نظریہ قرآن کے الفاظ کے زیادہ قریب ہے۔

3۔ ادنی درجے کا پانی (ماءِ مھین) یعنی مرد کا تولیدی مادہ (مادہ منویہ : Seminal fluid)۔ اس کے سلالہ یعنی نچوڑ اور خلاصہ سے مراد اسپرم (Sperm) ہے جو کہ وہ اصل چیز ہے جو عورت کے بیضہ (Ovum) کے ساتھ ملاپ کرکے انسانی جنین (Embryo) کا ابتدائی خلیہ یعنی زائی گوٹ (Zygote) بناتا ہے۔اگر ماءِ مھین (ادنیٰ درجے کا پانی، بے قدر پانی) سے مرد اور عورت دونوں کا تولیدی مادہ مراد لیں تو ممکن ہے کہ سلالہ کا مطلب خود زائی گوٹ ہی ہو۔ لیکن چونکہ جو چیز مشاہدے میں آتی ہے وہ مرد ہی کا تولیدی مادہ ہے لہٰذا زیادہ قرین قیاس پہلی تشریح ہی معلوم ہوتی ہے۔

4۔اصل میں لفظ ''سوّیٰ'' استعمال ہوا ہے جو کہ ''تسوِیہ'' کے مادے سے ہے۔ اس کا معنی ہے ''کسی چیز کو ٹھیک ٹھیک ایسا بنایا جیسا کہ اُس کے مقصد کے اعتبار سے اُسے ہونا چاہئے تھا'' درست و موزوں کرنا، یا بنانا وغیرہ۔

5۔ ''اپنی روح پھونکی'' یعنی زندگی اور شعور عطا کیا۔ روح پھونکنا خود شعوری کی زندگی عطا کرنے کا علامتی اظہار ہے۔

6۔ دل یعنی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت جسے ہم ذہن کہہ سکتے ہیں۔

یہاں انسان کی تخلیق کے حوالے سے چار اہم نکات بیان کئے گئے ہیں

جنھیں ہم چار مراحل بھی کہہ سکتے ہیں۔ وہ مراحل یہ ہیں:

۱۔مٹی سے انسان کی تخلیق کی ابتدا۔

۲۔جنسی تولید کے ذریعے سے نسلی فروغ۔

۳۔ تسویہ: جسمانی و ذہنی تکمیل اور درستگی۔

۴۔نفخِ روح: خودشعوری عطا کرنا جو جوہر انسانیت ہے۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَسُوْقُ الْمَآءَ اِلَى الْاَرْضِ الْجُرُزِ فَنُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا تَاْكُلُ مِنْهُ اَنْعَامُهُمْ وَاَنْفُسُهُمْ ؕ اَفَلَا يُبْصِرُوْنَ ۝ (32:27)

کیا انھوں نے غور نہیں کیا کہ ہم پانی کو بنجر(1) زمین کی طرف لے جاتے ہیں، پھر اس سے کھیتی اُگاتے ہیں جس سے اُن کے چوپائے بھی کھاتے ہیں اور وہ خود بھی(2)۔ تو کیا یہ بصارت سے کام نہیں لیتے(3)۔

1۔''جرز'' اس زمین کو کہتے ہیں جو ہو تو زرخیز مگر پانی نہ ملنے کی وجہ سے بنجر ہوگئی ہو۔ اللہ تعالیٰ کا نظامِ رحمت بنجر زمین کو پانی سے سیراب کرتا ہے جس کے نتیجے میں اس سے قسم قسم کے نباتات، اور فصلیں اُگتی ہیں۔ ان میں حیوانات کے لئے چارہ بھی ہوتا ہے اور انسانوں کی غذا کا سامان بھی۔

''نسوق الماء'' (ہم پانی کو حرکت دیتے ہیں) سے مراد پانی سے لدے ہوئے بادلوں کو حرکت دینا اور چلانا ہے۔ مگر اس کے لئے وسیع المعنی تعبیر اختیار کی گئی ہے۔ دریاؤں سے پانی سمندروں میں جاتا ہے سمندروں کی سطح سے پانی آبی بخارات بن کر اڑتا ہے جس سے بادل بنتے ہیں۔ یہ بادل ہوا کے دوش پر ایک مقام سے دوسرے مقام پر پہنچتے ہیں اور بارش اور برف وغیرہ کی شکل میں برستے ہیں۔

پہاڑوں کی چوٹیوں پر جمی ہوئی برف پگھلتی ہے تو پانی نیچے کی جانب

حرکت کرتا ہے۔ وغیرہ۔

2۔ ''زرع'' ممکن ہے یہاں وسیع معنی رکھتا ہو اور اس سے مراد ہر قسم کے نباتات ہوں۔

چوپایوں کا ذکر پہلے آیا ہے اس کی وجہ ممکن ہے یہ ہو کہ چوپایوں کی ساری غذا نباتات سے حاصل ہوتی ہے جبکہ انسان کی غذا نباتات کے ساتھ ساتھ حیوانات سے بھی حاصل ہوتی ہے۔ یا یہ کہ نباتات اُگتے ہی چوپایوں کے لئے قابل استفادہ ہوتے ہیں جبکہ انسان کا نباتات سے استفادہ عام طور پر بعد کے زمانہ سے متعلق ہوتا ہے۔ پھر یعنی جب ان پر پھل اور دانے لگتے ہیں۔

3۔ یہ سب اللہ کی ہستی، اور قدرت و حکمت کی نشانیاں ہیں۔

اگر انسان اپنی بصارت سے کام لے تو یہ چیزیں اپنے اندر اللہ تعالیٰ کی معرفت اور پہچان کا وسیع سامان رکھتی ہیں۔

وَاللّٰہُ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ الرِّیٰحَ فَتُثِیْرُ سَحَابًا فَسُقْنٰہُ اِلٰی بَلَدٍ مَّیِّتٍ فَاَحْیَیْنَا بِہِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِھَا ؕ کَذٰلِکَ النُّشُوْرُ ۝ (35:9)

اور اللہ وہی ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے، پس وہ بادلوں کو اٹھاتی ہیں، پھر ہم ان کو چلاتے ہوئے کسی مردہ زمین کی طرف لے جاتے ہیں، پھر ہم اس سے اس کے مردہ ہوجانے کے بعد دوبارہ زندہ کردیتے ہیں، اسی طرح لوگوں کا ازسرِنو زندہ ہوکر اُٹھنا ہے۔

اس آیت کریمہ میں کئی نکات بیان ہوئے ہیں مثلاً:

۱۔ ہواؤں کی گردش۔

۲۔ ہواؤں کا بادلوں کو اُٹھانا اور ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف لے جانا۔

۳۔ بارش برسنا۔

۴۔ بنجر پڑی ہوئی زمین کا پانی ملنے کے بعد ہرا بھرا ہوجانا، پانی سے نباتات کا اُگنا۔

مزید دیکھیں سورہ الروم 30:48۔

وَاللّٰہُ خَلَقَکُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَۃٍ ثُمَّ جَعَلَکُمْ اَزْوَاجًا ؕ وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰی وَلَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِہٖ ؕ وَمَا یُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا یُنْقَصُ مِنْ عُمُرِہٖٓ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ ؕ اِنَّ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیْرٌ ۝ (35:11)

اور اللہ نے تمہیں مٹی سے تخلیق کیا[1]، پھر نطفہ[2] سے۔ اور یہ کہ تمہیں جوڑے جوڑے بنایا[3]۔ اور یہ کہ کوئی عورت نہ حمل سے ہوتی ہے اور نہ جنتی ہے مگر اس کے علم سے[4]۔ کسی عمر والے کی عمر میں نہ اضافہ ہوتا ہے اور نہ کمی مگر (اس کی تفصیل) ایک کتاب میں (درج) ہے[5]۔ بیشک یہ سب اللہ کے لئے بالکل آسان ہے۔

1۔تراب: مٹی، خاک، یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی دلیل ہے کہ اُس نے بے جان مادے سے انسان پیدا فرمایا۔ مزید دیکھیں سورہ الحج 25:5۔

2۔ تشریح کے لئے دیکھیں سورہ المومنون 23:12-14۔

3۔ انسان کا جوڑے جوڑے یعنی مرد اور عورت ہونا اللہ کی قدرت کی عظیم نشانی ہے۔ مرد اور عورت جسمانی لحاظ سے ایک دوسرے سے بہت سے اختلافات رکھتے ہیں، اس کی بنیادی وجہ کا تعلق ان کے توارثی عوامل یا جینز (Genes) سے ہے۔ توارثی یا جینیاتی اعتبار سے جنس یا صنف (Sex) کا تعین اسپرم کے اووم کے ساتھ ملاپ (باروری) کے ساتھ ہی ہوجاتا ہے۔ لیکن جنین (Embryo) میں تقریباً چالیس دن تک نر اور مادہ کے جنسی خلئے ایک جیسے ہوتے ہیں یعنی اب تک ظاہری طور پر یہ امتیاز نہیں ہوتا کہ جنین مرد کا ہے یا عورت کا۔ دوسرے لفظوں میں چالیس یا اس کے لگ بھگ ایام کے جنین کے جنسی اعضا (Gonads) میں بالقوہ طور پر نر اور مادہ تولیدی اعضا میں سے کسی کے بھی بننے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ لیکن اس کے بعد دونوں میں فرق پیدا ہوجاتا ہے۔

4۔ رحمِ مادر میں باروری (Fertilization یعنی اسپرم اور اووم کا ملاپ)، استقرارِ حمل (Implantation) اور جنین کی نشوونما اور بالیدگی (Growth) اور بالآخر ایک معین مدت کے بعد پیدائش ایک قانون کے مطابق ہوتی ہے۔

5۔ ''معمر''، ''عمر'' کے مادے سے ہے۔ اسی سے لفظ عمارت ہے جو

کہ آباد کرنے اور بسانے کے معنوں میں ہے۔ انسان کی مدتِ حیات کو عمر اس لئے کہتے ہیں کہ اُس کے جسم کی عمارت یعنی آبادی اسی مدت میں ہے۔

کوئی شخص لمبی عمر نہیں پاتا اور نہ کسی کی عمر میں کمی ہوتی ہے مگر یہ سب اللہ تعالیٰ کے ''علم کی کتاب'' میں ثبت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارادہ اور مشیت اس نظام کو کنٹرول کرتی ہے۔

وَمَا يَسْتَوِي الْبَحْرٰنِ ۖ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ سَآئِغٌ شَرَابُهٗ وَهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ ؕ وَمِنْ كُلٍّ تَاْكُلُوْنَ لَحْمًا طَرِيًّا وَّ تَسْتَخْرِجُوْنَ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا ۚ وَتَرَى الْفُلْكَ فِيْهِ مَوَاخِرَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ (35:12)

دو بحر[1] یکساں نہیں: یہ (ایک) میٹھا، پیاس بجھانے والا، پینے کے لئے خوشگوار اور یہ (دوسرا) کھاری، کڑوا۔ اور دونوں[2] سے تم تازہ گوشت کھاتے ہو[3]، اور زینت کی چیز نکالتے ہو جسے تم پہنتے ہو[4]، اور تم کشتیوں کو دیکھتے ہو کہ اس (پانی) میں پھاڑتی ہوئی چلتی ہیں[5]۔ تاکہ تم اُس کے فضل کے طالب بنو، اور تاکہ تم شکر گزار بنو[6]۔

1۔ یہاں ''بحر'' کا لفظ استعمال ہوا ہے، اردو میں عام طور پر بحر کا معنی سمندر یا دریا کیا گیا ہے جب کہ عربی زبان میں بحر کا بنیادی معنی ہے پانی کا عظیم اور وسیع ذخیرہ چاہے میٹھا ہو یا کھاری (لسان العرب)۔ اس اعتبار سے بحر دریا کو بھی کہہ سکتے ہیں اور سمندر کو بھی۔

زمین پر دو قسم کے پانی ہیں: میٹھا اور نمکین۔
میٹھا پانی (Fresh water) دریاؤں، جھیلوں، چشموں اور کنوؤں کی شکل میں ہے جب کہ نمکین پانی (Salt water) سمندروں کی شکل میں۔ آیت میں جن دو بحروں یعنی پانی کے عظیم ذخیروں (Great bodies of water) کا ذکر ہے، اس سے مراد پانی کی یہی دو قسمیں ہیں۔ پانی کی یہ قسمیں آبی چکر (Water cycle) کے نظام کے ذریعے منسلک ہیں۔ (مزید دیکھیں سورہ الفرقان 25:53 نوٹ 1۔)

2۔ سمندروں (اور دریاؤں) کے تین اہم فائدوں کی طرف انسان کی توجہ مبذول کرائی جارہی ہے:

۱۔ تازہ گوشت یعنی غذا۔

۲۔زیب و زینت کا سامان اور

۳۔نقل و حمل (Transportation)۔

3۔ قرآن نے ''لحما طریا'' (تازہ گوشت) کے الفاظ استعمال کر کے سمندری غذا (Sea food) کی اہمیت کو اُجاگر کیا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ دورِ جدید میں آبادی میں روز افزوں اضافہ کے ساتھ سمندری غذا کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے اور مستقبل میں اس پر انسان کا انحصار ممکنہ طور پر اور بھی بڑھ جائے گا۔

4۔ انسان ایک ایسی مخلوق ہے جو گہرا جمالیاتی ذوق رکھتی ہے۔ یہی وہ ذوق ہے جو زیبائش و آرائش، آرٹ، فن اور ادب کا سر چشمہ ہے۔ اس ذوق کو اگر ہر قسم کے افراط و تفریط سے بچتے ہوئے صحیح صورت میں بروئے کار لایا جائے تو یہ انسان کی زندگی کو نکھارتا اور اُسے خوشیوں سے مالا مال کرتا ہے۔ آیت کے اس ٹکڑے سے پتا چلتا ہے کہ قرآن مثبت جمالیاتی ذوق کو بیدار کرنا چاہتا ہے۔

سمندروں میں زیب و زینت کا سامان مختلف اقسام کے موتیوں اور سیپیوں وغیرہ کی شکل میں موجود ہے، اس کے علاوہ سمندری پانی میں سونا اور دوسرے قیمتی کیمیائی اجزاء بھی پائے جاتے ہیں۔ مستقبل میں ممکن ہے کہ سمندروں کی تہوں سے اس قبیل کی اور اشیاء بھی دریافت کرلی جائیں۔

5۔ انسانی تمدن میں بحری سفر کی اہمیت بہت زیادہ ہے، سمندروں نے سطح زمین کے تقریباً 70 فیصد حصہ کو گھیرا ہوا ہے۔ یہ آپس میں ملے ہوئے بھی ہیں۔نقل و حمل کے لئے سمندر بہت اہم ذریعہ ہیں جس کا مقابلہ کوئی دوسرا ذریعہ

نہیں کرسکتا۔ ایک بحری جہاز ہزاروں ٹرکوں کے برابر بوجھ اٹھا کر لے جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر آج کے زمانہ میں لاکھوں ٹن تیل ایک جہاز کے ذریعے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جاسکتا ہے۔

6۔ سمندروں کے اور بھی فائدے ہیں مثلاً بادل ان کی تبخیر سے بنتے ہیں۔ ان کی تہوں سے تیل اور دوسری چیزیں حاصل کی جاسکتی ہیں۔

''تاکہ تم اس کے فضل کے طالب بنو'' یہ جملہ بہت وسیع معنی رکھتا ہے۔ اس میں غذائی، اقتصادی اور دوسرے فائدے شامل ہیں جو سمندر کے ذریعے حاصل ہوسکتے ہیں بشمول نقل و حمل کے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا ؕ وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌۢ بِيْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَغَرَابِيْبُ سُوْدٌ ○ وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَالْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ ؕ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ غَفُوْرٌ ○

(35:27-28)

کیا تم نے غور نہیں کیا کہ بے شک اللہ نے آسمان سے پانی اُتارا(1)۔ پس ہم نے اس سے مختلف رنگوں کے پھل پیدا کیے(2)۔ اور پہاڑوں میں بھی رنگ برنگ دھاریاں ہیں کوئی سفید، کوئی سرخ مختلف رنگوں میں (کوئی شوخ کوئی مدہم)، اور کوئی سخت سیاہ(3)۔ اور انسانوں اور (دوسرے) جانداروں اور چوپایوں کے بھی اسی طرح مختلف رنگ ہیں(4)۔ کوئی شک نہیں کہ اللہ

سے اس کے بندوں میں سے (حقیقی معنوں میں)
ڈرنے والے وہی ہیں جو علم رکھنے والے ہیں۔ بیشک
اللہ غالب اور بخشنے والا ہے۔

1۔ ''آسمان'' ، اوپر کی فضا، بلندی، بادل۔ اس جملہ کا سوالیہ انداز انسان میں تلاش وجستجو کی حس کو تحریک دے رہا ہے۔ ملاحظہ کریں کہ ان آیات میں موجوداتِ عالم کی رنگارنگی، بوقلمونی اور تنوع کو بیان کیا گیا ہے۔ خالق کائنات نے معین و محدود عناصر و اجزا سے کثرت سے قسم قسم کی اشیأ تخلیق کی ہیں۔

2۔ اس سے ظاہری رنگ بھی مراد ہوسکتا ہے یعنی جُدا جُدا رنگوں کے پھل۔ ہم جانتے ہیں کہ مختلف اقسام کے پھلوں کے مختلف رنگ ہوتے ہیں علاوہ ازیں ایک ہی قسم کے پھل میں بھی کئی قسم کے رنگ ہوتے ہیں اور رنگوں کے کئی شیڈز (Shades) پائے جاتے ہیں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ رنگ کا لفظ یہاں قِسم (Type یا Kind) کے معنوں میں استعمال ہوا ہو۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ دُنیا میں بے شمار اقسام کے پھل پائے جاتے ہیں۔ بلکہ ایک ہی پھل کی کئی کئی اقسام پائی جاتی ہیں۔ مثلاً کھجور کی ستر سے زاید قسمیں پائی جاتی ہیں۔

3۔ ''جدد'' ، '' جدہ'' کی جمع ہے۔ اس کا معنی ہے راستے، دھاریاں وغیرہ اس کا ایک معنی تو یہ ہے کہ پہاڑوں میں مختلف رنگوں کے راستے ہوتے ہیں۔ یہ مختلف رنگ راستوں کی پہچان کا کام دیتے ہیں۔

اللہ ہی ہے جو آسمانوں اور زمین کو روکے ہوئے
ہے کہ وہ اپنی جگہ سے سرک نہ جائیں اور اگر وہ
سرکنے لگیں تو اللہ کے بعد کوئی اور ان کو تھامنے والا
نہیں بن سکتا۔ بے شک وہ بڑا حلم والا (اور) بخشنے
والا ہے۔

کائنات اللہ تعالیٰ کے حکم، اس کی مشیت اور ارادہ سے قائم ہے، اگر یہ اس کے ارادہ کے مطابق اپنی جگہ سے ٹلنے لگے تو اللہ کے بغیر کوئی طاقت ور ہستی نہیں جو گرتے ہوئے آسمان اور زمین کو سنبھال سکے۔

اللہ تعالیٰ کی مشیت نے کہکشاؤں، ستاروں، سیاروں اور دوسرے اجرامِ سماوی پر مشتمل پورے کائناتی نظام کو اپنے مداروں پر قائم رکھا ہوا ہے، انھیں قانون کی زنجیر کے ساتھ باندھا ہوا ہے کہ وہ اپنے مقام سے انحراف نہیں کرسکتے۔ تمام اجرامِ سماوی ایک قانون کے پابند ہیں اربوں سالوں سے وہ اس نظام کے بندھن میں مستقل طور پر بندھے ہوئے رواں دواں ہیں اس میں ذرہ برابر بھی انحراف نہیں آیا۔

کائنات کی حفاظت کا مطلب ہے اس فیض کو جاری رکھنا جو خالق سے مخلوق کو پہنچ رہا ہے۔ مخلوق کو اپنی بقا کے لئے ہر آن اپنے خالق کے سہارے کی ضرورت ہے۔ اگر وہ ایک لمحے کے لئے بھی اپنا فیض روک لے تو تمام کائنات تباہ و برباد ہوجائے۔

سماوی اجسام قوتِ تجاذب اور حرکت کی وجہ سے پیدا ہونے والی مرکز گریز قوت یا قوتِ دافع کے درمیان توازن کے باعث اپنے اپنے مداروں پر رہتے ہوئے رواں ہیں۔
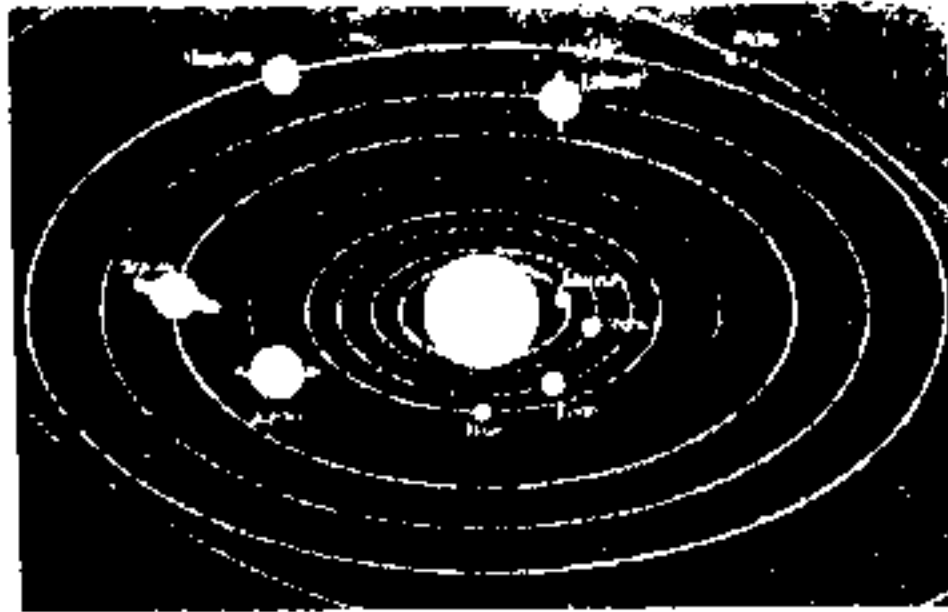
وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَيْتَةُ ۚۖ اَحْيَيْنٰهَا وَاَخْرَجْنَا مِنْهَا حَبًّا فَمِنْهُ يَاْكُلُوْنَ ○ وَجَعَلْنَا فِيْهَا جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ وَّفَجَّرْنَا فِيْهَا مِنَ الْعُيُوْنِ ۙ○ لِيَاْكُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖ ۙ وَمَا عَمِلَتْهُ اَيْدِيْهِمْ ۭ اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ ○

(36:33-35)

اور ان (لوگوں) کے لئے (قدرتِ الٰہی کی) ایک نشانی مردہ زمین ہے[1]۔ ہم نے اُسے زندہ کیا، اور اس سے غلّہ اُگایا۔ پس اس میں سے وہ کھاتے ہیں۔ اور ہم نے اس میں کھجوروں اور انگوروں کے باغ اُگائے[2] اور اس میں چشمے جاری کئے تاکہ وہ اس کے پھل کھائیں[3]، اور یہ اُن کے ہاتھوں کی کارگزاری نہیں ہے[4]۔ تو کیا وہ شکر نہیں کرتے۔

1۔ یہ اللہ تعالیٰ کی ہستی اور قدرت کی واضح نشانی ہے کہ ایک زمین جو بنجر پڑی ہوتی ہے، اس پر بارش برستی ہے یا اُسے دوسرے ذرائع سے پانی ملتا ہے تو اس میں طرح طرح کے اناج، پھل اور سبزیاں اُگتی ہیں۔ جن سے غذا بھی حاصل ہوتی ہے اور دوسرے فوائد بھی۔

2۔ کھجوروں اور انگوروں کا نام لے کر ذکر ہوا ہے، یہ پھلوں کے عمدہ اور مثالی نمونے ہیں جن میں انسانی جسم کی نشوونما، بالیدگی اور قدرتی توانائی کے لئے درکار غذائی مواد ہوتا ہے۔ کھجوروں اور انگوروں کے لئے جمع کے صیغے استعمال

ہوئے ہیں۔ ممکن ہے یہ ان دونوں کی انواع اقسام کی طرف اشارہ ہو کیونکہ ان میں سے ہر ایک کی کئی کئی اقسام ہیں۔

ایک بات اور ملاحظہ کریں، انگوروں کے لئے ''اعناب'' کا لفظ استعمال ہوا ہے جو عام طور پر انگور کے پھل کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ انگور کے پودے کے لئے یہ لفظ شاذ و نادر ہی استعمال ہوتا ہے جب کہ کھجوروں کے لئے ''نخیل'' کا لفظ استعمال ہوا ہے جو کھجور کے درخت کے لئے استعمال ہوتا ہے (کھجور کے پھل کو ''رطب'' (تازہ کھجور) اور ''تمر'' (خشک کھجور) کو کہا جاتا ہے)۔ اس کی تعبیر ممکن ہے کہ یہ ہو کہ انگور کا پودا عام طور پر اس کے پھل کے لئے ہی مطلوب ہوتا ہے۔ اس کے تنے، شاخوں اور دوسرے حصوں کا کوئی زیادہ مصرف نہیں ہے جب کہ کھجور کا ہر حصہ کوئی نہ کوئی مصرف رکھتا ہے اگرچہ اس کا پھل ان سب میں اہم ترین ہے۔

3۔ یہاں چشمے جاری کرنے کا ذکر اس طرف اشارہ ہوسکتا ہے کہ بہت سی نباتات کے لئے اکیلا بارش کا پانی ہی کافی ہوتا ہے جبکہ پھل دار درختوں کو عام طور پر مزید پانی کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔

4۔ بہت سے پھل بلکہ اکثر پھل ایسے ہوتے ہیں جو درختوں پر ہی پک جاتے اور کھانے کے قابل ہوجاتے ہیں ان پر کسی دوسرے عمل کی ضرورت نہیں ہوتی۔ مزید براں، پھلوں پر مضبوط جھلی ہوتی ہے جو ان کی حفاظت کرتی اور دیر تک محفوظ رکھتی ہے۔ یہ گویا اللہ تعالیٰ کے دست قدرت کی کی گئی ''پیکنگ'' ہے جو ان کی غذائیت کی حفاظت کرتی اور اُسے ضائع ہونے سے بچاتی ہے۔

سُبۡحٰنَ الَّذِیۡ خَلَقَ الۡاَزۡوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنۡۢبِتُ الۡاَرۡضُ وَمِنۡ اَنۡفُسِهِمۡ وَمِمَّا لَا يَعۡلَمُوۡنَ ۝
(36:36)

پاک ہے وہ ذات جس نے جوڑے پیدا کئے ان چیزوں میں سے بھی جنھیں زمین اُگاتی ہے اور خود ان کے وجودوں میں سے بھی اور اُن چیزوں میں سے بھی

جنھیں وہ نہیں جانتے۔

اس آیت کریمہ میں اس حقیقت کو منکشف کیا جارہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پودوں میں بھی نر اور مادہ بنائے ہیں، انسانوں میں بھی، اور ان چیزوں میں بھی جوڑے پیدا کئے ہیں جنھیں انسان نزول قرآن کے زمانہ میں نہیں جانتا تھا یا آج بھی نہیں جانتا۔

''ازواج''، ''زوج'' کی جمع ہے۔ اس کا معنی جوڑا بھی ہے اور قسم بھی۔ علاوہ ازیں زوج کا لفظ ''دو چیزوں کے جوڑے'' کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے اور جوڑے کے ایک رکن کے لئے بھی، مثلاً میاں بیوی ایک زوج ہیں اور یہ بھی کہ میاں بیوی کا زوج ہے اور بیوی میاں کی زوج ہے۔

مزید براں، یہ صرف صنفی جوڑے کے معنی ہی میں استعمال نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کا اطلاق کوئی سی بھی دو ایسی اشیاء پر ہوسکتا ہے جو کسی نہ کسی اعتبار سے ایک دوسرے کے ساتھ کوئی نسبت رکھتی ہوں یہاں تک کہ ایک دوسرے کی ضد ہوں۔ مثلاً دو جوتے، دروازے کے دو کواڑ، وغیرہ۔

قرآن مجید نے اس آیت میں زوجیت (جوڑے جوڑے ہونے) کے اعتبار سے تین قسم کی چیزوں کا ذکر کیا ہے:

۱۔وہ چیزیں جنھیں زمین اگاتی ہے یعنی نباتات

۲۔انسان

۳۔دوسرے موجودات جن سے لوگ آگاہ نہیں ہیں۔

پودوں میں نر و مادہ کا وجود اب ایک سائنسی حقیقت ہے۔ نزول قرآن کے زمانہ میں بعض پودوں مثلاً کھجور کے بارے میں لوگوں کو علم تھا کہ ان میں نر اور مادہ پائے جاتے ہیں۔ لیکن یہ بات ایک عمومی کلیہ (Generalization) کے طور پر معلوم نہ تھی۔

انسانوں میں نر اور مادہ، مرد اور عورت کا وجود ایک کھلی حقیقت ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ دوسرے موجودات سے قرآن کی کیا مراد ہے۔

دُنیا کی قریب قریب سبھی اشیاء میں زوجیت (جوڑوں کی شکل میں ہونا)

پائی جاتی ہے۔ بہت سی اشیاء اور ان میں زوجیت کے وجود سے نزولِ قرآن کے زمانہ میں لوگ آگاہ نہ تھے۔ مگر آج ہیں،اسی طرح بے شمار چیزیں ایسی ہوسکتی ہیں جن سے آج کے لوگ بھی آگاہ نہیں ہیں۔جو چیزیں آج کے زمانہ میں معلوم ہیں اُن میں مادہ اور ضد مادہ (Matter and antimatter)، ایٹم کے اندر موجود مثبت اور منفی ذرے (پروٹان اور الیکٹران)۔ مقناطیس کے دو سِرے، تیزاب اور اساس (Acids and bases)، مثبت آئن اور منفی آئن (Positive ion and negative ion)، وغیرہ ہے۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ یہ آیت اُن آیات میں سے ایک ہے جو انسانی علم کے محدود ہونے کو بیان کرتی ہے اور بتاتی ہے کہ کائنات میں بہت سے حقائق ایسے ہو سکتے ہیں جو ہمارے علم میں ابھی تک نہیں آئے اور شاید کبھی نہ آئیں۔

وَاٰيَةٌ لَّهُمُ
الَّيْلُ ۖ نَسْلَخُ مِنْهُ النَّهَارَ فَاِذَا هُمْ مُّظْلِمُوْنَ ۙ
وَالشَّمْسُ تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ۭ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ
الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ۝ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ
حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ ۝ لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ
لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ۭ
وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ۝ وَاٰيَةٌ لَّهُمْ اَنَّا حَمَلْنَا
ذُرِّيَّتَهُمْ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ۙ وَخَلَقْنَا لَهُمْ
مِّنْ مِّثْلِهٖ مَا يَرْكَبُوْنَ ۝ (36:37-42)

اور ان کے لئے (ہماری قدرت کی) ایک نشانی رات ہے، ہم اس سے دن کو کھینچ لیتے ہیں[1] پس وہ اندھیرے میں رہ جاتے ہیں۔

اور سورج اپنے مقررہ ٹھکانے[2] کی طرف چلتا

ہے۔ یہ زبردست قوت والے، علم والے کا حساب و
انداز ہ ہے۔
اور چاند کے لیئے ہم نے منزلیں ٹھہرا دی ہیں
یہاں تک کہ وہ کھجور کی پرانی شاخ کے مانند ہو کر رہ
جاتا ہے[3]۔

نہ سورج کے بس میں ہے کہ وہ چاند کو جا
پکڑے اور نہ رات دن پر سبقت کرسکتی ہے۔ سب
اپنے اپنے مدار میں تیر رہے ہیں[4]۔

اور ان کے لئے ایک نشانی یہ ہے کہ ہم نے ان
کی نسل کو بھری ہوئی کشتی میں سوار کیا ہے[5]، اور ان
کے لئے اس کی مانند اور چیزیں پیدا کی ہیں جن پر وہ
سوار ہوتے ہیں[6]۔

1۔"نسلخ" ، "سلخ" کے مادے سے ہے، یہ بھیڑ بکری وغیرہ کو ذبح کرکے اس کی کھال اُتارنے کو کہتے ہیں۔ رات اور دن کی تبدیلی کو یہاں ایک خوبصورت مثال سے سمجھایا گیا ہے، دن کے وقت دنیا روشنی کا سفید لباس پہنے ہوتی ہے جب رات آتی ہے تو یہ آہستہ آہستہ اتر جاتا ہے اور ہر طرف اندھیر پھیل جاتا ہے۔ اس تعبیر کے بارے میں غور و خوض کرنے پر یہ نکتہ سامنے آتا ہے کہ زمین کی اصل فطرت تاریکی ہے روشنی اس کی ایک عارضی صفت ہے جو ایک دوسرے منبع سے اُسے دی جاتی ہے اس لباس کی طرح کہ جو کسی کے بدن پر پہناتے ہیں۔ جب لباس اُتار دیا جاتا ہے تو بدن کا اصلی روپ ظاہر ہوجاتا ہے۔

2۔سورج اپنے مقررہ ٹھکانے کی طرف رواں ہے: ''ٹھکانے'' سے کیا مراد ہے۔ اس کا ایک مفہوم وہ مدار ہے جس پر سورج رواں دواں رہتا ہے۔ آج ہمیں معلوم ہے کہ سورج اپنے پورے نظام (Solar System) کے ساتھ اپنی کہکشاں میں تیزی سے حرکت کررہا ہے۔

اس سے سورج کا اختتام بھی مراد ہوسکتا ہے مطلب یہ ہوگا کہ سورج اپنی "زندگی" کے آخری لمحے تک رواں دواں ہے۔ یہ چلتا رہے گا حتیٰ کہ اس کا آخری وقت آجائے۔ یہ بات بھی ایک سائنسی حقیقت ہے کہ سورج میں ہائیڈروجن گیس سرلزائی تعاملات سے گزر رہی ہے ایک وقت آئے گا جب تمام ہائیڈروجن ختم ہوجائے گی اور سورج بجھ جائے گا۔ سورج کے انجام کے بارے میں جدید سائنسی نظریہ کے لئے دیکھیں راقم کی کتاب "کائنات قرآن اور سائنس")۔

یہ اللہ زبردست قوت والے، علم والے کی مشیت ہی کا کرشمہ ہے کہ سورج جیسا عظیم وجود خلا میں پورے حساب کے ساتھ رواں دواں ہے۔

3۔ چاند زمین کے گرد گردش کرتا ہے، اس دوران وہ سورج کی روشنی کو منعکس کرتا ہے۔ زمینی مشاہدہ کے اعتبار سے اس کا روشن حصہ گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔
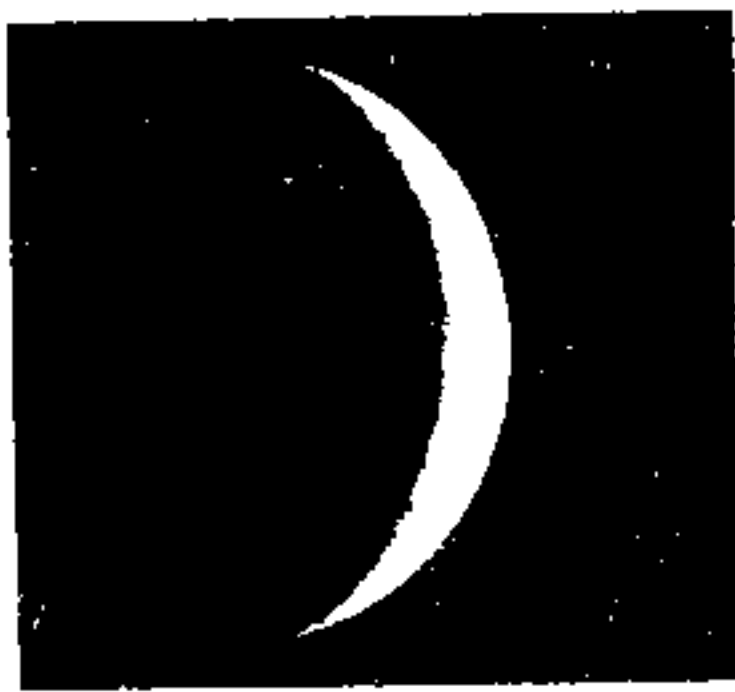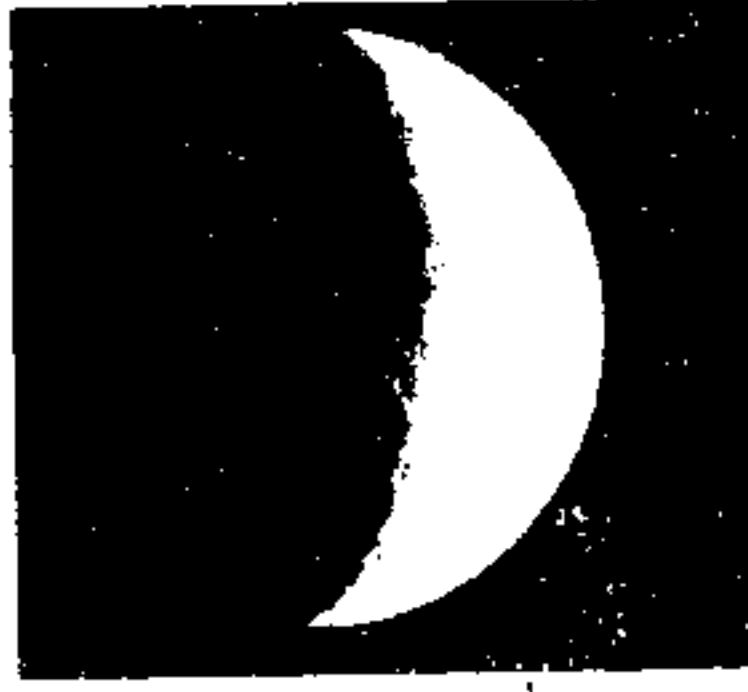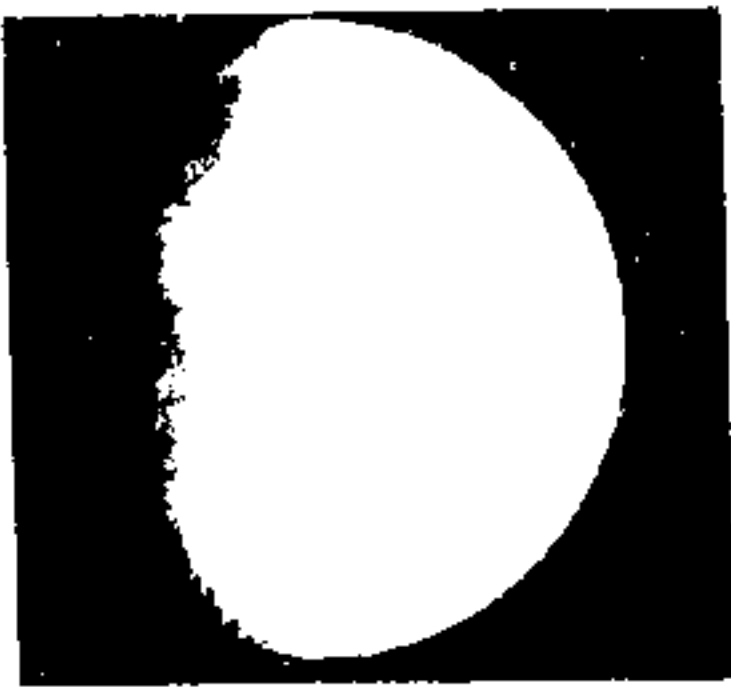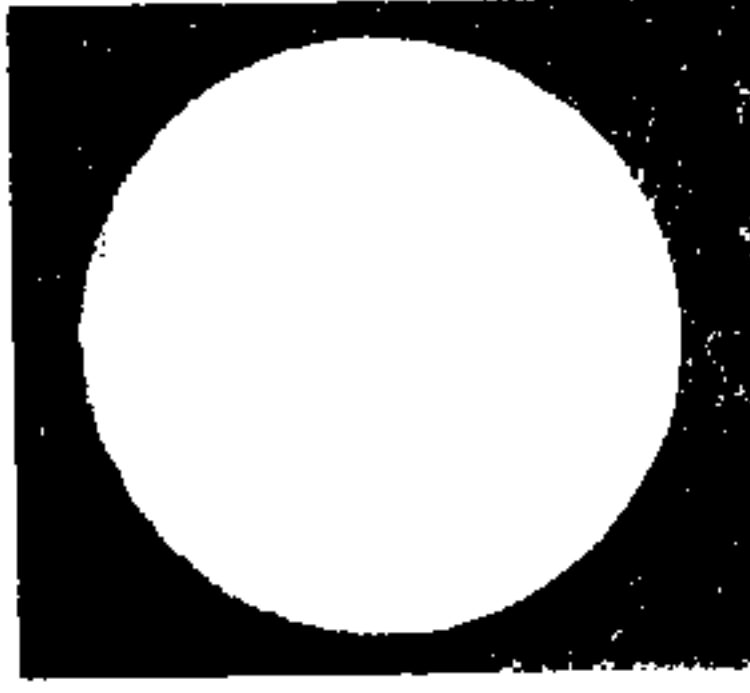
چاند کی منزلیں (فوٹو)

چاند کی منزلوں کے لئے دیکھیں سورہ یونس 10:5 نوٹ 2۔

یہ منزلیں مکمل طور پر حساب شدہ ہیں۔ اس حد تک کہ ماہرین فلکیات سینکڑوں سال بعد کی پیشن گوئیاں کرسکتے ہیں۔ یہ ایک "آسمانی گھڑی" ہے جس سے عوام اور خواص سب دنوں اور مہینوں کا حساب کرسکتے ہیں۔ جو لوگ تجربہ

رکھتے ہیں وہ چاند کے مشاہدے سے یہ بتا سکتے ہیں کہ یہ مہینے کی کون سی تاریخ کا چاند ہے۔

چاند کی منازل
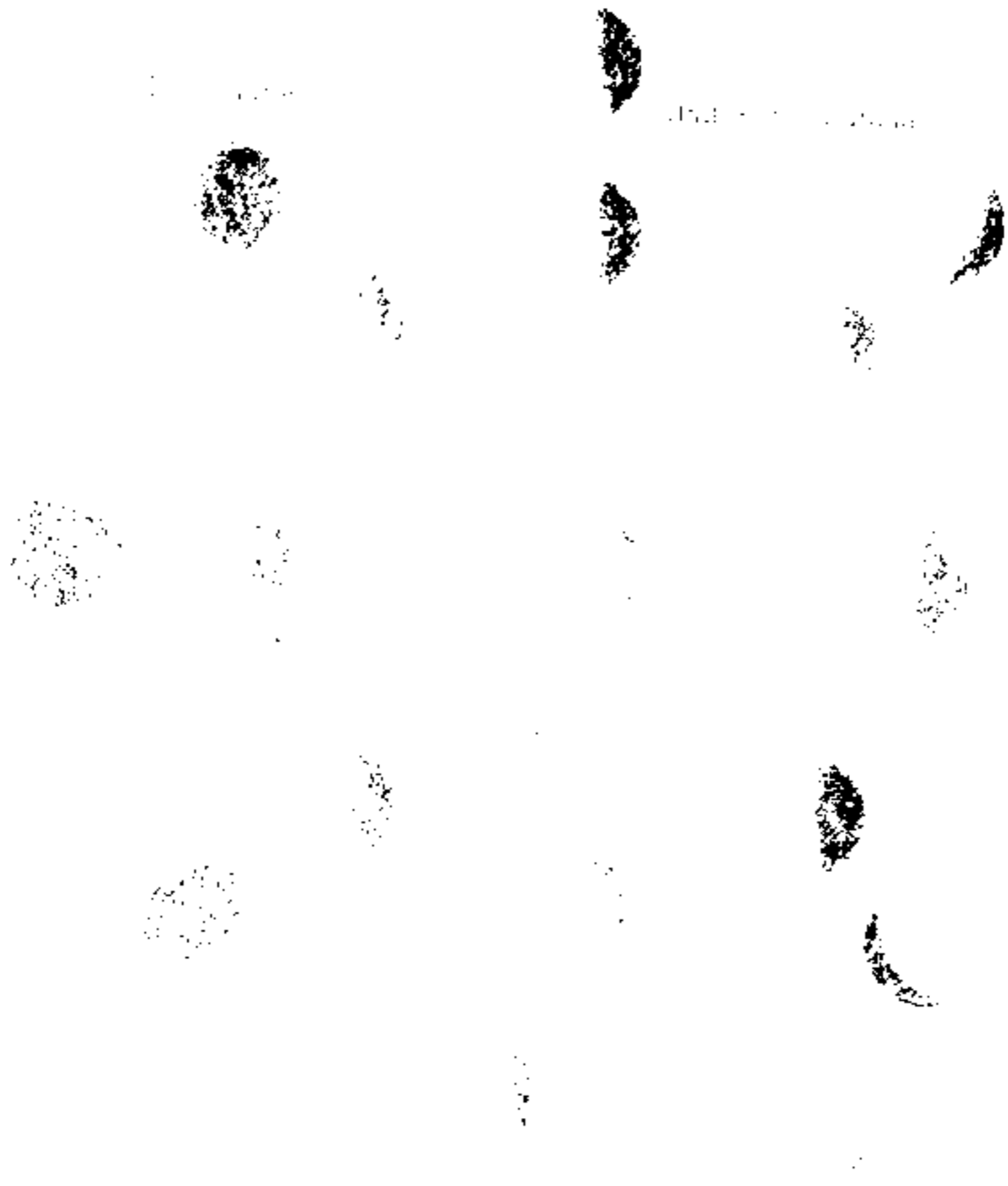
مہینے کے آغاز میں ہلال کی نوکیں اوپر کی طرف ہوتی ہیں۔ پھر رفتہ رفتہ اس کی جسامت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ ساتویں دن تک پورے چاند کا آدھا دائرہ ظاہر ہوجاتا ہے۔ پھر اس میں اضافہ ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ چودھویں رات کو بدر کامل کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس کے بعد یہ پچھلی طرف سے گھٹنا شروع ہوتا ہے اکیسویں رات تک کم ہوتے ہوتے آدھے دائرے کی شکل میں نظر آتا ہے۔ اسی طرح اس میں کمی ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ اٹھائیسویں رات کو وہ مدہم ہلال کی شکل میں نظر آتا ہے۔ اب اس کی نوکیں نیچے کی طرف ہوتی ہیں۔

''عرجون'' کھجور کی وہ شاخ جس کے ساتھ اس کا خوشہ لگا ہوتا ہے۔ جب خوشے کو کاٹتے ہیں تو یہ درخت کے ساتھ باقی رہ جاتی ہے۔ یہ کمان کی طرح خمدار ہوتی ہے۔ جب خشک ہوجاتی ہے تو مہینے کے آخر کے ہلال کی طرح نظر آتی ہے جو کہ آسمان میں صبح کے وقت مشرق کی طرف ظاہر ہوتا ہے۔

جس قدر یہ پرانی ہوتی ہے اسی قدر زیادہ باریک اور زرد رنگ ہوجاتی ہے اور آخرِ ماہ کے ہلال کے ساتھ زیادہ مشابہ ہوتی ہے۔

مہینے کے آخر کے چاند اور عرجونِ قدیم کے درمیان مشابہت کئی جہتوں سے ہوتی ہے:

باریک اور خمدار ہونے کے لحاظ سے۔ نوکوں کے نیچے کی طرف ہونے کے لحاظ سے۔ زردی مائل رنگت کے لحاظ سے۔ پھر یہ کہ آخرِ ماہ کا چاند رات کے آخری حصہ میں سیاہ رنگ کے آسمان کے پسِ منظر میں زرد رنگ کی ایک کمان کی شکل میں نظر آتا ہے جس کی نوکیں نیچے کی طرف ہوتی ہیں، اسی طرح عرجونِ قدیم سبز رنگ کی شاخوں اور پتوں کے درمیان زرد رنگ کی کمان کی طرح نظر آتا ہے۔

آپ نے دیکھا کہ دوتین لفظوں کی ایک چھوٹی سی تعبیر میں کتنی باریکیاں ہیں۔

4۔ سورج، چاند اور دیگر اجرامِ سماوی اپنے اپنے مداروں میں گردش کررہے ہیں۔ سورج جسامت میں چاند سے بہت بڑا ہے مگر اس کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ چاند کو جذب کرلے۔

چاند زمین کا نواحیہ (Satellite) ہے جو تیزی کے ساتھ زمین کے گرد گردش کررہا ہے اور زمین تیزی کے ساتھ سورج کے گرد گردش کررہی ہے۔ ان کی تیز رفتار گردش ان کو وہ مزکز گریز قوت (centrifugal force) دیتی ہے جس کی بنا پر یہ سورج کی قوتِ تجاذب کو متوازن (Balance) کرتے ہیں اور یوں اپنے مدار پر رہتے ہوئے رواں دواں ہیں۔

اسی طرح رات اور دن ایک دوسرے کے پیچھے ایک نظام کے مطابق رواں دواں ہیں۔ رات کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ دن پر سبقت لے لے اور وقت مقررہ سے پہلے آجائے یا دنوں کو مکمل طور پر ختم ہی کردے۔ یعنی زمیں ایک حساب کے مطابق محوری گردش کررہی ہے۔ اس کی ایک معین رفتار ہے۔

اللہ تعالیٰ کے نظام نے کائنات کے چھوٹے بڑے تمام موجودات کو قائم رکھا ہوا ہے۔

5۔''فلکِ مشحون'' وہ کشتی جو سواریوں اور سامان سے بھری ہو۔

اس سے مراد حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی بھی ہوسکتی ہے۔ تاہم اس سے کوئی بھی کشتی مراد لے سکتے ہیں۔ اس اعتبار سے مطلب ہوگا کہ یہ اللہ ہی کی کار فرمائی ہے کہ سمندروں کی سطح پر سامان اور سواریوں سے بھری ہوئی کشتی چلتی ہے۔ جس پر لوگ سفر کرتے ہیں۔

''ذریہ'' اصل میں چھوٹی اولاد کو کہتے ہیں اگرچہ بعض اوقات اس کا اطلاق تمام چھوٹی بڑی اولاد پر بھی ہوتا ہے۔ یہاں ہوسکتا ہے کہ یہ لفظ ''نسل انسانی'' کے معنی میں ہو۔ اس اعتبار سے مفہوم ہوگا۔''ہم نے نسل انسانی کو کشتی میں سوار کیا، یعنی انھیں یہ صلاحیت دی کہ وہ کشتی بناتے اور اس میں سوار ہوتے اور سفر کرتے ہیں۔لفظ ''مشحون'' (بھری ہوئی) اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ نہ صرف انسان خود بلکہ ان کے مالِ تجارت اور ضروریاتِ زندگی کی نقل و حمل بھی اس کے ذریعے ہوتی ہے۔

6۔ یہ قرآن کا عظیم انکشاف اور سائنسی معجزہ ہے۔ وہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے جدید دور سے چودہ سو سال قبل ''دوسری'' سواریوں کی خلقت کا اعلان کر رہا ہے۔

کشتی کی مانند اور چیزیں پیدا کیں جن پر لوگ سوار ہوتے ہیں۔اس میں خشکی، تری، فضا حتیٰ کہ خلاء کی تمام سواریاں شامل ہیں۔

جدید دور میں نقل و حمل کے تمام ذرائع نے بہت ترقی کرلی ہے جس کی وجہ سے دنیا نے سکڑ کر ایک گاؤں کی حیثیت اختیار کرلی ہے۔ مستقبل میں انسان نہ جانے اور کیا کیا بنانے میں کامیاب ہوجائے گا۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِّمَّا عَمِلَتْ اَيْدِيْنَآ اَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مٰلِكُوْنَ۝ وَذَلَّلْنٰهَا لَهُمْ فَمِنْهَا رَكُوْبُهُمْ وَمِنْهَا يَاْكُلُوْنَ۝ وَلَهُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ وَمَشَارِبُ ؕ اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ۝ (36:71-73)

کیا ان لوگوں نے غور نہیں کیا کہ جو چیزیں ہم

اپنے دست قدرت سے روبہ عمل لائے ہیں ان میں ہم
نے ان کے لئے چوپائے پیدا کیے ہیں، پس وہ اُن
کے مالک ہیں۔ ہم نے انھیں اُن کا فرمانبردار بنادیا
ہے پس ان میں سے بعض پر وہ سوار ہوتے ہیں، اور
بعض سے وہ غذا حاصل کرتے ہیں، اور ان میں اُن
کے لئے دوسرے فائدے اور پینے کی چیزیں بھی
ہیں۔تو کیا وہ شکر ادا نہیں کریں گے؟

ان آیات میں اللہ تعالیٰ کی گوناگوں نعمتوں میں سے چوپایوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے دستِ قدرت نے انھیں پیدا کیا اور اپنے لطف و کرم سے اُس نے انھیں انسان کا مطیع و فرمانبردار بنادیا۔ انسان ان سے طرح طرح کے فائدے اٹھاتا ہے۔

الف: بعض حیوانات سواری اور بار برداری کے کام آتے ہیں۔

ب:بعض سے انسان اپنی غذا حاصل کرتا ہے۔

ج: حیوانات کے اور بھی بہت سے فائدے ہیں، ان کی اون، بالوں اور چمڑے سے لباس اور پہننے کی دوسری چیزیں (مثلاً، جوتے، ٹوپی وغیرہ) بناتا ہے۔ حتیٰ کہ ان کے گوبر کو کھاد کے طور پر استعمال کرتا ہے۔

د: بعض چوپایوں سے انسان دودھ حاصل کرتا ہے۔ دودھ سے بہت سی دوسری اشیاء (ثانوی حاصلات: Secondary Products) بنائی جاتی ہیں۔

انسان کو چاہئے کہ وہ ان نعمتوں پر اپنے منعم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے۔ کیونکہ اسی صورت میں انسان اپنی خلقت کے مقصد کو حاصل کرسکتا ہے۔

الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا
فَاِذَآ اَنْتُمْ مِّنْہُ تُوْقِدُوْنَ ٥ (36:80)

وہی ہے جس نے تمہارے لئے سبز درخت سے
آگ پیدا کی، پس تم اس کے ذریعے سے آگ روشن

کرتے ہو۔

اس آیت کی تشریح میں کئی احتمالات ہیں:

1۔عرب میں دوقسم کے درخت پائے جاتے تھے ایک کا نام ''مرخ'' اور دوسرے کا نام ''عفار'' تھا۔ ان کی سبز شاخوں کو جب آپس میں رگڑا جاتا تھا تو اس سے چقماق کی طرح آگ نکلتی تھی۔ فرمایا جارہا ہے کہ اللہ وہی ہے جس کی قدرت سے یہ ممکن ہوا ہے کہ سبز درخت سے آگ پیدا ہوجاتی ہے جس سے تم مزید آگ سلگا لیتے ہو۔

2۔ اس سے عام لکڑی کا آگ پکڑنا اور حرارت دینا مراد ہے۔ درخت ہرا بھرا ہوتا ہے جب خشک ہوجاتا ہے تو اسے جلاتے ہیں تو اس سے آگ پیدا ہوتی ہے۔ یہ اللہ ہی کی قدرت سے ممکن ہے۔ ورنہ انسان کے بس میں نہ تھا کہ وہ سبز لکڑی کو خشک کرتا اور اس سے آگ روشن کرتا۔

3۔دور جدید میں یہ بات دریافت ہوئی ہے کہ پیٹرول، گیس اور کوئلہ قدیم زمانے میں پائے جانے والے پودوں کے رکاز (Fossils) ہیں۔ آج انسان انھیں ایندھن کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ یہ اللہ ہی کی قدرت سے ممکن ہوا ہے کہ سرسبز درخت ہزاروں سالوں کے انحطاطی عمل (Decay Process) کے نتیجے میں رکازی ایندھنوں (Fossil Fuels) کی شکل اختیار کرگئے ہیں جنھیں انسان جلاتا اور حرارت اور توانائی حاصل کرتا ہے۔

یہاں ''سبز'' درخت کے الفاظ ایک اور اعتبار سے بھی توجہ طلب ہیں۔ پودوں کے سبز حصوں میں ایک سبز رنگ کا مادہ کلوروفل ہوتا ہے۔ اس کی موجودگی میں پودے سورج کی روشنی کو کام میں لاتے ہوئے پانی اور کاربن ڈائی آکسائیڈ سے پیچیدہ نامیاتی مرکبات (Organic compounds) بناتے ہیں۔ لکڑی اسی عمل سے بنتی ہے۔ گویا پودے کے سبز حصے سورج کی روشنی کو ''قید'' کرتے ہیں۔ جب

لکڑی جلائی جاتی ہے تو حرارت خارج ہوتی ہے یہ حرارت وہی توانائی ہے جو پودے کے سبز حصے سورج سے حاصل کرتے ہیں۔

"توقیدون" یہ "وقودٌ" کے مادے سے ہے، جس کا معنی ہے "آگ کا روشن ہونا" توقیدون میں اُس ایندھن کی طرف اشارہ ہے جس سے آگ جلائی جاتی ہے یعنی تم اس کو بطورِ ایندھن استعمال کرتے ہو۔

یعنی سبز درخت کا بالآخر ایندھن میں تبدیل ہوجاتا ہے۔

اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ ِۨالْكَوَاكِبِ ۝ وَحِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ مَّارِدٍ ۝ لَا يَسَّمَّعُوْنَ اِلَى الْمَلَاِ الْاَعْلٰى وَيُقْذَفُوْنَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ ۝ دُحُوْرًا وَّلَهُمْ عَذَابٌ وَّاصِبٌ ۝ اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ ۝

(37:6-10)

بے شک ہم ہی نے آسمان دُنیا[1] کو ستاروں کی زینت سے مزین کیا ہے[2]، اور ہر سر کش شیطان[3] سے محفوظ کیا ہے۔ وہ عالم بالا[4] کی طرف کان نہیں لگا سکتے۔ ہر طرف سے مارے جاتے ہیں، رد کئے جانے کے طور پر[5] اور ان کے لئے دائمی عذاب ہے۔ مگر جو کوئی کچھ جھپٹ لینا[6] چاہتا ہے تو ایک تیز شعلہ[7] اس کا تعاقب کرتا ہے۔

1۔ ''دنیا'' کا معنی ہے قریب ترین۔ یہ ادنیٰ کی تانیث ہے۔ لہٰذا ''السماء الدنیا'' (آسمانِ دنیا) کا معنی ہوگا '' قریب کا آسمان'' وہ آسمان جو زمین کے قریب ترین ہے۔ اس کا مفہوم ممکن ہے یہ ہو کہ کائناتی خلا (Cosmic space) کا وہ حصہ جس میں زمین موجود ہے۔ سائنسی اعتبار سے اس سے غالباً وہ کہکشاں مراد ہے جس میں زمین موجود ہے، اسے راہ شیری یا ملکی وے (Milky Way) کہکشاں کہا جاتا ہے۔ آسمانِ دنیا کو ستاروں کی زینت سے

مزین کیا گیا ہے۔یعنی اس میں ستارے موجود ہیں جو اپنی روشنی تمام اطرافِ عالم میں بکھیر رہے ہیں۔

یہ بھی ممکن ہے کہ آسمان دُنیا سے ہماری تمام طبیعی کائنات مراد ہو جس میں کہکشائیں، ستارے اور سیارے اور دوسرے سماوی اجرام موجود ہیں۔
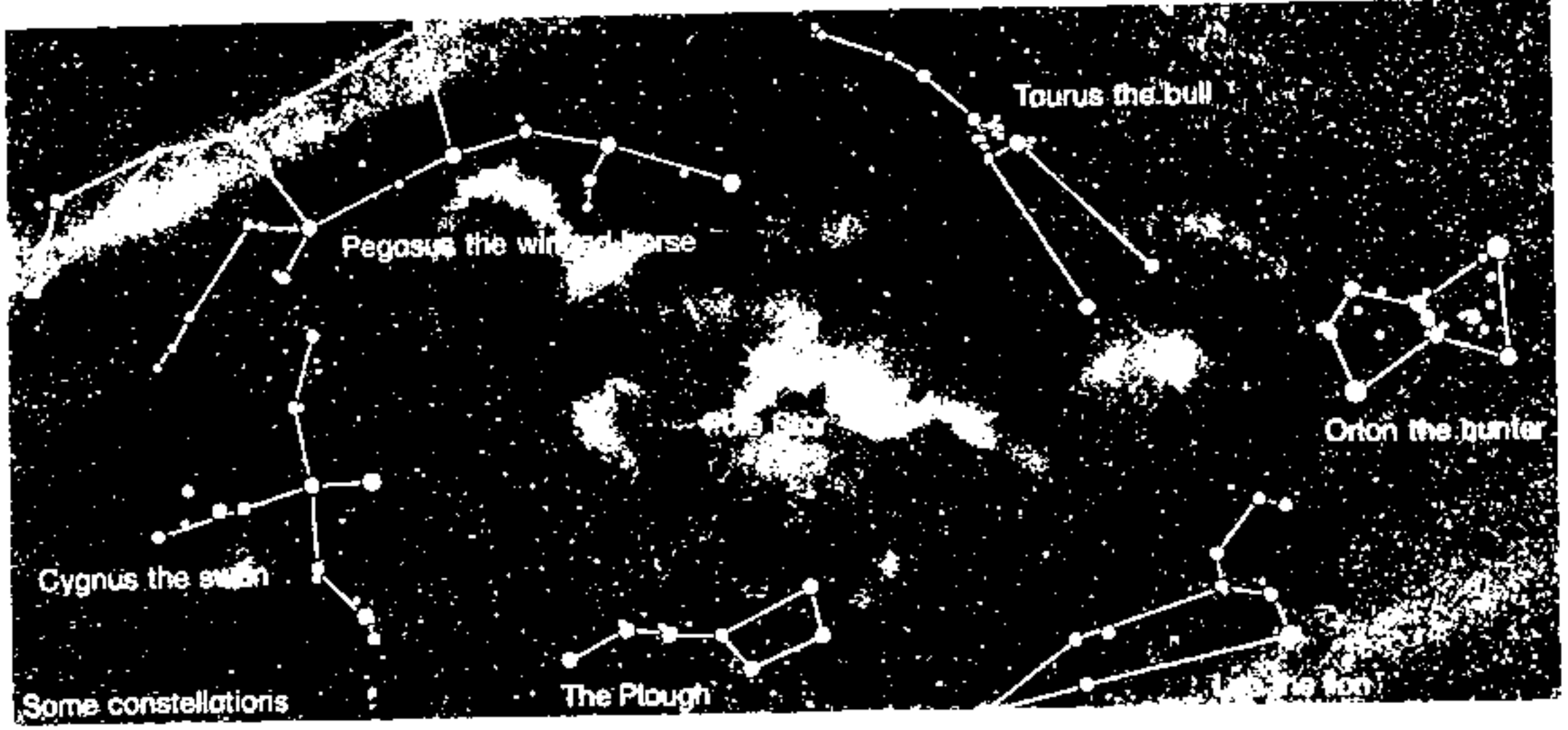
ستاروں کے چند مجموعے

2۔''زین'' (مزین کیا گیا ہے) بالواسطہ طور پر یہ پیغام دے رہا ہے کہ کائناتِ سماوی کا مشاہدہ و مطالعہ کیا جائے، اس پر غور و فکر کیا جائے اور یوں اس کے پیچھے کارفرما ہستی، اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کی جائے۔

3۔''شیطان'' کے مفہوم کے لئے دیکھیں سورہ الحجر15:16-18۔

''مارد''،''مرد'' کے مادے سے ہے وہ بلند سرزمین جو ہر قسم کے سبزے سے خالی ہو۔ لہٰذا ''مارد'' کا معنی ہے ہر قسم کی خیرو برکت سے عاری، 'جس کے پاس کچھ نہ ہو'۔اس کا معنی سرکش قوت (Rebellious force) بھی کیا گیا ہے۔

4۔''ملا ' اعلیٰ'' :بلند (مرتبہ) گروہ یا جماعت، یعنی فرشتوں کی بلند مرتبہ جماعت۔ مراد ہے عالمِ غیب۔

"The angelic forces whose 'speech' is a metonym for God's decrees."

5۔''یقذفون''،''قذف'' کے مادے سے ہے۔ اس کا معنی ہے دور کی جگہ پر تیر مارنا، پتھر مارنا، پھینکنا، بھگانا،دور دھکیلنا۔

''دحورا''،''دحر'' کے مادہ سے ہے، دور کرنا، دھکیلنا، رد کرنا۔معنی ہوگا

دھتکار کر دور بھگائے جاتے ہیں۔ یعنی کسی شیطانی قوت (مثلاً جھوٹے غیب دانوں) کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ غیب کی دُنیا میں جھانک سکیں۔

6۔ "**خطفه**": کسی چیز کو جلدی سے جھپٹ لینا، اچک لینا، اڑا لینا۔

7۔ "**شهاب**": شعلہ،انگارہ، چنگاری۔(تفصیل کے لئے دیکھیں 15:16-18)

"**ثاقب**": سوراخ کرنے والا، نفوذ کرنے والا، تیز۔

آیات کی مجموعی تشریح: اگر شیطان سے مراد شیطان الانس ہو یعنی شیطان صفت انسان تو تشریح میں کوئی دشواری نہیں رہتی۔ مطلب یہ ہوگا کہ ان آیات میں جھوٹی غیب دانی اور کہانت کا پرزور الفاظ میں رد کیا گیا ہے۔ یعنی کسی کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ شیطانی طریقوں سے غیب کی باتیں جان سکے۔

قدیم عرب میں کہانت کا کاروبار اپنے عروج پر تھا، جھوٹے غیب دانوں کا دعویٰ تھا کہ اُن کے پاس جن ہیں جو آسمانوں پر جا کر فرشتوں کی گفتگو سنتے ہیں اور واپس زمین پر آکر انھیں غیب کی خبریں بتاتے ہیں۔ ان آیات میں ان کے اس جھوٹے دعوے کا رد کیا گیا ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ "عالم بالا" (غیب کا روحانی عالم) تک کسی شیطان کی رسائی نہیں ہوسکتی۔ کوئی شیطان غیب کی خبریں نہیں جان سکتا۔

چنانچہ تمثیل اور کنایہ کی زبان میں کہانت اور جھوٹی غیب دانی کے دعووں کو رد کیا گیا ہے۔مزید دیکھیں سورہ الحجر 15:16-18۔

فَاسْتَفْتِهِمْ اَهُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمْ مَّنْ خَلَقْنَا ؕ اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ طِيْنٍ لَّازِبٍ ○ (37:11)

پس ان سے پوچھو: آیا خلقت کے اعتبار سے وہ زیادہ مضبوط ہیں یا (کائنات کی دوسری چیزیں) جنھیں ہم نے پیدا کیا ہے۔ بے شک ہم نے انھیں لیسدار کیچڑ سے پیدا کیا ہے[1]۔

1۔آیت کے اس ٹکڑے میں انسان کی خلقت کے مادے کی طرف

متوجہ کیا گیا ہے۔

طین: گیلی مٹی، گارا، کیچڑ۔

لازب: چپکنے والا، جم جانے والا، لیسدار۔

طین لازب: چپکتی مٹی، لیسدار مٹی، لیسدار گارا، یا لیسدار کیچڑ وغیرہ۔

انسان کی جسمانی تخلیق کی اصل یہ ہے کہ یہ پانی اور ''مٹی'' کا بنا ہوا ایک وجود ہے جس میں ''مٹی'' کے اجزا آپس میں چسپاں ہوتے ہیں۔

مٹی سے مراد وہ مادی عناصر ہیں جن سے انسان کی جسمانی تشکیل ہوئی ہے۔ ممکن ہے ''لازب'' کا سائنسی سطح پر مفہوم یہ ہو کہ مادے کے ذرّات (ایٹمز Atoms) آپس میں کیمیائی طور پر بندھے ہوئے ہوتے ہیں یعنی Chemically bonded ۔(مزید دیکھیں سورہ الحج 22:56 نوٹ 1۔)

کیچڑ میں طویل اور پیچیدہ کیمیائی تعاملات کے ذریعے بالآخر زندہ خلیہ کی تخلیق ہوئی جس سے ایک لمبے ارتقائی اور تدریجی عمل کے ذریعے بالآخر انسان وجود میں آیا۔

سورہ الزمر (39)

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ بِالۡحَقِّ ۚ یُكَوِّرُ الَّیۡلَ عَلَی النَّهَارِ وَیُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَی الَّیۡلِ وَسَخَّرَ الشَّمۡسَ وَالۡقَمَرَ ؕ كُلٌّ یَّجۡرِیۡ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی ؕ اَلَا هُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡغَفَّارُ ۝ (39:5)

اُس نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے[1]۔ وہ رات کو دن پر لپیٹتا ہے اور دن کو رات پر لپیٹتا ہے[2]۔ اور اس نے سورج اور چاند کو مسخر کر رکھا ہے۔ ہر ایک مقررہ معیاد تک رواں ہے[3]۔ سن رکھو وہی غالب (اور) بخشنے والا ہے۔

1۔ ''حق کے ساتھ پیدا کیا'' یعنی ایک مقصد اور غایت کے ساتھ پیدا کیا۔ کائنات اللہ تعالیٰ کی ایک بامقصد تخلیق ہے۔

2۔ ''یکوّر''، ''کور'' کے مادے سے ہے، اس کا معنی ہے لپیٹنا اور بل دینا جیسا عمامہ سر پر لپیٹتے اور بل پر بل دیتے چلے جاتے ہیں۔ ہر بل کو ''کور'' کہا جاتا ہے۔

کَارَ الۡعِمامَةَ علی رأسه یَکُوۡرُها

کوراً ای لاثها. کُل دور کوۡرٌ

(صحاح)

دن اور رات ایک دوسرے کے پیچھے لگے دائرے میں گھوم رہے ہیں۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ دن کی روشنی جہاں سے سمٹتی جاتی ہے، رات کا اندھیرا وہاں پھیلتا جاتا ہے، اور یوں ہی رات کا اندھیرا جہاں سے ختم ہوتا جاتا ہے دن کی روشنی وہاں پھیلتی جاتی ہے۔ یہ مظہر ایک تسلسل کے ساتھ جاری ہے۔

آیت میں بالواسطہ طور پر اس حقیقت کو بھی منکشف کیا گیا ہے کہ زمین گول ہے اور وہ اپنے محور پر گردش کر رہی ہے۔

سر پر عمامہ کے بل پر بل دینے کی تعبیر سے بالواسطہ طور پر زمین کے گول ہونے (اور اپنے محور پر گردش کرنے) کا نتیجہ بھی اخذ کیا جاسکتا ہے۔ قرآنِ مجید کے الفاظ کا انتخاب بہت اہم ہے اور یہاں ''یکور'' کے لفظ کا استعمال بلاشبہ ایک سائنسی معجزہ ہے۔

3۔سورج اور چاند اس کے حکم کے پابند ہیں اور اُس نے ان کو ایسا بنایا ہے کہ ان سے اہلِ زمین کو سوسو طرح کے فائدے حاصل ہو رہے ہیں، انسان ان سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

یہ اپنے مداروں پر گردش کر رہے ہیں۔ یہ عمل ان کی ''عمر'' کے اختتام تک جاری رہے گا۔ ان کو بالآخر ایک دن ختم ہونا ہے۔

خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ؕ يَخْلُقُكُمْ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ خَلْقًا مِّنْۢ بَعْدِ خَلْقٍ فِيْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ؕ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ۝ (39:6)

اُس نے تمہیں فردِ واحد سے پیدا کیا ہے (اُس نے اُسے پیدا کیا) پھر اُسی سے اُس کا جوڑا بنایا[1]۔اور اس نے تمہارے لئے چوپایوں میں سے آٹھ جوڑے پیدا کیے[2]۔وہ تمہیں تمہاری ماؤں کے شکموں میں تین تاریکیوں کے اندر[3] (درجہ بدرجہ) ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیل کرتا ہوا وجود

میں لاتا ہے[4]۔وہی اللہ تمہارا رب ہے، بادشاہی اُسی
کی ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ پھر تم کدھر منہ
پھیر کر جا رہے ہو۔

1۔یعنی تم سب ایک باپ کی اولاد ہو، تمہارا Origin (آغاز) یکساں ہے۔'' اُس سے اُس کا جوڑا بنایا'' یعنی اُسی کی جنس سے اس کا جوڑا بنایا۔ تمہارے باپ اور تمہاری ماں دونوں کا تعلق ایک ہی جنس اور نوع سے ہے۔(تفصیل کے لئے دیکھیں سورہ النساء 4:1)

2۔ آٹھ جوڑوں سے مراد بھیڑ، بکری، گائے اور اونٹ کے نر اور مادہ ہیں۔ زوج کے لفظ کی تشریح کئی بار پہلے ہوچکی ہے۔

چوپائے طرح طرح سے انسان کے کام آتے ہیں۔

3۔ تین تاریکیوں کی تشریح کئی طرح سے کی گئی ہے، سب سے واضح تشریح یہ ہے: پیٹ کا اندھیرا، رحم کا اندھیرا اوراُس جھلی (مشیمہ) کا اندھیرا جو جنین (Embryo) کو غلاف کی طرح گھیرے ہوتی ہے۔

یہ دراصل تین دبیز پردے ہیں جن کے اندر جنین نشوو نما پاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ اللہ تعالٰی ہی کی قدرت ہے کہ وہ تین تین تاریکیوں کے اندر انسان کی مرحلہ وار تخلیق کرتا،اس کی شکل و صورت بناتا اورنقش و نگار واضح کرتا ہے۔ اللہ وہ ''مصور'' ہے کہ اُسے صورت گری اور تصویر سازی کے لئے روشنی کی محتاجگی نہیں، اُس کا دست قدرت اندھیرے میں بھی اپنا کام اُسی طرح کرتا ہے جس طرح روشنی میں۔

4۔ رحمِ مادر میں انسان کی مرحلہ وارتخلیق کی طرف اشارہ ہے،

An allusion to the successive stages of embryonic development.

ان مراحل کا ذکر قرآنِ پاک میں دوسرے مقامات پر آیا ہے۔ مثال کے طور پر دیکھیں سورہ المومنون 23:12-14۔

اللہ تعالٰی قادرِمطلق ہے وہ اگر چاہے تو کسی بھی چیز کو یک لخت کوئی وقت صرف کئے بغیر پیدا کرسکتا ہے۔ مگر اس کی حکمت نے یہ چاہا کہ وہ اشیاء کو

بتدریج پیدا کرے۔

جب کوئی چیز بتدریج پیدا ہوتی ہے تو اُس کا ہر مرحلہ اپنے بنانے والے کی قدرت کی ایک نئی شان سے پردہ اُٹھاتا ہے۔ جس طرح کسی کتاب کا ہر صفحہ اپنے پڑھنے والے کے سامنے ایک نئی بات لاتا ہے۔ اسی طرح رحمِ مادر میں مرحلہ وار طور پر نشوونما پاتے ہوئے بچے کا ہر مرحلہ اللہ کی خلاقیت اور خلاقیت کی تازہ شان اور اُس کے دستِ قدرت کی کارفرمائی کے نئے زاویہ سے آگاہ کرتا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَلَكَهٗ يَنَابِيْعَ فِي الْاَرْضِ ثُمَّ يُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَجْعَلُهٗ حُطَامًا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِاُولِي الْاَلْبَابِ ۝ (39:21)

کیا تم نے غور نہیں کیا کہ بے شک اللہ ہی ہے جس نے بادل سے پانی برسایا، پھر اُسے زمین کے چشموں سے جاری کیا[1]۔ پھر وہی ہے جو اُس کے ذریعے مختلف قسموں کی کھیتی[2] اُگاتا ہے۔ پھر وہ خشک ہونے لگتی ہے تو تم اُسے زرد دیکھتے ہو پھر وہ اُسے ریزہ ریزہ کردیتا ہے۔ بے شک اس کے اندر اہلِ عقل کے لئے بڑی نصیحت ہے۔

1۔ ''ینابیع'' (چشمے)، ''ینبوع'' کی جمع ہے۔ یہ ''نبع'' کے مادے سے ہے اس کا معنی ہے پانی کا زمین سے جوش مارنا۔

چشموں کے پانی کا اصل منبع بارش ہے۔

زمین کی اوپر کی تہہ نفوذ پذیر (Permeable) ہوتی ہے جب کہ اُس کے نیچے غیر نفوذ پذیر (Impermealde) چٹانی تہہ ہوتی ہے۔ اس وجہ سے

بارش کا پانی سطح سے گزر کر سطح کے نیچے غیر نفوذ پذیر تہہ کے اوپر ذخیرہ ہوجاتا ہے۔
اس کو Ground water (زمینی پانی) کہا جاتا ہے۔
یہ پانی چشموں کی شکل میں کسی مقام سے جوش مار کر باہر آجاتا ہے
اور انسانوں اور دوسرے جانداروں کے کام آتا ہے۔ یا پھر کنویں کھود کر حاصل کیا
جاسکتا ہے۔
2۔''زرع'' (کھیتی) کا لفظ وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ یہ غذائی نباتات کے
علاوہ غیرغذائی نباتات کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے مثلاً طرح طرح کے
پھول،گھاس، دواؤں کی جڑی بوٹیاں وغیرہ۔
نباتات کی زندگی کئی مراحل پر مشتمل ہوتی ہے۔ ایک وقت ہوتا ہے جب
یہ نشوونما پاکر اپنے جوبن کو پہنچتے ہیں۔ پھر یہ سوکھ کر زرد ہوجاتے ہیں۔ پھر وقت کے
ساتھ ساتھ گل سڑ کر ریزہ ریزہ ہوجاتے ہیں۔
یہ تمام واقعات اپنے اندر عقل و دانش رکھنے والوں کے لئے نصیحت
رکھتے ہیں۔ ضروری ہے کہ انسان دُنیا کی حقیقت کے مشاہدے سے اپنی حقیقت
کو سمجھے۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ۭ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ښ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (40:64)

اللہ وہی ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو جائے قرار[1] اور آسمان کو چھت بنایا ہے[2]۔ اور تمہاری صورت گری کی پس اچھی بنائیں تمہاری صورتیں[3] اور تمہیں پاکیزہ چیزوں سے رزق بخشا۔ وہی اللہ تمہارا رب ہے۔ پس بڑا ہی بابرکت ہے اللہ جو جہانوں کا رب ہے۔

1۔زمین قیام کی جگہ ہے جہاں انسان راحت و آرام اور امن و اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہے۔ دیکھیں (2:22)

2۔ یہاں لفظ ''سماء'' کرۂ ہوائی کے معنوں میں ہے جو ایک چھت کی طرح زمین کی حفاظت کرتا ہے۔''بناء'' خیمہ، سائبان،(لسان العرب)، مزید دیکھیں 2:22 اور 21:32۔

3۔ ''تمہاری صورت گری کی پس کیا ہی اچھی بنائیں تمہاری صورتیں''۔ رحمِ مادر میں دست قدرت انسان کی صورت گری کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہترین ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں کا حامل بنایا ہے اُسے بہترین شکل و صورت اور قد و قامت عطا کیا ہے۔ مزید دیکھیں 6-3:5۔

هُوَ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن تُرَابٍ ثُمَّ مِن نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ يُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوا أَشُدَّكُمْ ثُمَّ لِتَكُونُوا شُيُوخًا ۚ وَمِنكُم مَّن يُتَوَفَّىٰ مِن قَبْلُ ۖ وَلِتَبْلُغُوا أَجَلًا مُّسَمًّى وَلَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ○ (40:67)

(اللہ) وہی ہے جس نے تمہیں مٹی سے تخلیق کیا ہے، پھر نطفہ سے، پھر علقہ سے، پھر وہ تمہیں ایک بچہ کی صورت میں وجود میں لاتا ہے، پھر وہ تمہیں پروان چڑھاتا ہے کہ اپنی جوانی کو پہنچو۔ پھر وہ تمہیں مہلت دیتا ہے کہ تم بڑھاپے کو پہنچو۔ اور تم میں سے بعض اس سے پہلے ہی مرجاتے ہیں اور (یہ سارا نظام اس لئے ہے) تاکہ تم ایک مدت معین پوری کرو اور یہ اس لئے ہے کہ تم عقل سے کام لو۔

تشریح کے لئے دیکھیں سورہ الحج 22:5-6 اور سورہ المومنون 23:12-14۔

اللَّهُ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَنْعَامَ لِتَرْكَبُوا مِنْهَا وَمِنْهَا تَأْكُلُونَ ○ وَلَكُمْ فِيهَا مَنَافِعُ وَلِتَبْلُغُوا عَلَيْهَا حَاجَةً فِي صُدُورِكُمْ وَعَلَيْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُونَ ○ وَيُرِيكُمْ آيَاتِهِ فَأَيَّ آيَاتِ اللَّهِ تُنكِرُونَ ○ (40:79-81)

اللہ ہی ہے جس نے تمہارے لئے چوپائے پیدا کئے کہ تم بعض سے سواری کا کام لو، اور ان میں سے

کچھ تمہاری غذا کے کام آتے ہیں، اور ان میں تمہارے
لئے دوسرے فائدے بھی ہیں اور اس لئے بنائے ہیں
کہ ان کے ذریعے سے اپنے دلوں کے کسی مقصد تک
پہنچو۔ اور تم ان پر، اور کشتیوں پر سوار کئے جاتے ہو۔
اور وہ تمہیں اپنی اور بھی بے شمار نشانیاں دکھاتا ہے تو
تم اللہ کی کن کن نشانیوں کا انکار کرو گے۔

''انعام'' ، ''نعم'' کی جمع ہے جو اصل میں اونٹ کے لئے استعمال ہوتا تھا، پھر اس کے مفہوم میں وسعت آگئی اور یہ اونٹ، گائے ، بھیڑ، بکری وغیرہ کے لئے استعمال ہونے لگا۔ یہ ''نعمت'' سے لیا گیا ہے ہم جانتے ہیں کہ چوپائے اللہ تعالٰی کی بے شمار نعمتوں میں سے ہیں۔

ان آیات میں چوپایوں کے مختلف فائدوں کی طرف انسان کی توجہ دلائی گئی ہے:

ا۔ سواری اور باربرداری
۲۔ گوشت
۳۔ دوسرے فوائد

اس کے علاوہ کشتی کا ذکر ہوا کہ وہ تمہارے کام آتی ہے تم اُس کے ذریعے سمندروں اور دریاؤں وغیرہ میں سفر کرتے ہو۔(تفصیل کئی مقامات پر گزر چکی مثلاً دیکھیں 2:164۔

آیت یہ چاہتی ہے کہ انسان اللہ کی نعمتوں کو پہچانے اور ان پر اپنے رب کا شکر ادا کرے اور اس میں شکر گزاری کا احساس پیدا ہو۔

قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِيْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُوْنَ لَهٗٓ اَنْدَادًا ؕ ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۚ وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا وَبٰرَكَ فِيْهَا وَقَدَّرَ فِيْهَآ اَقْوَاتَهَا فِيْٓ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ ؕ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ ۝ ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا ؕ قَالَتَآ اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ ۝ فَقَضٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوَاتٍ فِيْ يَوْمَيْنِ وَاَوْحٰى فِيْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا ؕ وَزَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ ۖ وَحِفْظًا ؕ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ۝ (41:9-12)

ان[1] سے کہو، کیا تم اس ہستی کا انکار کرتے ہو جس نے زمین دو ادوار میں پیدا کی۔ اور اس کے مدِمقابل ٹھہراتے ہو، وہ تو جہانوں کا رب ہے۔ اور اُسی نے زمین میں گڑے ہوئے پہاڑ بنائے ہیں جو اس کے اوپر (اُٹھے ہوئے) ہیں۔ اور اس نے اس میں برکتیں رکھیں اور اس میں اس کے غذائی ذخیرے ودیعت کئے، چار ادوار میں۔ سب طلب گاروں کے لئے یکساں۔

پھر[2] یہ کہ، اُسی نے آسمان (کی تخلیق) کا قصد

کیا (اپنے ارادہ سے) اور وہ شروع میں محض دھواں
تھا۔ پس اُس نے اس کو اور زمین کو کہا کہ آؤ (وجود
میں) خواہ رغبت سے یا مجبوراً۔ انھوں نے کہا ہم آ گئے
اس حال میں کہ فرمانبردار ہیں۔ پس اُس نے کردیا
انھیں سات آسمان دو ادوار میں۔ اور ہر آسمان میں
اُس کے امر کی وحی کی۔

اور ہم نے آسمان دُنیا[3] کو (ستاروں کے)
چراغوں سے زینت دی اور اُسے محفوظ کیا۔ یہ زبردست
قوت والے، علم والے کی منصوبہ بندی ہے۔

1۔ان آیات کے مطالعے سے ضمنی طور پر زمین اور آسمان (یعنی کائنات) کے چھ ایام میں تخلیق کی تفصیل حاصل ہوتی ہے۔ آیات کے تفصیلی مطالعے کے لئے دیکھیں راقم کی کتاب ''کائنات قرآن اور سائنس'' باب 9۔یہاں ان کا مختصر مفہوم بیان کیا جاتا ہے۔

یہ بات شروع سے ذہن میں رکھنی چاہئے کہ اپنے سائنسی مفہوم (Connotation) کے پہلو سے یہ بہت مشکل آیات ہیں، ہمارے پاس کائنات کی تخلیق و ارتقاء کے متعلق ابھی اتنی کافی معلومات نہیں ہیں کہ ہم ان آیات کے سائنسی مضمرات کی حتمی تشریح کرسکیں۔ اس تمہید کے بعد آیئے دیکھیں کہ ان آیات سے کیا نتائج اخذ کئے جاسکتے ہیں:

1۔آیت نمبر9 کہتی ہے کہ زمین کی تخلیق دو ایام میں ہوئی، اگلی آیات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ زمین کی ''ابتدائی'' تخلیق کی بات ہے۔

2۔آیت نمبر 10 کہتی ہے کہ زمین میں ارضیاتی تبدیلیاں (Geological Changes) ہوئیں جن کے نتیجے میں زمین موجودہ شکل میں آئی۔ یہ کام چار ایام میں ہوا۔ آیات 9 اور 10 پر مجموعی نظر ڈالنے پر یہ بات اخذ کی جاسکتی ہے ان چار ایام میں دو ابتدائی ایام وہ ہیں جن کا ذکر آیت نمبر9 میں آیا ہے۔
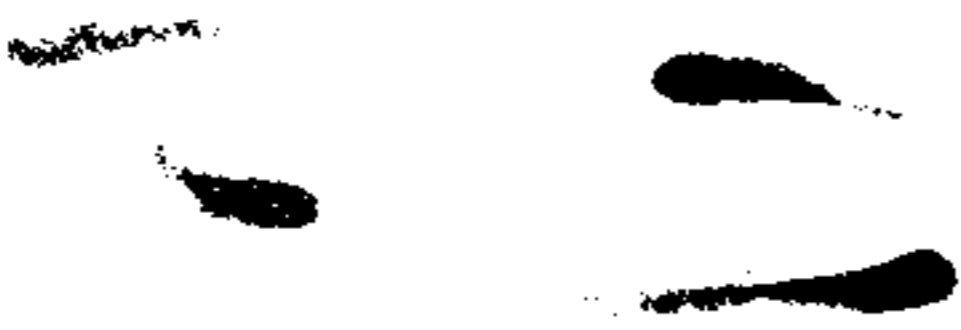
شمسی نظام کی تخلیق۔ گیس اور گرد کے دھویں سے آغاز، اور
مختلف مراحل سے گزر کر موجودہ شکل اختیار کرتا ہے۔

3۔آیت نمبر12 کہتی ہے کہ آسمانوں کی تخلیق دو ایام میں کی گئی۔ اگر ہم آسمانوں سے مراد ''کائنات'' لیں جس کا زمین بھی ایک حصہ ہے تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ یہ دو ایام کائنات کے ابتدائی دو ایام ہیں جب ابھی زمین ایک
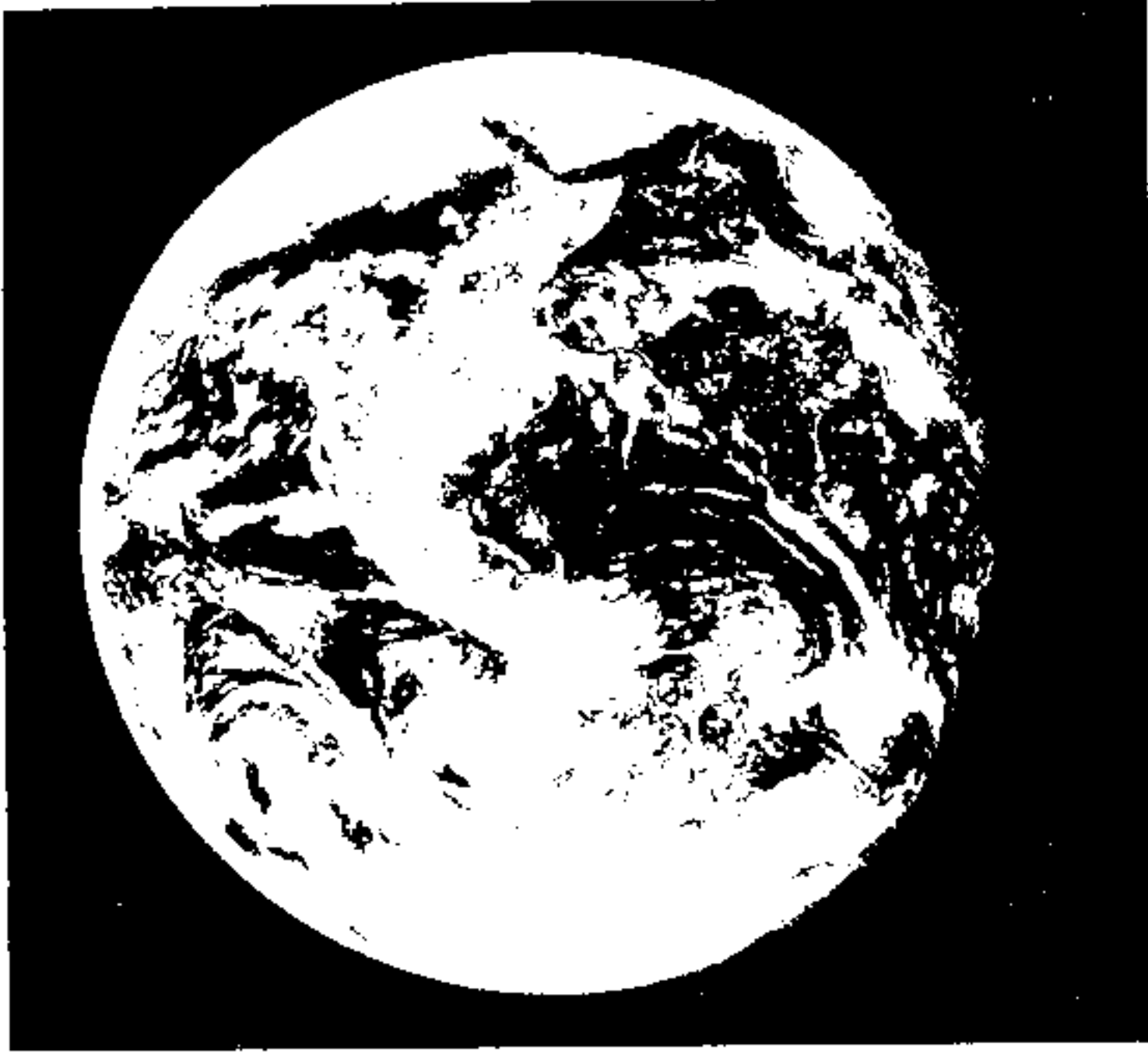
چار مراحل میں زمین کی تخلیق۔ خلا سے زمین کا ایک منظر۔

علیحدہ سیارے کے طور پر وجود میں نہیں آئی تھی۔

4۔ آیت نمبر 11 سے معلوم ہوتا ہے کہ ''استویٰ الی السماء'' (آسمانوں کی تخلیق کا قصد کرنا) کے مرحلہ پر ''یہ آسمان'' (یعنی کائنات) ''دُخان'' (دھویں) کی شکل میں تھی یعنی دُخان کی تخلیق پہلے ہوچکی تھی اللہ تعالیٰ نے اس دُخان کو دو ادوار میں ''سات'' آسمانوں کی شکل دی۔

اب ان بنیادی نکات اور بعض دوسری آیات میں کئے گئے تخلیقی انکشافات کو مدنظر رکھ کر کوئی تخلیقی نظریہ اخذ کرنے کی کوشش کی جائے تو ایک امکانی نظریہ یہ ہے:

۱۔اللہ تعالیٰ نے کائنات کو عدم سے وجود بخشا ایک تخلیقی مرحلے پر یہ دخان (گیس یا نیبولا Nebula) کی شکل میں تھی۔

۲۔ اس گیس یا نیبولا نے ارتقائی (یا نشو و نمائی) مراحل سے گزر کر اجرام سماوی ''کہکشاؤں'' کی شکل اختیار کی۔ ایسا دو ادوار میں ہوا۔

۳۔ اسی دوران میں زمین کا کرہ اپنی ابتدائی شکل میں آسمانوں کے تخلیقی

مادے یا زیادہ صحیح طور پر شمسی نیبولا (Solar nebula) سے علیحدہ ہوا۔

زمین اپنی ابتدائی شکل سے بتدریج موجودہ شکل کی طرف بڑھی۔ اس میں طبیعی، کیمیائی اور دوسری تبدیلیاں ہوئیں، پہاڑ نمودار ہوئے، آبی چکر کا نظام قائم ہوا، کرہ ہوائی بنا، زندگی کے لئے حالات ساز گار ہوئے، زندگی کی ابتدا ہوئی اور بتدریج قسم قسم کے پودے اور حیوانات نمودار ہوئے۔ یہ سارا عمل چار ادوار میں ہوا۔

زمین اور آسمانوں کا ارتقاء:

مندرجہ بالا بحث سے زمین اور آسمانوں کی تخلیق کی زمانی ترتیب مندرجہ ذیل سمجھ میں آتی ہے:

ا۔ آغاز آفرینش سے زمین کی علیحدگی تک دو ادوار۔ ان کی تفصیل یہ ہے:

الف: کہکشاؤں کے ابتدائی طور پر وجود میں آنے تک ایک دور۔

ب: ہماری کہکشاں میں ہمارے نظامِ شمسی کے ابتدائی طور پر وجود میں آنے تک دوسرا دور۔

۲۔ مختلف کہکشاؤں کا اپنے اپنے طور پر ارتقائی سفر جاری رہا۔ جب زمین اپنے طور پر ارتقائی سفر جاری رکھتی ہے۔ دو ادوار کی طبیعی و کیمیائی تبدیلیوں کے نتیجے میں زمین حیات کے لئے ساز گار بنی (یعنی حیات کے آغاز سے پہلے کے دو ادوار)۔

۳۔ اجرامِ سماوی کا ارتقا اپنے اپنے طور پر جاری ہے۔ اگلے دو ادوار میں زمین میں ہر قسم قسم کے پودے اور حیوانات نمودار ہوئے۔ آخر میں انسان نمودار ہوا۔

2۔ لفظ ''ثم'' ترتیب زمانی کے نہیں بلکہ ترتیب بیانی کے معنوں میں ہے۔ اس لئے ہم نے اس کا معنی کیا ہے ''پھر یہ کہ''۔

3۔ ''آسمانِ دنیا'' کی تشریح کے لئے دیکھیں سورہ الصافات 10 37:6۔

سَنُرِيهِمْ ءَايَـٰتِنَا فِى ٱلْـَٔافَاقِ وَفِىٓ أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ ٱلْحَقُّ ۗ أَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ أَنَّهُۥ عَلَىٰ كُلِّ شَىْءٍ شَهِيدٌ ۝

(41:53)

عنقریب ہم انھیں اپنی نشانیاں دکھائیں گے
اطرافِ عالم میں بھی اور ان کے وجودوں میں بھی،
یہاں تک کہ ان پر واضح ہوجائے گا کہ یہ (قرآن)
بالکل حق ہے۔ اور کیا تیرے رب کا ہر بات کا شاہد
ہونا کافی نہیں ہے!

''آفاق'' اطرافِ عالم یعنی کائنات۔
''انفس'' انسانی نفوس، ذواتِ انسانی۔
''سنریھم'' عنقریب انھیں دکھائیں گے یا دکھاتے چلے جائیں گے۔

جوں جوں وقت گزرتا جائے گا انسانی علم میں اضافہ ہوتا جائے گا اور جیسے جیسے مادی کائنات کے بارے میں انسان کا علم بڑھے گا اور انسان کی اپنی ذات کے بارے میں آگہی میں اضافہ ہوگا۔ ویسے ویسے انسان پر یہ بات ثابت ہوتی جائے گی کہ اس کائنات کا کوئی خالق ہے۔ اور یہ کہ یہ قرآن حق ہے۔

کائنات کے مختلف مظاہر اللہ کی ہستی اور قدرت کی گواہی دیتے ہیں۔ کائنات، ایک طرح سے اللہ تعالیٰ کی قدرت کی کتاب ہے جس کا ہر صفحہ، ہر سطر اور ہر لفظ اپنے خالق کی عظمت کی شہادت دیتا ہے۔ انسان جیسے جیسے اس کتاب کو پڑھتا جائے گا، اس پر اللہ کی معرفت کے تازہ بتازہ راز منکشف ہوتے جائے گے۔

فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّمِنَ الْاَنْعَامِ اَزْوَاجًا ۚ يَذْرَؤُكُمْ فِيْهِ ؕ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ۝ لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ؕ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝ (42:11-12)

وہی آسمانوں اور زمین کو وجود میں لانے والا ہے[1]۔ اُس نے تمہاری جنس سے تمہارے جوڑے بنائے ہیں۔ اور چوپایوں کی جنس سے بھی جوڑے بنائے ہیں۔ اس (نظام) کے ذریعے وہ تمہاری نسل کو پھیلاتا رہتا ہے[2]۔ اس کے مانند کوئی شے نہیں ہے[3]۔ اور وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔ آسمانوں اور زمین کی کنجیاں اسی کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ وہ جس کے لئے چاہتا ہے رزق کو کشادہ کرتا ہے اور (جس کے لئے چاہتا ہے) تنگ کردیتا ہے۔ بے شک وہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔

1۔ ''فاطر'' پھاڑ کر پیدا کرنے والا۔ اُس نے آسمانوں اور زمین کو عدم کا پردہ پھاڑ کر پیدا کیا ہے۔

2۔ اس نے انسانوں میں بھی جوڑے بنائے ہیں اور حیوانوں میں بھی۔ جن کے ذریعے وہ ان کی نسل کو پھیلاتا ہے۔ یہاں جنسی تولید کی طرف اشارہ ہے۔

3۔ ہر چیز کے جوڑے ہیں، ہر چیز کی اقسام ہیں مگر اللہ واحدہٗ لاشریک ہے۔ ''اس جیسی کوئی شے نہیں''۔

لیس کمثلہٖ شیءٌ (اس کی مثل کوئی شے نہیں)

یہ جملہ اللہ تعالیٰ کی معرفت کی بنیاد ہے۔ وہ ہر لحاظ سے لامحدود اور لامتناہی ہے۔ وہ اپنے جیسا بس اکیلا آپ ہی ہے۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَثَّ فِيْهِمَا مِنْ دَآبَّةٍ ۚ وَهُوَ عَلٰى جَمْعِهِمْ اِذَا يَشَآءُ قَدِيْرٌ ۧ (42:29)

اور اُسی کی نشانیوں میں سے ہے آسمانوں اور زمین کی تخلیق۔ اور وہ ذی حیات مخلوق جو اس نے ان میں پھیلائی ہے اور وہ ان کو جمع کرنے پر بھی، جب چاہے، قادر ہے۔

''دابہ'' چلنے والی مخلوق، ذی حیات مخلوق، جاندار۔

اس کا اطلاق ہر زندہ مخلوق پر کیا جاسکتا ہے اُن حیوانات پر بھی جو خوردبین کے بغیر نظر نہیں آتے اور انسان پر یا انسان جیسی مخلوق پر بھی جو عقل و شعور رکھتی ہے۔ وسیع تر معنوں میں اس کا اطلاق پودوں پر بھی کیا جاسکتا ہے کیونکہ وہ بھی جاندار مخلوق ہیں، ان میں پروٹو پلازم (Protoplasm) پایا جاتا ہے جو زندگی کی بنیاد ہے، ان میں نشو و نما اور بالیدگی بھی پائی جاتی ہے۔ نشوونما اور بالیدگی بھی ایک قسم کی حرکت ہے جو پودوں میں بھی پائی جاتی ہے۔

اس آیتِ کریمہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ''آسمانوں'' یعنی زمین سے دور خلاء میں دوسرے اجرام سماوی (سیاروں وغیرہ) پر بھی زندہ اشیاء پائی جاسکتی ہیں۔ اس اعتبار سے یہ آیت واضح طور پر ماورائے زمین زندگی (Extraterrestrial life) کی موجودگی کی پیش گوئی کررہی ہے۔

''جب چاہے انھیں جمع کرنے پر بھی قادر ہے'' کا ایک مفہوم یہ بھی

ہوسکتا ہے کہ زمین اور دوسرے اجرامِ سماوی کی مخلوقات مستقبل میں بھی ایک دوسرے سے رابطہ کرنے میں کامیاب ہوجائیں گی۔

وَمِنْ اٰيٰتِهِ الْجَوَارِ فِى الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ ۝ اِنْ يَّشَاْ يُسْكِنِ الرِّيْحَ فَيَظْلَلْنَ رَوَاكِدَ عَلٰى ظَهْرِهٖ ۭ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ۝ (42:32-33)

اور اُسی کی نشانیوں میں سے ہیں سمندر میں چلنے والے پہاڑوں کی مانند جہاز، اور اگر وہ چاہے تو ہوا کو ساکن کردے، پھر وہ سمندر کی سطح پر ٹھہرے ہی رہ جائیں۔ بے شک اس میں نشانیاں ہیں ہر اُس شخص کے لئے جو بہت صبر کرنے والا بڑا شکر گزار ہے۔

"الجوار"، "الجاریہ" کی جمع ہے، جہاز اور کشتی کو کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ سطحِ آب پر رواں رہتی ہے۔

"اعلام"، "علم" کی جمع ہے جس کا یہاں پرمعنی پہاڑ بھی ہے اور محل بھی، لیکن اصل میں اس کے معنی نشان اور علامت کے ہیں، پہاڑوں یا محلات کو بھی اس لئے علَم کہا جاتا ہے کہ وہ دور سے نمایاں نظر آتے ہیں۔

بادبانی کشتیاں مکمل طور پر ہوا کی حرکت پر انحصار رکھتی ہیں۔ قدیم زمانے میں ان کی اہمیت بہت زیادہ تھی۔ کرہ ارض پر ہوائیں ایک باقاعدہ نظام کے تحت چلتی ہیں۔ موجودہ زمانے میں جہازوں اور کشتیوں کو چلانے کے لئے طاقتور انجنوں سے مدد لی جاتی ہے لیکن ہواؤں کا اب بھی بڑا کردار ہے۔

کائنات کے اسرار کے مطالعہ، مشاہدہ، غور وفکر اور نتائج کے استنباط کے لئے صبّار (بڑا صبر کرنے والا) اور شکور (بہت شکر کرنے والا) ہونے کی ضرورت ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ کائنات کے رازوں سے آگاہی خود شکر ہی کی ایک قسم ہے جب کہ ان تک پہنچنے کے لئے صبر طلب محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔

الَّذِىْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّجَعَلَ لَكُمْ فِيْهَا سُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۚ وَالَّذِىْ نَزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ ۚ فَاَنْشَرْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا ۚ كَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ ۞ وَالَّذِىْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا وَجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْفُلْكِ وَالْاَنْعَامِ مَا تَرْكَبُوْنَ ۙ (43:10-12)

(اللہ وہ ہے) جس نے تمہارے لئے زمین کو گہوارہ[1] بنایا ہے اور اس میں تمہارے لئے راستے[2] رکھے ہیں کہ تم منزلِ مقصود تک پہنچ سکو۔ اور جس نے آسمان[3] سے ایک اندازہ کے مطابق پانی برسایا ہے۔ پھر ہم نے اس سے مردہ زمین کو زندگی عطا کی۔ اسی طرح تمہیں بھی ازِسرنو پیدا کیا جائے گا۔

اور جس نے تمام گونا گوں قسم کی چیزیں پیدا کی ہیں[4]۔ اور تمہارے لئے کشتیاں اور چوپائے بنائے ہیں جن پر تم سوار ہوتے ہو[5]۔
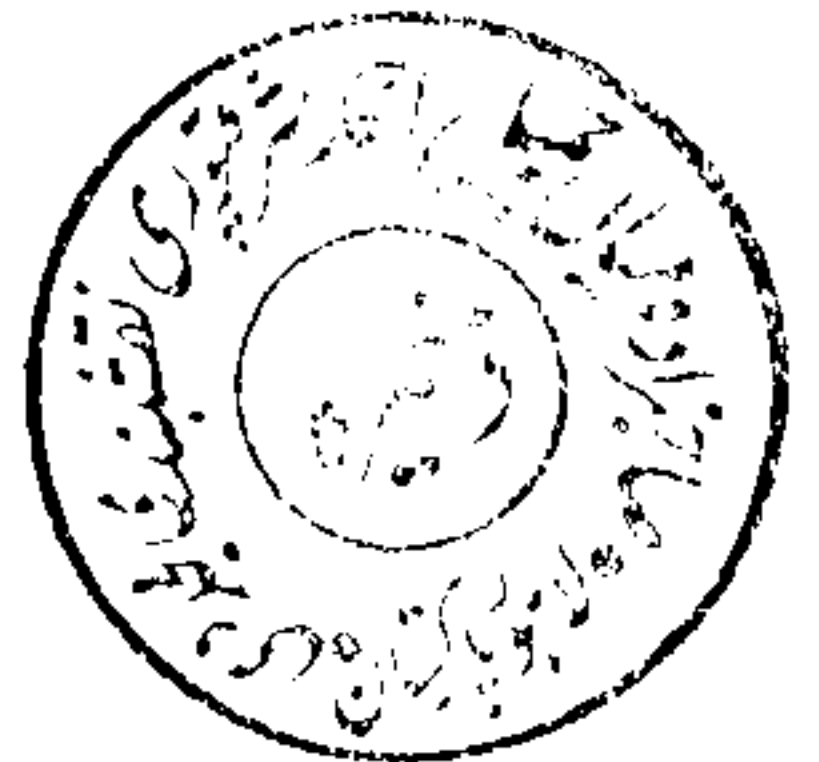
1۔اصل لفظ ''مہد'' استعمال ہوا ہے۔ جس کا معنی گہوارہ یا پنگھوڑا ہے، بچے کے آرام کی جگہ، یعنی زمین کو تمہارے لئے بمنزلہ گہوارے کے تخلیق کیا ہے جہاں تم آرام کے ساتھ اپنی زندگی بسر کرسکتے ہو۔

لفظ ''مہد'' (گہوارہ، پنگھوڑا) سے ضمنی طور پر زمین کی محوری اور مداری حرکت پر بھی استدلال کیا جاسکتا ہے۔ زمین سورج کے گرد گھوم رہی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ گویا ایک عظیم جھولا ہے جو مخلوق کو لے کر خلا میں حرکت کررہا ہے۔

''مہد'' کا معنی پھیلائی ہوئی، یا بچھائی ہوئی چیز بھی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے زمین کو انسانوں اور دوسری مخلوق کے لئے پھیلایا، بچھایا اور ہموار کیا ہے تاکہ وہ اس پر اپنے اپنے مقصدِ حیات کے مطابق زندگی گزار سکیں۔

2۔''سُبُل''،''سبیل'' کی جمع ہے، معنی ہے راستے۔ اس کا اطلاق خشکی کے راستوں پر بھی ہوتا ہے، بحری راستوں پر بھی اور ہوائی راستوں پر بھی۔

اللہ تعالیٰ نے زمین میں طرح طرح کے راستے بنائے ہیں جیسے درے، وادیاں اور دوسرے راستے۔ تاکہ انسان آسانی سے ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف حرکت کرسکے۔ وسیع تر معنوں میں راستے سے کسی کام کے کرنے کا ذریعہ اور طریقہ اور وسیلہ بھی مراد لیا جاسکتا ہے۔ مقصد ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کو وسیع بنایا ہے اور اس میں طرح طرح کے مادی اور معنوی راستے اور ذرائع پیدا کردیئے ہیں تاکہ انسان بہ آسانی اپنے رب کی معرفت کا سفر طے کرسکے۔ کائنات کو Explore کرے، اور اس کے مختلف خطوں کو تلاش کرے۔

3۔''آسمان سے'' یعنی بلندی سے، یا بادل سے۔ عربی زبان میں ''سماء'' کا معنی ہے ہر وہ چیز جو آپ سے بلندی پر ہے، اسی لئے چھت کو بھی سماء کہتے ہیں۔(تفصیل کے لئے دیکھیں راقم کی کتاب ''کائنات قرآن اور سائنس''۔)

4۔زوج سے مراد یہاں نوع اور قسم ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے قسم قسم کی مخلوق پیدا کی ہے، کوئی جاندار کوئی بے جان، کوئی نر کوئی مادہ۔ اسی طرح مختلف رنگوں اور ذائقوں کی اشیاً اور حیوانوں اور پودوں کی مختلف انواع و اقسام مثلاً پرندے، مچھلیاں، حشرات وغیرہ۔

5۔یہاں کشتیوں اور جانوروں کی سواریوں کی طرف اشارہ ہے۔ یہ سواریاں انسان کی زندگی کو آسان بناتی اور اس کی زندگی میں تیزی لاتی ہیں۔

سورہ الجاثیہ (45)

اِنَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ لَاٰیٰتٍ لِّلۡمُؤۡمِنِیۡنَ ؕ وَفِیۡ خَلۡقِکُمۡ وَمَا یَبُثُّ مِنۡ دَآبَّۃٍ اٰیٰتٌ لِّقَوۡمٍ یُّوۡقِنُوۡنَ ۙ وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّهَارِ وَمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ رِّزۡقٍ فَاَحۡیَا بِهِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا وَتَصۡرِیۡفِ الرِّیٰحِ اٰیٰتٌ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ ۝(45:3-5)

بے شک آسمانوں اور زمین میں اہل ایمان کے لئے بڑی نشانیاں ہیں[1]۔ اور (اسی طرح) خود تمہاری خلقت میں[2]، اور جانداروں میں بھی جو وہ زمین میں پھیلا رہا ہے، یقین کرنے والوں کے لئے نشانیاں ہیں۔ اور رات اور دن کے ایک دوسرے کے پیچھے چلے آنے میں، اور اُس ذریعۂ رزق میں جو اللہ آسمان سے اُتارتا ہے پھر اس کے ذریعے زمین کو اُس کے مردہ ہوجانے کے بعد زندہ کردیتا ہے، اور ہواؤں کی گردش میں نشانیاں ہیں[3] عقل سے کام لینے والوں کے لئے۔

1۔ آسمانوں اور زمین میں اللہ کی ہستی، وحدانیت اور قدرت کی گوناگوں نشانیاں موجود ہیں۔ مگر ان نشانیوں سے نورِ معرفت وہی حاصل کرسکتے ہیں جو ایمان لانا چاہیں۔

2۔اسی طرح خود انسانوں کی خلقت میں اور دوسرے تمام جانداروں

میں نشانیاں ہیں۔ ان چیزوں میں خالق کی قدرت کی جھلک وہی دیکھ سکتے ہیں جو یقین کی دولت سے مالامال ہوں۔

3۔اسی طرح شب و روز کی گردش میں، بارش کے برسنے میں، نباتات کے اُگنے میں اور ہواؤں کی گردش میں بھی اللہ تعالٰی کی ہستی اور قدرت کی نشانیاں ہیں مگر ان لوگوں کے لئے جوعقل و دانش سے کام لیتے ہیں۔

قرآنِ مجید نے ان آیات میں اہل ایمان، اہل یقین اور اہل عقل کو جھنجھوڑتے ہوئے کائنات اور اس کے کئی مظاہر کو اللہ کی ہستی اور قدرت کی نشانی کے طور پیش کیا ہے۔

۱۔آسمان اور زمین یعنی کائنات (Universe)

۲۔انسان کی تخلیق

۳۔حیوانات

۴۔شب و روز کی گردش

۵۔بادلوں سے بارش کا برسنا

۶۔ نباتات کا اُگنا

۷۔ہواؤں کی گردش

قرآن کا یہ اسلوب ہے کہ وہ اپنی بات تھونپتا نہیں بلکہ دلائل کے ساتھ سمجھاتا ہے۔ اور دلائل وہ کائنات اور اس کے مظاہر بشمول نباتات و حیوانات سے دیتا ہے کیونکہ یہ وہ چیزیں ہیں جنھیں ہر کوئی دیکھ اور سمجھ سکتا ہے۔ تفصیل کئی مقامات پر گزر چکی ہے۔

اَللّٰہُ الَّذِیْ سَخَّرَ لَکُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِیَ الْفُلْکُ فِیْہِ بِاَمْرِہٖ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِہٖ وَلَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ ﴿ۚ﴾ وَسَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْہُ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ ○ (45:12-13)

اللہ وہ ہے جس نے تمہارے لئے سمندر کو مسخر کر رکھا ہے[1]۔ تاکہ اس کے حکم سے اس میں کشتیاں

چلیں اور اس لئے کہ تم اُس کا فضل تلاش کرو، اور تا کہ تم اس کے شکر گزار رہو۔

اور اس نے تمہارے لئے مسخر کر رکھا ہے جو کچھ کہ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ کہ زمین میں ہے سب کو اپنے حکم سے[2]۔ بے شک اس میں بڑی نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لئے جو غور و فکر کرتے ہیں[3]۔

1۔ سمندروں کو تمہاری خدمت میں لگا رکھا ہے، انھیں ایسا بنایا ہے کہ تم ان سے اپنی خدمت کا کام لے سکتے ہو۔ مقصد یہ ہے کہ:

ا۔اس میں اللہ کے حکم سے کشتیاں چلیں یعنی تم اس سے نقل وحمل کے ذریعہ کا کام لو۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کا فضل تلاش کرو:الف: سمندروں کو نقل وحمل کا ذریعہ بنا کر تجارت کی راہ سے، اور ب:خود سمندروں میں سے تازہ گوشت حاصل کرکے۔ج:اس کے علاوہ سمندروں کے دوسرے فائدے بھی ہیں۔

۳۔مقصد یہ ہے کہ تمہارے اندر شکر گزاری کا احساس پروان چڑھے۔

2۔ اللہ نے اپنے حکم سے آسمانوں اور زمین کی ساری چیزوں کو ایسا بنایا ہے کہ وہ انسان کی خدمت کررہی ہیں اور انسان اُن سے اپنی خدمت لے سکتا ہے۔ ان سے طرح طرح سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر زمین کے لئے سورج روشنی کا منبع ہے۔ اس کی روشنی سے پودوں میں غذا بننے کا عمل (ضیائی تالیف Photosynthesis) ہوتا ہے، پانی بخارات کی شکل اختیار کرتا ہے جس سے بادل بنتے ہیں، ہوا کے دباؤ میں فرق پیدا ہوتا ہے جس سے ہوا چلتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ مزید یہ کہ اس توانائی (شمسی توانائی : Solar energy) کو انسان بے شمار دوسرے مقاصد کے لئے بھی استعمال کرسکتا ہے۔

تسخیر کی تشریح کے لئے دیکھیں سورہ ابراہیم 14:32-34۔

3۔ان سب میں اللہ تعالیٰ کی ہستی اور قدرت کی گوناگوں نشانیاں ہیں مگر ان سے اللہ کی معرفت کی روشنی وہی حاصل کر سکتے ہیں جو غور و فکر کرتے ہیں۔ جو اپنی تفکر کی قوت کو کام میں لاتے ہیں، تواہمات اور تعصبات سے بلند ہو کر حقیقت کو جیسی کہ وہ ہے دیکھ سکتے ہیں۔

سورہ الاحقاف (46)

مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَمَّآ اُنْذِرُوْا مُعْرِضُوْنَ ○ (46:3)

ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے نہیں پیدا کیا مگر حق کے ساتھ[1] اور معین مدت کے لئے، اور وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا ہے، اس چیز سے اعراض کئے ہوئے ہیں جس سے انھیں آگاہ کیا جاتا ہے۔

1۔یعنی ایک غایت اور مقصد کے تحت۔ اللہ تعالیٰ نے کائنات اور اس کی ایک ایک چیز کو مقصد کے تحت پیدا کیا ہے۔

2۔ ہر چیز ایک مقررہ مدت کے لئے ہے۔ کائنات کی عمر انسانی پیمانوں کے اعتبار سے بہت طویل سہی مگر اُسے ایک روز ختم ہونا ہے۔

3۔ جو لوگ کفر پر جمے ہوئے ہیں اور جنھوں نے انکارِ خدا کو اپنی زندگی کا شعار بنایا ہوا ہے ان کا مسئلہ یہ ہے کہ انھیں یہ بات نظر نہیں آتی کہ کائنات کا ایک مقصد ہے اور یہ کہ یہ ہمیشہ کے لئے نہیں ہے اسے ایک روز اپنے اختتام کو پہنچنا ہے۔

''کائنات کی مقصدیت'' قرآن کے بنیادی دعووں میں سے ہے۔ ایسے لوگ ہر عہد میں ہوتے ہیں جو اس حقیقت سے روگردانی کرتے ہیں۔ دورِجدید میں بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ کائنات کے پیچھے کارفرما مقصدیت کا انکار کرتے ہیں وہ اس کی مجموعی توجیہہ کرنے سے قاصر ہیں۔

اَفَلَمْ يَنْظُرُوْٓا اِلَى السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنٰهَا وَزَيَّنّٰهَا وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ ۝ وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ ۢ بَهِيْجٍ ۙ۝ تَبْصِرَةً وَّذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ ۝ وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّحَبَّ الْحَصِيْدِ ۙ۝ وَالنَّخْلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيْدٌ ۙ۝ رِّزْقًا لِّلْعِبَادِ ۙ وَاَحْيَيْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا ۭ كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ ۝ (50:6-11)

تو کیا انھوں نے اپنے اوپر پھیلے ہوئے آسمان کی طرف نظر نہیں کی[1]۔ کس طرح ہم نے اسے بنایا اور آراستہ کیا ہے۔ اور اس میں کوئی رخنہ نہیں[2]۔

اور زمین کو ہم نے پھیلایا اور اس میں پہاڑ پیدا کیے[3] اور اس میں ہر قسم کی خوش منظر چیزیں اُگائیں[4]۔ یہ (آثارِ قدرت) بصیرت افروز اور یاد دہانی ہیں ہر اس بندے کے لئے جو (اپنے رب کی طرف) متوجہ ہوتا ہے[5]۔

اور ہم نے آسمان سے[6] بابرکت پانی برسایا جس سے ہم نے باغ بھی اُگائے اور کاٹی جانے والی فصلیں بھی۔ اور کھجوروں کے بلند و بالا درخت بھی جن

میں تہہ بہ تہہ خوشے لگتے ہیں(7) بندوں کی روزی کے
لئے۔ اور ہم نے اس سے مردہ زمین کو زندہ کیا(8)۔
اسی طرح (تمہارا) ازسرِ نو پیدا ہونا ہے۔

1۔ یہاں نظر کرنے اور دیکھنے سے مراد غوروفکر کے ساتھ مشاہدہ کرنا ہے۔ بصیرت کی نظر سے دیکھنا جو کائنات کی حقیقتِ اصلی کو بے نقاب کرسکے۔ اس کا نظم اور اس کا حسن دیکھنے والے کو اس نتیجے تک پہنچا سکے کہ اس کا کوئی خالق ہے۔

''سمأ'' (آسمان) سے یہاں مراد وہ وسیع کائناتی خلاء (Cosmic Space) ہے جس میں کہکشائیں، ستارے، سیارے اور دوسرے اجسام موجود ہیں۔ یہی وہ ''آسمان'' ہے جسے ستاروں کی زینت سے آراستہ کیا گیا ہے۔

2۔''اس میں کوئی رخنہ نہیں'' یعنی اس میں کوئی تخلیقی نقص غیرموزونیت اور بدنظمی نہیں۔ پوری کائنات میں یکساں قوانین کی کارفرمائی ہے۔

3۔زمین کو ہم نے پھیلایا، ہموار کیا یعنی اُسے ایسا بنایا کہ انسان (اور دوسری مخلوق) اس پر باآسانی زندگی بسر کرسکتی ہے۔(مزید دیکھیں سورہ الرعد 13:2-4 نوٹ 6۔)

یادر رہے کہ زمین کا پھیلایا جانا اُس کے کروی ہونے کے منافی نہیں جیسا کہ اُس پر وسیع پہاڑی سلسلوں کا ہونا اُس کے گول ہونے کی نفی نہیں کرتا۔ ساتھ ہی فرمایا کہ اس میں پہاڑ بنائے۔ یعنی زمین ایسی بھی ہموار نہیں کہ اُس سطح بالکل مسطح ہو بلکہ اس میں اُونچے اونچے پہاڑ بنائے۔ پہاڑوں کے پیدا کرنے کے لئے ''القینا'' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ یہ لقاء کے مادے سے ہے، اس کے معنی اصل میں تو کسی شے کو اس طرح کے ڈالنے کے ہیں کہ نظر آتی رہے پھر عرف میں اس کا استعمال ہر طرح کے ڈالنے کے معنی میں ہونے لگا (مفردات)۔ اس کا معنی بنانا بھی ہے۔ اور یہاں اسی معنی میں ہے۔ یعنی

''ہم نے اس میں پہاڑ بنائے ہیں۔''

اس میں اشارہ اس طرف بھی ہے کہ پہاڑ محض زمین پر رکھے ہوئے

نہیں ہوتے بلکہ ان کی جڑیں زمین میں گہرائی تک گئی ہوئی ہوتی ہیں۔

4۔ **بھیج**: تروتازہ، شگفتہ، دلوں کو لبھانے والی، خوش منظر، رونق افروز۔

زوج: یہاں نوع، قسم، جنس کے معنی میں ہے۔

اللہ تعالیٰ نے کثرت سے خوش منظر اور دلوں کو لبھانے والے نباتات اُگائے ہیں جن میں حیرت انگیز تنوع (Variety) پایا جاتا ہے۔

5۔ زمین سے طرح طرح کی خوش منظر چیزوں کا اُگنا بلکہ کائنات کا ہر مظہر اپنے اندر بصیرت افروزی اور یاد دہانی کا سامان رکھتا ہے مگر اس سے فائدہ وہی اُٹھاتے ہیں جو اپنے اندر سچائی کی آواز سننے کی صلاحیت پیدا کرتے ہیں۔

6۔ ''آسمان سے'' یعنی بادل سے یا بلندی سے۔ ''مبارک پانی'' یعنی صاف ستھرا اور ہر قسم کی آلودگی سے پاک پانی۔

پانی زندگی کی بنیادی ضرورت ہے۔ پھلوں کے باغات ہوں یا فصلوں کے کھیت پانی ہی سے اُگتے ہیں۔

7۔ ''باسقات''، ''باسقه'' کی جمع ہے معنی ہے بلند و بالا، ''طلع'' کھجور کے درخت کا پھل جب وہ ظاہر ہونے لگتا ہے، خوشہ، گچھہ۔

''نضید'' تہہ بہ تہہ گندھے ہوئے۔ ایک دوسرے پر سوار، ایک دوسرے سے ملے ہوئے۔

مشیت الٰہی نے کھجور کے لمبے لمبے درخت پیدا کئے ہیں جن کے پھلوں کے گچھوں میں دانے گندھے ہوتے ہیں۔ یعنی تہہ بہ تہہ خوشے۔

8۔ مردہ زمین کیسے زندہ ہوتی ہے: جب بے آب و گیاہ زمین کو پانی ملتا ہے اور کسان اُس میں فصلوں اور دوسرے نباتات کے بیج بوتا ہے یا خود رو پودوں کے بیج ہواؤں اور دوسرے ذرائع سے زمین میں بکھرتے ہیں تو وہ پانی جذب کرکے اُگنا شروع کردیتے ہیں۔ اور پھر باغات، کھیت اور جنگلات ہرے بھرے ہوجاتے ہیں۔ زمین کی رونقیں واپس آجاتی ہیں۔

جس خدا نے یہ نظام قائم کیا ہے وہ یقیناً اس بات پر بھی قادر ہے کہ مردوں کو دوبارہ زندگی عطا کردے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا
فِىْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ۖ وَّمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ ﴿50:38﴾

اور بے شک ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو
کچھ ان کے درمیان ہے چھ ادوار میں تخلیق کیا، اور
ہمیں تھکان نے چھوا تک نہیں۔

"یــــوم": پہلے کئی دفعہ تشریح کی جاچکی کہ عربی زبان میں یوم کا بنیادی معنی عرصۂ وقت یا دورانیہ وقت یا دور ہے۔

"آسمانوں اور زمین" (کائنات) کی تخلیق چھ ادوار میں ہوئی۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے کائنات کو تدریجی طور پر پیدا فرمایا (تفصیل کے لئے دیکھیں سورہ حم سجدہ 41:9-12۔

"لغوب": تھکان، تھکاوٹ، خستگی۔ یعنی اللہ کو کائنات کی تخلیق سے کوئی تھکاوٹ لاحق نہیں ہوئی۔ وہ تخلیقی عمل سے علیحدہ نہیں ہوا بلکہ عرشِ قدرت پر متمکن ہے، کائنات کی تدبیر کررہا ہے۔ اس کی خلاقیت اور ربوبیت کی کار فرمائی مسلسل طور پر جاری ہے۔ ہر آن وہ ایک نئی شان میں جلوہ گر ہوتا ہے (سورہ رحمٰن)۔

اس میں یہودیوں اور عیسائیوں کے اس تصور کی بھی تردید ہے جس کے مطابق خدا نے کائنات کی تخلیق چھ دنوں میں کی اور ساتویں دن آرام کیا۔ کنگ جیمز کی بائبل میں ہے۔

"And He rested on the seventh day."

(Genesis 2:2)

نئے بین الاقوامی ورژن میں ہے۔

So on the seventh day He had rested form all His work.

اردو ترجمہ میں He rested کو فارغ ہوا سے بدل دیا گیا ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ اُسے کوئی تھکاوٹ نہیں ہوئی کہ وہ آرام کرتا اور تخلیقی عمل سے خود کو علیحدہ کرلیتا۔ اس کی تخلیقی کارفرمائی بلا انقطاع مسلسل طور پر جاری ہے۔

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُكِ ۙ (51:7)

قسم ہے دھاریوں والے آسمان کی۔ یا
کہکشاں والے آسمان کی قسم۔

حُبُک جمع ہے حباک کی۔ اس لفظ کے متعدد معنی بیان کئے گئے ہیں۔ وہ کپڑا جس کو بننے والے نے بڑی نفاست اور خوبصورتی سے بنا ہوا تو عرب کہتے ہیں:

حبک الثوب یحبکہ حبکا

''کپڑے کی بناوٹ میں جو دھاریاں ہوتی ہیں اُن کو حُبُک کہا جاتا ہے۔'' (معارف القرآن)۔

ہماری کہکشاں (ملکی وے) کو اگر اوپر سے دیکھا جائے تو ایسی نظر آئے گی۔
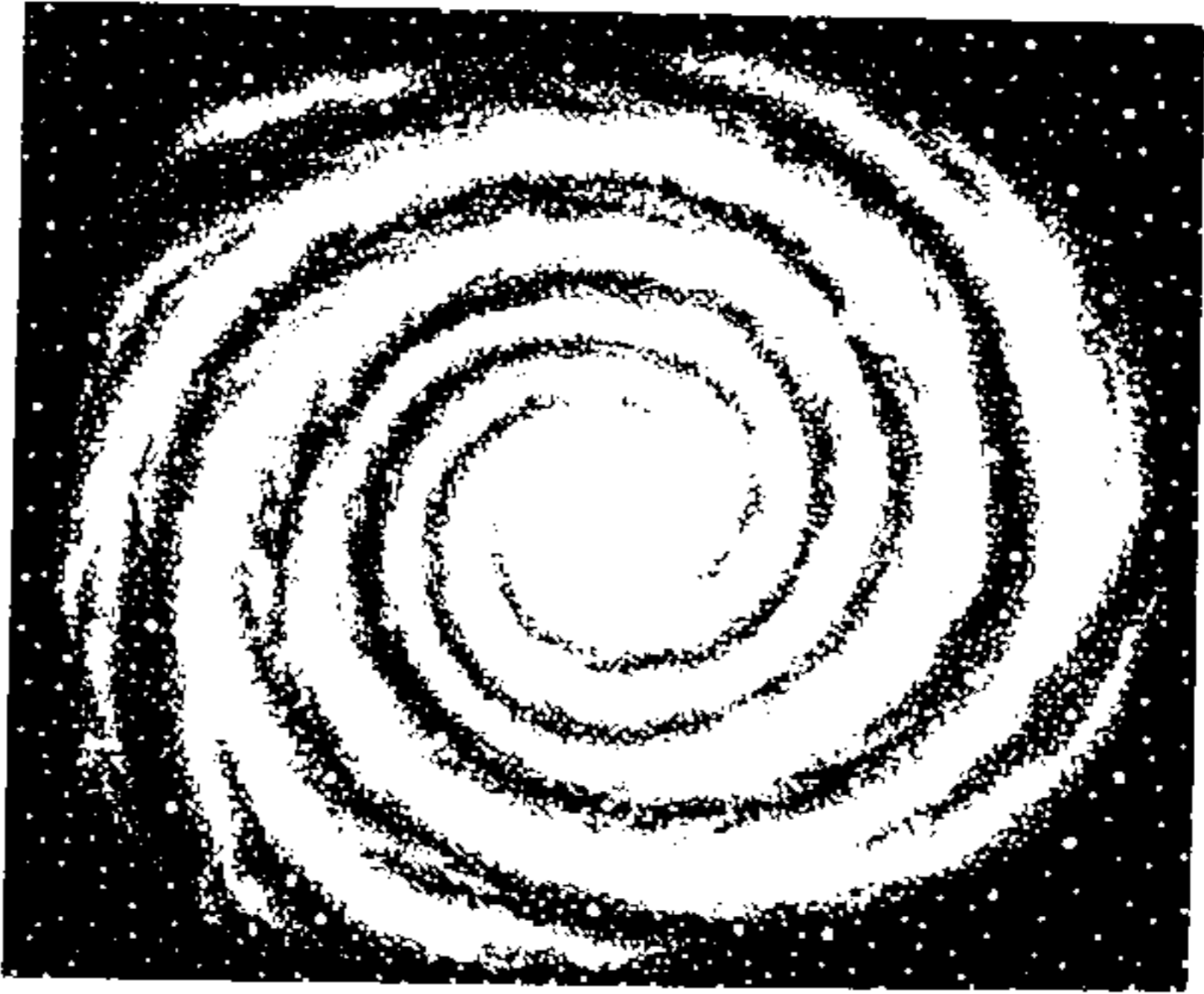
ملکی وے کو اگرایک جانب سے دیکھا جائے تو ایسی نظر آئے گی۔
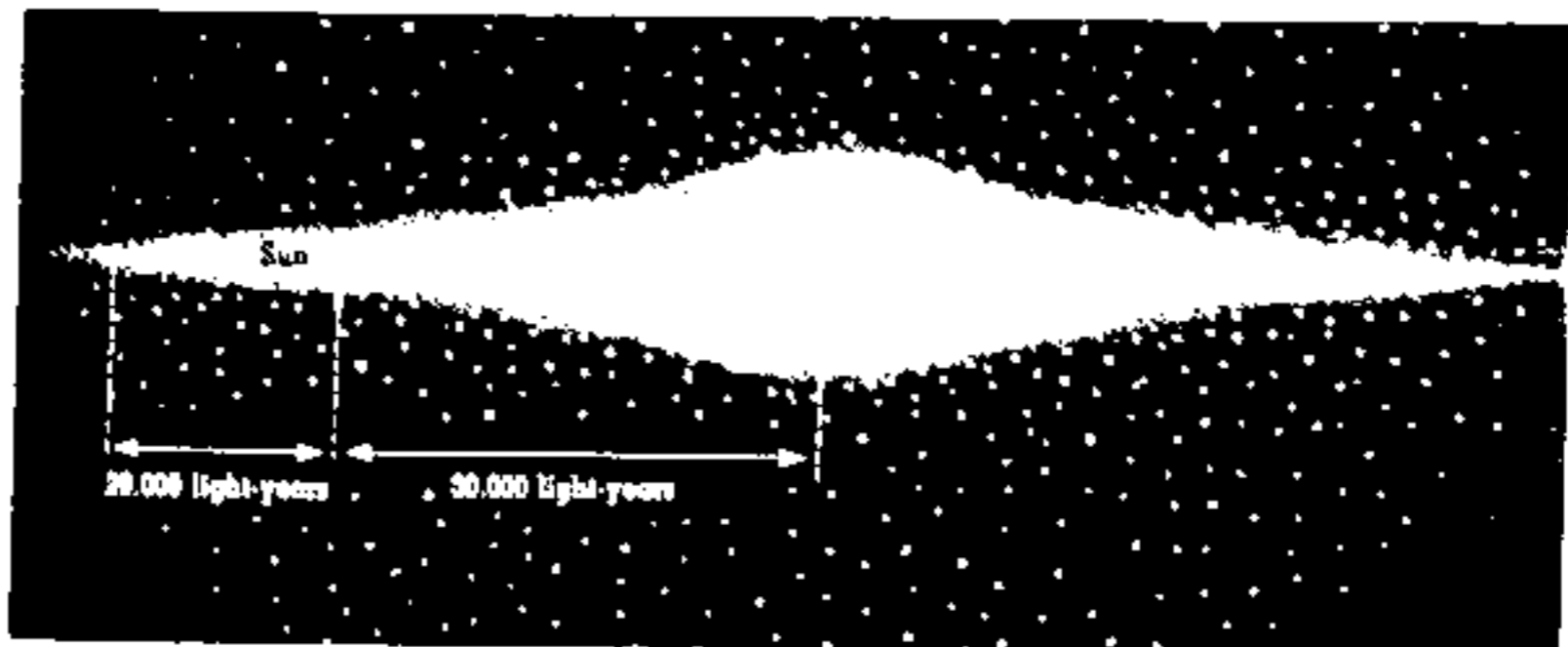
حُبُک: اُن لہروں کو بھی کہتے ہیں جو ہوا کے چلنے سے ریت پر یا ساکن پانی میں پیدا ہوتی ہیں۔ (ابن کثیر)

اس کا معنی راستے بھی ہیں۔ حبک کہکشاں کو بھی کہتے ہیں نیز گھنگھریالے بالوں میں جو سلوٹیں ہوتی ہیں انہیں بھی حبک کہا جاتا ہے (ضیاء القرآن)۔

اگر حبک کا معنی طرائق یعنی راستے لیا جائے تو آیت کا مفہوم ہوگا: راستوں والے آسمان کی قسم۔ وہ آسمان جس میں ستاروں کی مختلف قسم کی حرکات کے باعث ان گنت راستے بنے معلوم ہوتے ہیں جو مختلف اور متباین سمتوں میں جارہے ہیں۔
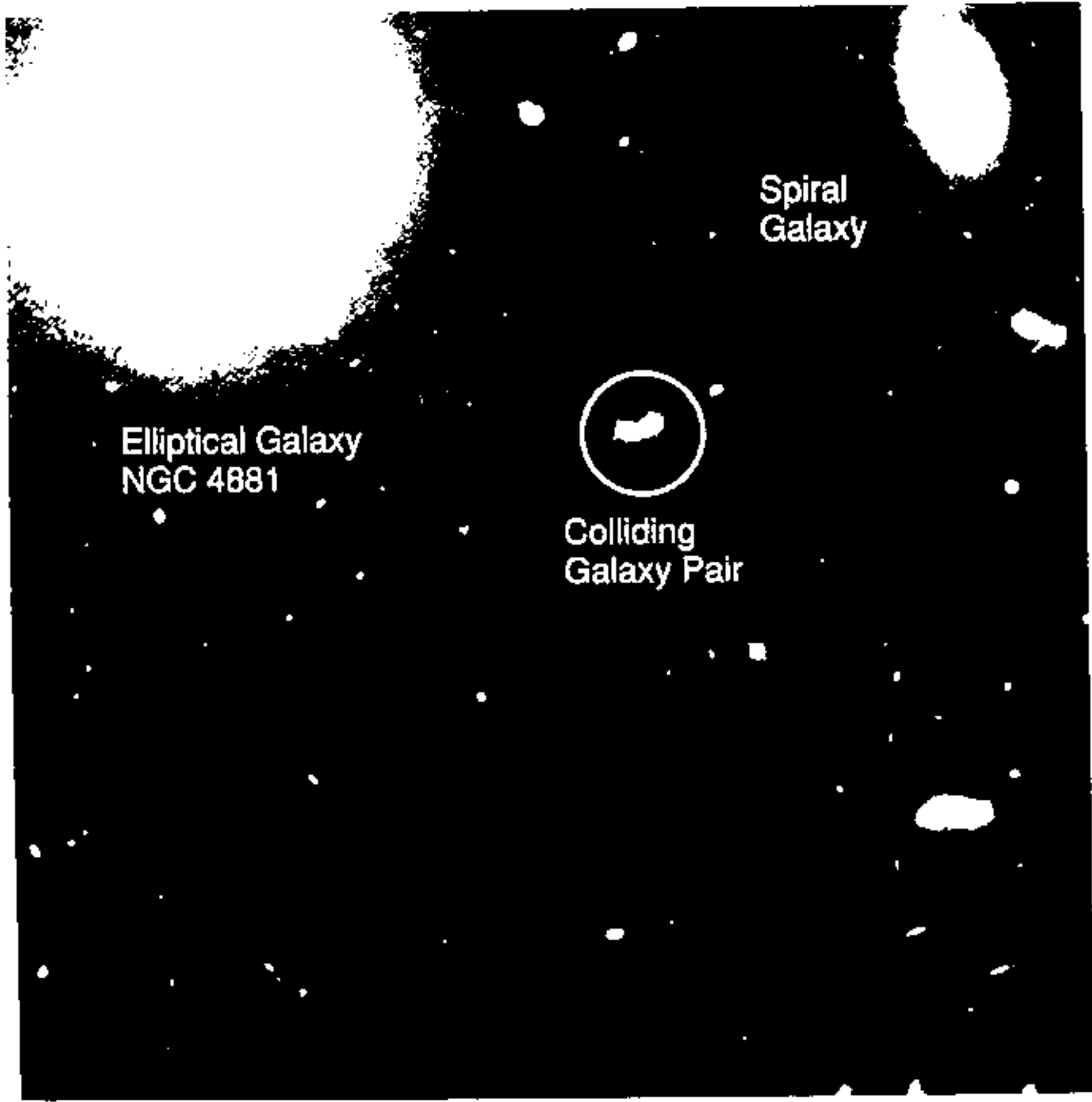
کہکشائوں کا کوما مجموعہ۔ زمین سے تقریباً 300ملین نوری سال کے فاصلے پر۔ اس میں تقریباً ایک ہزار بڑی اور ہزاروں چھوٹی کہکشائیں ہیں۔

''کہکشاں کا معنی بھی انسب ہے...... یعنی کہکشاں والے آسمان کی قسم'' (ضیاء القرآن)۔

ہماری کہکشاں، یعنی وہ کہکشاں جس کا ہمارا شمسی نظام حصہ ہے (جسے انگریزی میں Milky way دودھیا راستہ) مرغولے دار (Spiral) شکل کی حامل ہے۔ دوسری کہکشاؤں کے بارے میں اب تک جو معلومات حاصل ہوسکی ہیں اُن کے مطابق اُن میں سے بہت سی واضح طور پر مرغولے دار ہیں۔

حبک میں تسلسل اور درازی کا مفہوم بھی ہے اور بل کھا کر مڑنے کا بھی (لغات القرآن۔ پرویز) کہکشاں میں یہ سب خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ کہکشائیں آسمانی فضا میں اسی طرح نظر آتی ہیں جس طرح ریت یا پانی کی سطح پر ہوا سے بننے والی لہریں، یا کپڑے پر دھاریاں وغیرہ۔

وَفِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ ۙ وَفِیْٓ اَنْفُسِکُمْ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝ (51:20-21)

اور زمین میں نشانیاں ہیں اہل یقین کے لئے[1]۔

اور خود تمہارے وجود میں بھی (نشانیاں ہیں)، کیا تم دیکھتے نہیں ہو[2]؟

1۔زمین میں اللہ تعالٰی کی ہستی اور قدرت کی انگنت نشانیاں ہیں مگر ان کو دیکھنے کے لئے یقین کی نظر چاہئیے۔ زمین کی کمیت (Mass)، اس کا حجم (Volume) اور جسامت، اس کا سورج سے فاصلہ، اس کی سورج کے گرد گردش، اس کی اپنے محور پر گردش، اس کا اپنے مدار پر 23 درجے کا جھکاؤ، اس کا کرۂ ہوائی وغیرہ۔

2۔اسی طرح خود انسانی وجود میں اُس کی بے شمار نشانیاں ہیں۔ انسان کا نفسیاتی وجود، حیاتیاتی وجود، اور معاشرتی وجود غرض ہر اعتبار سے انسانی وجود اپنے اندر سوچنے سمجھنے والوں کے لئے قدرتِ الٰہی کی گوناگون نشانیاں رکھتا ہے۔

وَالسَّمَآءَ بَنَیْنٰهَا بِاَیْىدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ ۝ وَالْاَرْضَ فَرَشْنٰهَا فَنِعْمَ الْمٰهِدُوْنَ ۝ وَمِنْ كُلِّ شَیْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَیْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝

(51:47-49)

اور آسمان کو ہم نے قوت سے بنایا اور بے شک ہم ہی وسعت دینے والے ہیں[1]۔ اور زمین کو ہم نے بچھایا، اور ہم کیا ہی خوب بچھانے والے ہیں[2]۔ اور ہم نے ہر چیز کے جوڑے بنائے[3]۔ تاکہ تم یاد دہانی حاصل کرو۔

1۔''ائید'' : قوت، طاقت، قدرت۔

''سماء'' یہاں سماء (آسمان) کا لفظ کہکشاؤں کے اس وسیع مجموعے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے جسے آج ہم کائنات (Universe) کہتے ہیں۔

''مُوسِعُوْن'' یہ ''اَوْسَع'' سے ہے۔ یہ متعدی اور لازم دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ متعدی ہونے کی صورت میں اس جملہ کا مفہوم ہوگا کہ ہم نے اُسے وسیع اور کشادہ بنایا ہے، اور لازم ہونے کی صورت میں مطلب ہوگا ہم بڑی وسعت کے مالک ہیں، ہم ہی وسعت دینے والے ہیں، یا ہم ہی اُسے پھیلا رہے ہیں۔

عظیم انفجار (بگ بینگ) سے کائنات کی تخلیق۔
مختلف مراحل پر درجہ حرارت اور ذرّات کی تشکیل
دکھائی گئی ہے۔
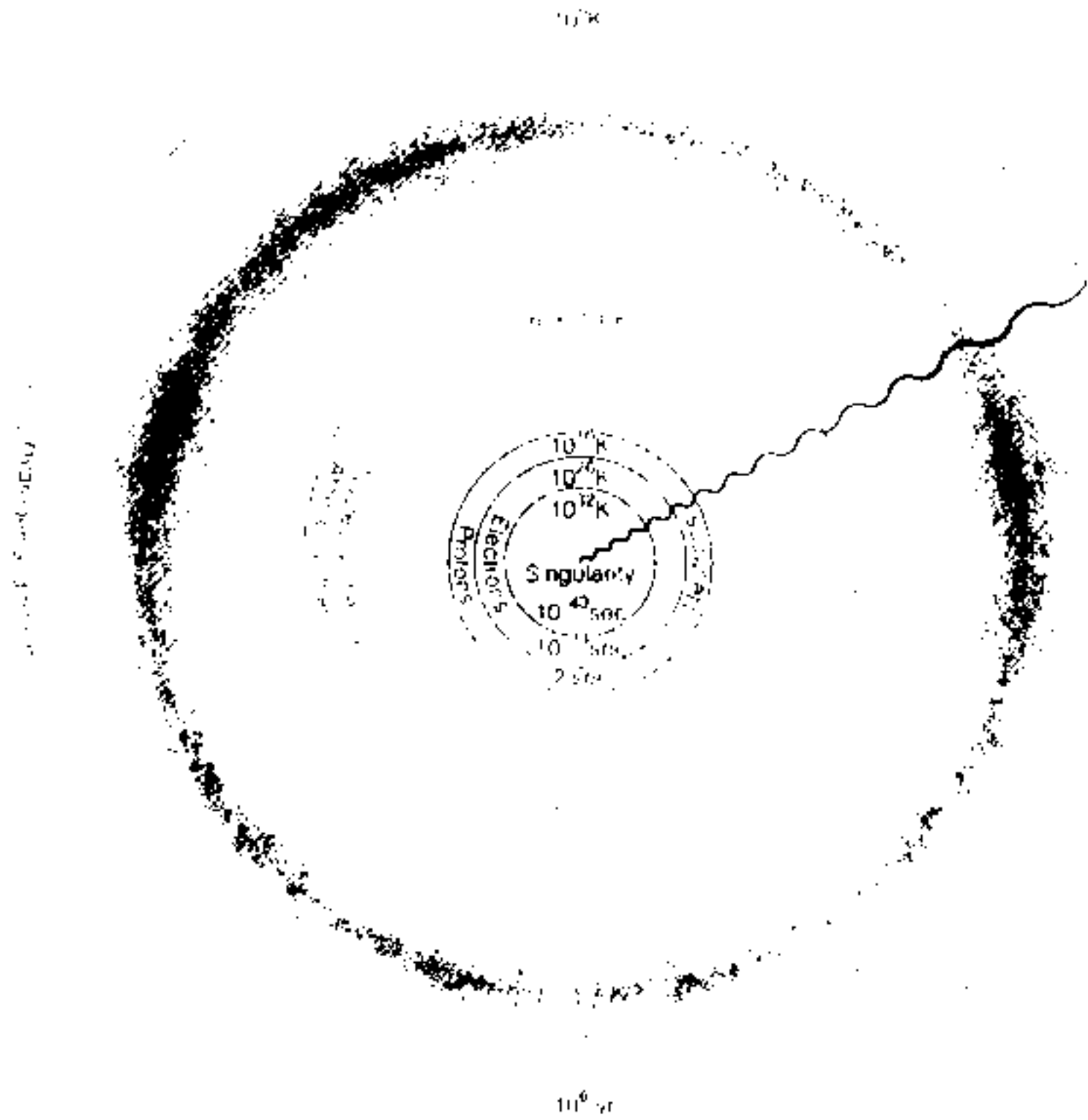
اس آیت سے کائنات کے مسلسل پھیلتے چلے جانے اور وسیع سے وسیع تر ہوتے چلے جانے کا مفہوم استنباط کیا جاسکتا ہے معنی ہوگا:

اور کائنات کو ہم نے (اپنی تخلیقی) قوت سے بنایا اور بے شک ہم اُسے پھیلا رہے ہیں۔

"And it is We who have built the Universe with (Our creative) power; and, verily, it is We who are steadily expanding it." (Asad)

یہ مفہوم اس جدید تصور کی تائید کرتا ہے۔ جسے ''پھیلتی ہوئی کائنات'' (Expanding Uninverse) کا تصور کہتے ہیں اور اس کے مطابق کائنات مسلسل طور پر خلاء کی وسعتوں میں پھیلتی جارہی ہے۔ دوسری بات یہ کہ یہ کائنات ساکن(Static) نہیں بلکہ متحرک (Dynamic) ہے۔ یہ ایک ''بنی بنائی'' کائنات نہیں بلکہ مسلسل ''بنتی ہوئی'' کائنات ہے۔

2۔زمین کو پھیلایا اور بچھایا یعنی اُسے ایسا بنایا کہ اُس پر انسان اور جاندار زندگی بسر کرسکیں۔ زمین ایک فرش کی طرح ہمارے قدموں کے نیچے موجود ہے۔ نہ ساری زمین دلدلی ہے کہ انسان اس میں دھنستا چلا جائے اور نہ پتھریلی اور چٹانی ہے کہ اُس پر چلنا بھی مشکل ہو۔

لاکھوں سالوں کے ارضیاتی عمل (Geological Process) نے سطح زمین کو ایسا بنایا جیسی کہ وہ ہمیں نظر آتی ہے اور یہ انسان اور جانداروں کے رہنے اور زندگی بسر کرنے کے لئے بالکل موزوں اور ساز گار ہے۔(مزید دیکھیں سورہ البقرہ 2:22۔)

3۔ جانداروں (انسان، حیوانات، نباتات) میں نر اور مادہ کا وجود ایک کھلی حقیقت ہے۔ کائنات میں اس کے علاوہ بھی تضادات اور متقابلات کی ایک وسیع دُنیا آباد ہے جیسے رات اور دن، آسمان اور زمین، دُنیا اور آخرت وغیرہ (مزید دیکھیں سورہ یٰسٓ 36:36)

اس نے چیزوں کو جوڑے جوڑے بنایا تاکہ انسان یہ جان سکے کہ وہ جو خالق ہے اُس کا کوئی جوڑا نہیں، وہ واحد ہے، یکتا ہے، لاشریک ہے۔

سورہ الرحمٰن (55)

اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ ۝ وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ ۝ وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ ۝ اَلَّا تَطْغَوْا فِى الْمِيْزَانِ ۝ (55:5-8)

سورج اور چاند ایک حساب کے پابند ہیں[1] اور ستارے اور درخت سجدہ ریز ہیں[2]۔ اور آسمان کو اُسی نے بلند کیا[3] اور میزان (عدل و توازن) قائم کی[4]۔ اس کا تقاضا یہ کہ تم میزان میں خلل نہ ڈالو[5]۔

1۔ سورج اور چاند مقررہ حساب کے مطابق حرکت کررہے ہیں، ان کی مختلف قسم کی حرکتیں، حرکتوں کی رفتاریں اور مدار اور ان کا عرصۂ حیات مقرر ہے۔

انسان اور دوسرے زمینی جانداروں کے لئے سورج بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ توانائی (روشنی اور حرارت) کا منبع ہے، زمین کے کم و بیش سبھی مظاہر براہ راست یا بالواسطہ طور پر اس پر منحصر ہوتے ہیں جیسے زندگی کی بقا اور نشوونما، ہواؤں کا چلنا، پانی کی تبخیر اور بادلوں کا بننا، وغیرہ۔ اسی طرح چاند کی بھی کلیدی اہمیت ہے، یہ راتوں کو روشن کرتا ہے، اس کی وجہ سے سمندروں میں مدوجزر پیدا ہوتے ہیں وغیرہ۔

یہ دونوں ایک نظام کے پابند ہیں۔ چاند زمین کے گرد گردش کرتا ہے اور زمین سورج کے گرد گردش کرتی ہے اور سورج اپنے شمسی نظام (Solar System) کے ساتھ اپنی کہکشاں میں حرکت کررہا ہے۔

زمینی مشاہدے کے اعتبار سے انسان سورج اور چاند کی جو حرکتیں اور جو طلوع اور غروب دیکھتا ہے یہ سب ایک طے شدہ حساب کے مطابق ہے اس کے مطابق ہم دنوں، مہینوں اور سالوں کا حساب کرتے ہیں، وقت کا حساب رکھتے ہیں،

ماضی کی تاریخ رقم کرتے اور آئندہ کے لئے نظام الاوقات بناتے اور مستقبل کی پیش گوئیاں (Fore cast) کرتے ہیں۔
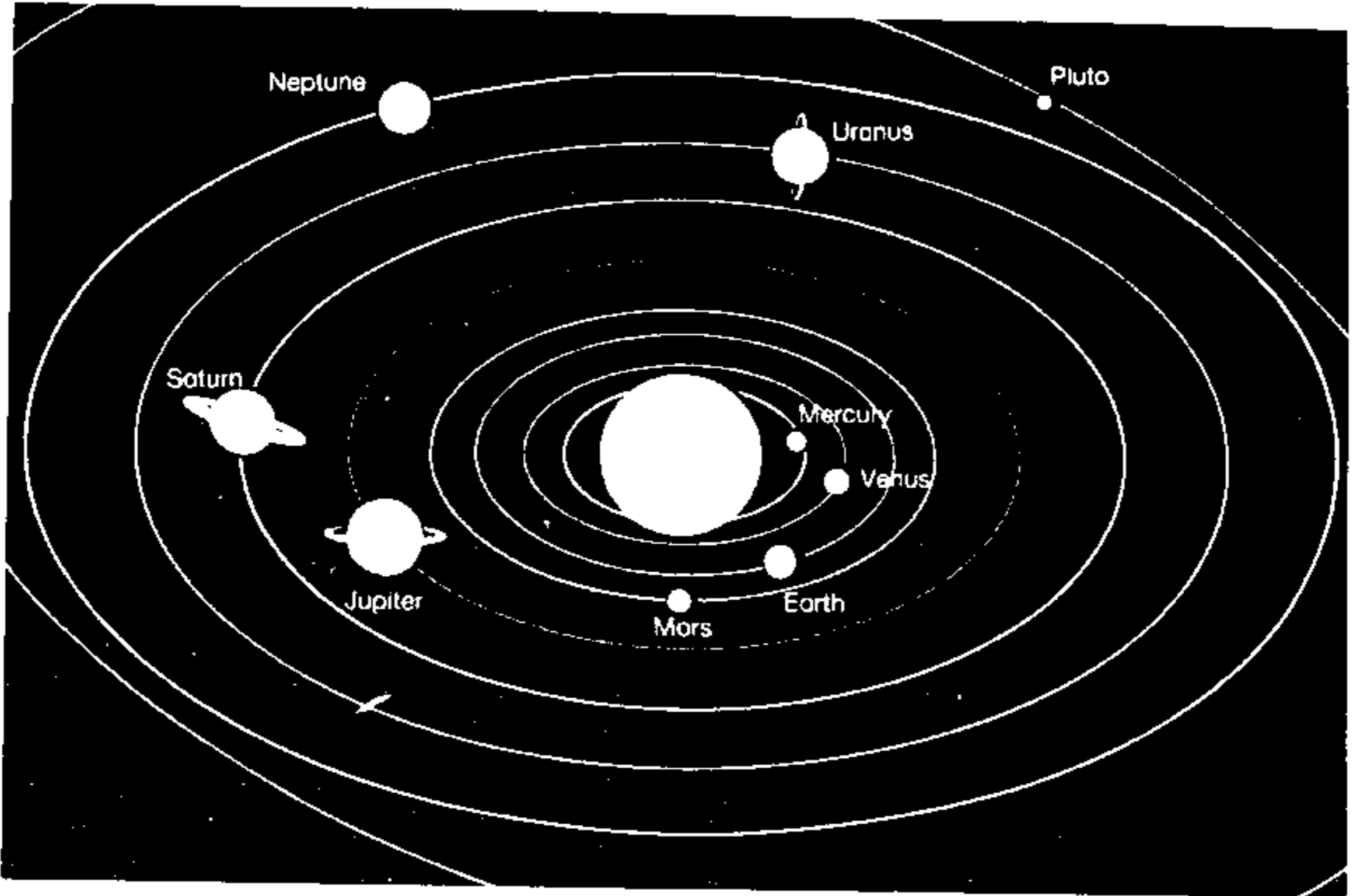
ہمارا نظامِ شمسی، سیارے سورج کے گرد گردش کررہے ہیں۔

2۔ اللہ کے حکم کے سامنے ''سرجھکائے'' ہوئے ہیں، اُس کے قانون اور نظام کے مطابق اپنا فعل سر انجام دے رہے ہیں کائنات کی چیزیں، چاہے آسمان کا ستارہ ہو یا زمین کا درخت، اللہ تعالیٰ کے قانون کے پابند ہیں۔

ستارے کا بننا، اُس کا حرکت کرنا، اس کے اندر ہونے والے مرکزائی تعاملات اور ان سے عناصر کا وجود میں آنا، ان کا عرصۂ حیات، ان کا انجام، سب اللہ کے مقرر کردہ قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ اسی طرح پودوں میں تولید کا عمل، ان کی نشوونما، ان میں ہونے والے اعمال جیسے ضیائی تالیف (Photosynthesis)، ان کی بقا وغیرہ قانونِ خداوندی کے مطابق ہوتا ہے۔

3۔ '' آسمان کی بلندی'' یعنی ''کائنات کی وسعت''۔ کائناتی خلاء میں بے شمار کہکشائیں ہیں جبکہ ہر کہکشاں میں اربوں ستارے، سیارے اور دوسرے اجرام سماوی (Heavenly Bodies)ہیں۔ ستاروں اور کہکشاؤں کے درمیان فاصلے اتنے زیادہ ہیں کہ نوری سال (Light year) کا پیمانہ بھی چھوٹا پڑ جاتا ہے۔

4۔کائنات میں ایک ہمہ گیر نظامِ توازن (Balance, Equilibrium) قائم ہے۔ تمام اجرامِ سماوی...... کہکشائیں، ستارے، سیارے وغیرہ۔ ایک توازن کے ساتھ کائناتی خلاء (Cosmic Space) میں اپنے مداروں پر رواں دواں ہیں۔کوئی تبدیلی، کوئی حرکت اورکوئی مظہر ایسا نہیں جو کہ سمجھ میں آسکنے والے قانونِ قدرت کے مطابق نہ ہو۔ ایک نظم ہے جس نے تمام کائنات کو اپنے احاطہ میں لیا ہوا ہے۔
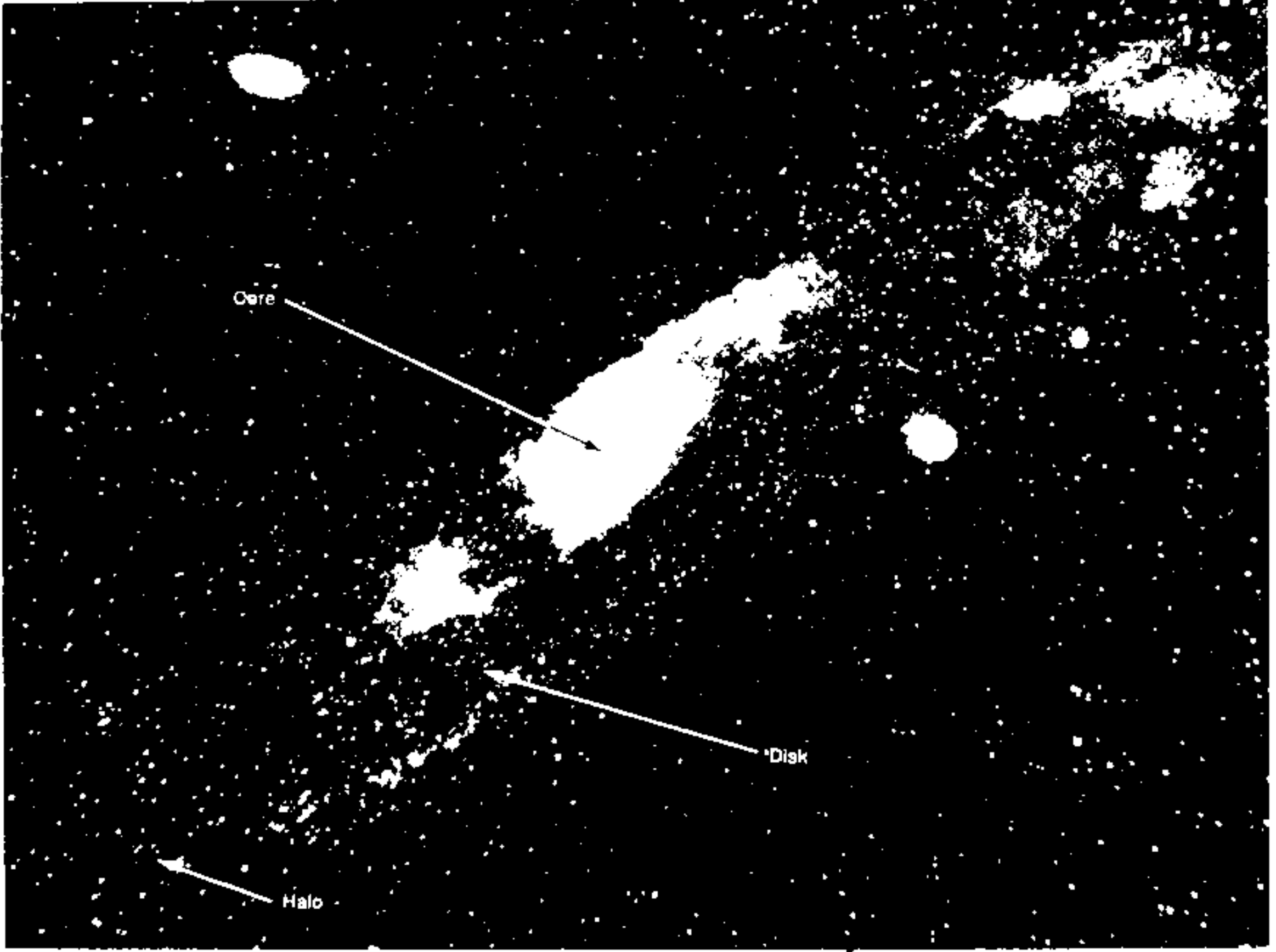
اینڈرومیڈا کہکشاں۔ ہماری پڑوسی کہکشاں جو کہ زمین سے 19لاکھ نوری سال کے فاصلے پر ہے۔

یہاں میزان سے مراد لکڑی یا دھات کا ترازو نہیں جس سے انسان چیزوں کو تولتا ہے بلکہ مراد میزانِ توازن ہے۔ یا سادہ لفظوں میں میزانِ عدل ہے یعنی عدل و توازن کا وہ قانون ہے جو پوری کائنات میں جاری ہے۔

اس کا معنی یہ بھی ہے کہ کائنات میں موجود ہر شے کو اس طرح پیدا کیا گیا ہے جو اس کے لئے مناسب تھا۔ تمام اشیاء کو ان کی بقا اورنشو و نما کے وہ تمام وسائل فراہم کیے گئے ہیں جن کی انھیں ضرورت تھی۔

5۔انسان ایسی کائنات میں رہتا ہے جو عدل و توازن پر قائم ہے لہٰذا

ضروری ہے کہ وہ اپنی شعوری زندگی بھی عدل و توازن کے ساتھ بسر کرے۔ اس طرح سے انسان کائنات کے ساتھ ہم آہنگ ہوجائے گا۔ بصورت دیگر انسان کی سرگرمیاں کائنات کے نظام توازن میں بگاڑ پیدا کرسکتی ہیں جس کے نہایت خطرناک نتائج برآمد ہوسکتے ہیں۔
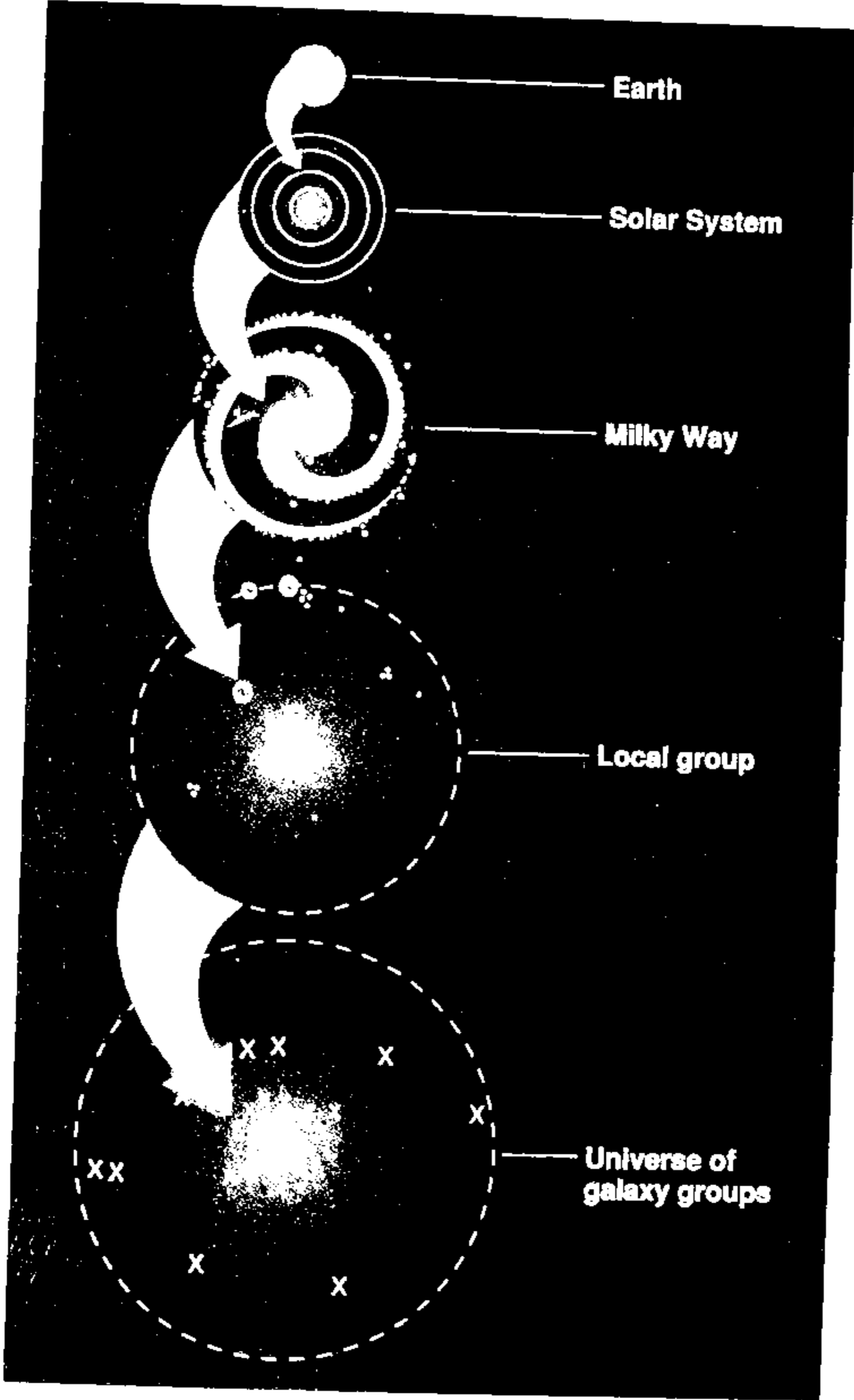
کائنات کی وسعتوں میں زمین کا مقام۔

وَالۡاَرۡضَ وَضَعَهَا لِلۡاَنَامِ ۙ﴿۱۰﴾ فِیۡهَا فَاکِهَةٌ ۪ۙ وَّالنَّخۡلُ ذَاتُ الۡاَکۡمَامِ ۖ﴿ۚ۱۱﴾ وَالۡحَبُّ ذُو الۡعَصۡفِ وَالرَّیۡحَانُ ﴿ۚ۱۲﴾ (55:10-12)

اور زمین کو اُسی نے مخلوق کے لئے پیدا کیا ہے[1]۔ اس میں گوناگوں پھل ہیں اور کھجوریں غلافوں والی، اور اناج بھوسہ والا اور خوشبودار پھول[2]۔

1۔ ''وضع'' کا معنی ہے وجود میں لانا اور پیدا کرنا (مفردات)

''انــــام'': بعض مفسرین کے نزدیک انام سے مراد انسان ہیں، بعض اسے جاندار کے معنی میں لیتے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہی قول منقول ہے۔

اللہ تعالیٰ نے زمین کو ایسا بنایا ہے کہ اس میں جاندار (Living things) آرام سے رہ سکتے اور اپنے مقصدِ حیات کے حصول کی جدوجہد کر سکتے ہیں۔

2۔زمین میں طرح طرح کے بکثرت پھل اور میوے ہیں۔ کھجوریں ہیں، اناج ہے، جانوروں کا چارہ ہے، اور خوشبودار پھول ہیں۔

''اکمام'': (کِم کی جمع)، اس سے مراد وہ غلاف ہے جو قدرتی طور پر پھلوں پر چڑھا ہوتا ہے تاکہ ان کے اندر کی غذائیت، رس اور مٹھاس وغیرہ ضائع نہ ہو، موسمی تغیرات اور کیڑے مکوڑے ان کو خراب نہ کریں، یہ گویا قدرتی پیکنگ ہے جو پھلوں کو ہر طرح کے بیرونی مضر اثرات سے محفوظ رکھتی ہے۔

''الحب'': دانہ کو کہتے ہیں یہاں اس سے مراد اناج کا دانہ ہے۔

''الـعـصـف'': گندم اور جو وغیرہ کے پودے کے پتے جو جانوروں کی خوراک کے لئے بھوسہ کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔

''الـریـحان'': طرح طرح کے خوشبودار پھول، خوشبودار گھاس اور جڑی بوٹیاں۔

یہ سب زمین میں اللہ کی گونا گوں نعمتیں ہیں جو اس نے اپنی مخلوق کے لئے پیدا کی ہیں۔

خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ مِنۡ صَلۡصَالٍ كَالۡفَخَّارِۙ وَخَلَقَ الۡجَآنَّ مِنۡ مَّارِجٍ مِّنۡ نَّارٍۚ (55:14-15)

اُس نے انسان کو نرم گارے سے پیدا کیا ہے جیسے مٹی کے برتن بنانے والوں کی مٹی[1]۔ اور جنوں کو اس نے بے دھویں کی خالص آگ سے پیدا کیا ہے[2]۔

He created man of clay like the potter's.

(Pickthal)

1۔ صلصال کے لغت اور تفسیروں میں کئی معانی ملتے ہیں ایک معنی الطین المرقق (نرم، پتلا گارا / کیچڑ) ہے جس سے مٹی کے برتن بنائے جاتے ہیں (تفصیل کے لئے دیکھیں سورہ الحجر 15:16)

فخار: (فخارۃ کی جمع) ''مٹکوں کو کہا جاتا ہے کیونکہ وہ ٹھوکا لگانے سے اس طرح زور سے بولتے ہیں جیسے کوئی بہت زیادہ فخر کررہا ہے (مفردات)۔ ''فخار کا مادہ ''فخر'' ہے، اس کے معنی اس شخص کے ہیں جو بہت زیادہ فخر کرتا ہو اور چونکہ اس قسم کے افراد اندر سے کھوکھلے ہوتے ہیں اور باتیں زیادہ بناتے ہیں اس لئے یہ لفظ کوزہ اور ہر قسم کی ٹھیکری کے لئے کہ جس میں سے زیادہ آواز نکلتی ہے بولا جاتا ہے'' (تفسیر نمونہ)۔

اس آیت میں بتایا جارہا ہے کہ انسان کی جسمانی تخلیق مٹی یا دوسرے لفظوں میں بے جان مادّے سے ہوئی ہے۔ قرآن مجید کی کئی آیات میں اس حقیقت کا اظہار کیا گیا ہے۔ ہم نے سورہ المومنون (23:12-14) میں اس مسئلہ پر قدرے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

2۔ قرآن مجید نے یہاں ایک اور مخلوق کا ذکر کیا ہے جسے ''جن'' کہتے

ہیں آیت کہتی ہے جنوں کو ایک ایسی خالص آگ سے پیدا کیا گیا ہے جس میں دھواں نہ تھا۔ سائنسی سطح پر غالباً اس سے ہم حرارتی توانائی (Heat Energy) مراد لے سکتے ہیں۔

مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ ۙ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ ۚ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۔ يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ ۚ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۔ وَلَهُ الْجَوَارِ الْمُنْشَئٰتُ فِي الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ ۚ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۔

(55:19-25)

اُس نے دو بحر جاری کیے جو ایک دوسرے سے مل رہے ہیں (لیکن) اُن کے درمیان ایک آڑ ہے کہ وہ ایک دوسرے پر غلبہ نہیں کرتے[1]۔ پس تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔ دونوں سے موتی اور مونگے نکلتے ہیں پس تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔ اور اُسی کے (زیر فرمان) ہیں یہ جہاز جو سمندر میں پہاڑوں کی طرح اٹھے ہوئے ہیں۔ پس تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔

1۔بحر: عربی زبان میں بحر پانی کے وسیع اور عظیم ذخیرے (Great Body of Water) کو کہا جاتا ہے، اس لئے اس کا اطلاق سمندر پر بھی ہوتا ہے اور دریا پر بھی۔ ممکن ہے کہ یہاں پانی کی دو قسمیں مراد ہیں یعنی میٹھا پانی (Fresh water) اور نمکین پانی (Salt water)۔ تفصیل کے لئے دیکھیں سورہ الفرقان (25:53)، سورہ النمل 27:61، سورہ فاطر 35:12۔

مَرَجَ کا معنی ہے کھلا اور آزاد چھوڑ دینا، اسی لئے عربی میں چراگاہ کو

مرج (جمع مروج) کہتے ہیں کیونکہ اس میں جانوروں کو چرنے کے لئے کھلا چھوڑ دیا جاتا ہے۔

زمین پر اللہ تعالیٰ نے دو قسموں کے پانی (میٹھا اور کھاری) جاری کئے ہیں۔ دونوں اپنی اپنی جگہ کھلے اور آزاد ہیں۔ یہ آپس میں ملتے بھی ہیں مگر دونوں کے درمیان ایک قدرتی آڑ ہے، نتیجتاً ایک دوسرے پر غلبہ نہیں کرتا۔

یہ آڑ اللہ تعالیٰ کے قانون کی آڑ ہے جو آبی چکر (water cycle) کی شکل میں موجود ہے۔ میٹھا پانی دریاؤں کی شکل میں سمندروں میں جا گرتا ہے جب کہ تبخیر کے ذریعے سمندروں کا پانی آبی بخارات میں اور پھر بادل کی شکل میں تبدیل ہوجاتا ہے جو بارش وغیرہ کی شکل میں زمین پر برستا ہے، اس طرح یہ دونوں پانی اپنی جگہ پر آزاد بھی ہیں، آپس میں ملتے بھی ہیں مگر ایک دوسرے پر غالب نہیں آتا یعنی ایسا نہیں ہوتا کہ زمین سے ایک کا، یا دوسرے کا وجود مٹ جائے۔ بلکہ دونوں ساتھ ساتھ موجود رہتے ہیں۔

''برزخ'' : (آڑ، پردہ، دیوار) ضروری نہیں کہ مادی آڑ ہو۔ یہاں یہ لفظ وسیع معنوں میں استعمال ہوا ہے اس سے مراد وہ قانونِ خداوندی ہے جو واٹر سائیکل کے نظام کے ذریعے ان پانیوں کو علیحدہ علیحدہ رکھتا ہے۔

2۔ دونوں پانیوں سے موتی اور گھونگے نکلتے ہیں۔

لؤلؤ : صاف و شفاف قیمتی موتی جو کہ دریا اور سمندر کی گہرائی میں صدف کے اندر پیدا ہوتا ہے، یہ جتنا موٹا ہوتا ہے اتنا ہی زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔ یہ زیور کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے اور اس کے بہت سے طبی فوائد بھی ہیں۔

مرجان :(گھونگا)، یہ ایک حیوان ہے جو سمندروں کی تہہ میں درخت کی طرح اُگتا ہے۔ وہ مرجان جو زیب و زینت کے کام آتا ہے سرخ رنگ کا ہوتا ہے، وہ جتنا زیادہ سرخ ہو اتنا ہی زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔ مرجان دوا کے طور بھی استعمال ہوتا ہے۔

یہ میٹھے اور کھاری دونوں پانیوں میں پائے جاتے ہیں۔

3۔ جوار (جاریہ کی جمع): جاری، رواں دواں، مراد ہے بڑی کشتیاں، بحری جہاز کیونکہ یہ سمندر میں رواں دواں ہوتے ہیں۔

منشات : (منشا کی جمع): یہ اسم مفعول ہے، اس کے معنی ''ایجاد'' کے ہیں۔ لہٰذا جوار المنشات کا معنی ہوگا ''بنے ہوئے جہاز'' مفہوم ہوگا:

اُسی کے زیر فرمان ہیں یہ جہاز جنھیں انسان نے بنایا ہے، جو پہاڑوں کی طرح سمندر میں چلتے ہیں۔

منشآت ان کشتیوں کو بھی کہتے ہیں جن کے بادبان بلند کردیئے جاتے ہیں۔

اعلام: (علم کی جمع) مراد ہے پہاڑ یعنی سمندروں میں پہاڑوں کی مانند بڑے بڑے جہاز۔ (علم کے اصل معنی علامت اور نشان کے ہیں چونکہ پہاڑ دور سے نمایاں نظر آتے ہیں اس لئے انھیں اعلام کہا گیا ہے۔ جھنڈے کو بھی علم کہتے ہیں کیونکہ وہ بلند اور نمایاں ہوتا ہے۔(مزید دیکھیں سورہ شوریٰ؛ 42:32-33)

انسان کو اللہ تعالیٰ نے تخلیقی صلاحیتیں عطا کی ہیں جن کو بروئے کار لا کر وہ طرح طرح کی چیزیں بناتا ہے انھیں میں سے ایک کشتیاں اور جہاز ہیں۔ دورِ جدید میں انسان نے حیرت انگیز حد تک بڑے بڑے جہاز بنائے جن پر پورے پورے شہر آباد ہوتے ہیں۔

يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا ۚ لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ ۚ فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝ يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ ڏ وَّنُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرٰنِ ۚ فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝ (55:33-36)

اے گروہِ جن و انس! اگر تم میں طاقت ہے کہ آسمانوں اور زمین کی سرحدوں سے نکل جاؤ تو نکل جاؤ۔ (مگر) تم بجز سلطان کے نہیں نکل سکو گے۔ پس تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔ تم پر آگ کا شعلہ اور دھواں بھیجا جائے گا تو تم اپنی مدد بھی نہ کرسکوں گے۔ پس تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔

ان آیات میں بالواسطہ طور پر انسان کے لئے زمین اور ''زمین کے آسمان'' کی حدود سے نکل جانے کی پیشن گوئی موجود ہے۔ یہاں یہ نہیں کہا گیا کہ تم زمین اور آسمان کی حدود سے نکل ہی نہیں سکتے بلکہ کہا گیا ہے کہ ''سلطان'' کے بغیر تم ایسا نہیں کرسکتے۔ اب سوال یہ ہے کہ سلطان کا کیا معنی ہے۔

سلطان: وہ جس نے غلبہ اور تسلط حاصل کرلیا، اس بنیاد پر بادشاہ کو سلطان کہتے ہیں۔ یہ لفظ غلبہ، تسلط اور قوت و طاقت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، قرآن مجید میں یہ لفظ حجت اور دلیل کے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے (کیونکہ ذہنوں پر اس کا دباؤ ہوتا ہے)۔

اس آیت میں سلطان کا معنی قوت اور طاقت کے ہیں۔ دور جدید میں انسان واقعی طور پر زمین کی حدود سے نکلا اور چاند پر اس نے قدم رکھے۔ سوال یہ ہے کہ وہ کیا چیز ہے جس کے بل پر وہ ایسا کرسکا، مختصر لفظوں میں اس کا جواب ہے ''علم کی طاقت''۔ لہٰذا آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ علم کی طاقت کے بغیر زمین اور آسمان کی حدود سے نکلنا ممکن نہیں۔ ہاں اگر یہ طاقت حاصل کرلی جائے تو پھر ممکن ہے۔

انسان جب خلاء کے سفر پر نکلتا ہے تو اُسے خصوصی اہتمام کرنا پڑتا ہے مثلاً اسے ایک خاص قسم کا لباس پہننا ہوتا ہے ورنہ وہ زندہ نہ رہ سکے۔ بیرونی خلاء میں انسان کا واسطہ اور باتوں کے ساتھ بالا بنفشی شعاعوں (Ultraviolet Rediation) سے پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ خلاء میں کاسمک ریز (Cosmic rays) اور شہابی پتھر (Meteroids) موجود ہوتے ہیں۔ ممکن ہے کہ'' آگ کے شعلے'' اور ''دھویں'' سے انہی مسائل اور حالات کی طرف اشارہ ہو۔

شواظ: بے دھویں کی آگ کے شعلے، وہ شعلے جو آگ سے علیحدہ ہوجائیں، چنگاریاں۔

نُحاس: دھواں۔

سورہ واقعہ (56)

فَلَآ اُقۡسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوۡمِ ۙ﴿۷۵﴾ وَ اِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوۡ تَعۡلَمُوۡنَ عَظِيۡمٌ ۙ﴿۷۶﴾ اِنَّهٗ لَقُرۡاٰنٌ كَرِيۡمٌ ۙ﴿۷۷﴾

(56:75-77)

پس نہیں! مجھے قسم ہے ستاروں کے مواقع کی۔اور بے شک یہ ایک بہت بڑی قسم ہے اگر تم جانو! بے شک یہ قرآن ایک بلند مرتبہ کتاب ہے۔

''مواقع'' جمع ہے''موقع'' کی یعنی واقع ہونے کی جگہ۔ممکن ہے اس سے مراد ستاروں کے مدار(Orbits)ہوں جن پر ستارے گردش کرتے ہیں۔

ستارے کہکشاؤں میں ہوتے ہیں۔ اس بنا پر یہ بھی ممکن ہے کہ مواقع سے مراد وہ کہکشائیں ہوں جن میں ستارے واقع ہوتے ہیں۔

ستاروں کے مواقع کی قسم، اللہ فرماتا ہے کہ، بہت بڑی قسم ہے۔ یہ انداز کلام ممکن ہے اس لئے اختیار کیا گیا ہو کہ اربوں کہکشاؤں میں کھربوں ستارے ہیں، ہر ستارہ ایک نہایت عظیم الجثہ وجود ہے۔ اللہ ہی کی قدرت ہے جو ان سب کو اپنے اپنے مداروں پر قائم رکھے ہوئے ہے۔

سورج اور چند دوسرے ستارے: کون کتنا بڑا ہے۔
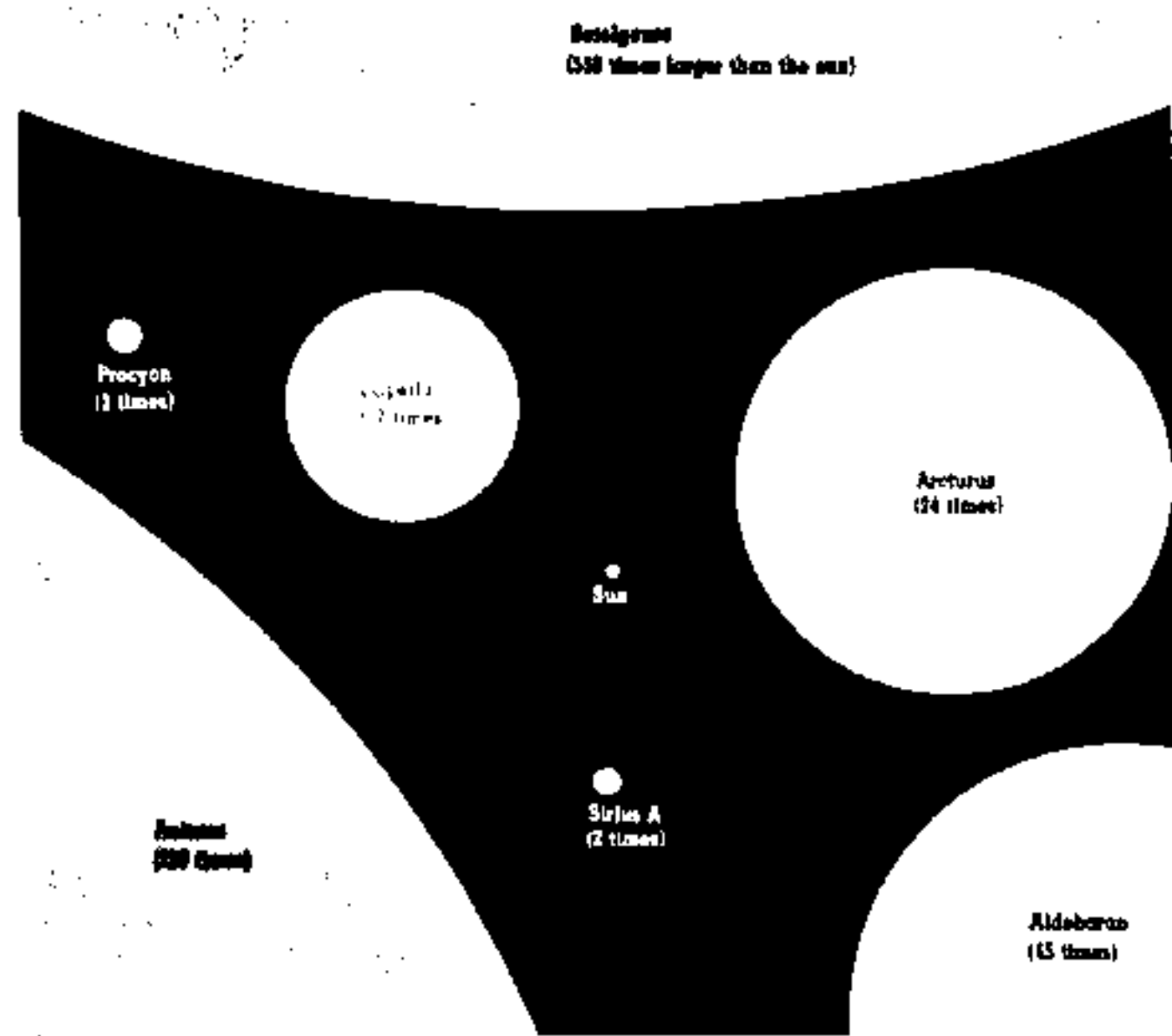
سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ج وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۝ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ ج وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝ هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ج وَهُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ۝ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ ط یَعْلَمُ مَا یَلِجُ فِی الْاَرْضِ وَمَا یَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا یَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا یَعْرُجُ فِیْهَا وَهُوَ مَعَكُمْ اَیْنَ مَا كُنْتُمْ ط وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ۝ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط وَاِلَی اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝ یُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّهَارِ وَیُوْلِجُ النَّهَارَ فِی الَّیْلِ ط وَهُوَ عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝ (57:1-6)

اللہ کی تسبیح[1] کی ہے ہر شے نے جو آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے۔ وہ غالب اور حکیم ہے۔ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اُسی کی ہے، وہی زندگی بخشتا ہے اور وہی موت دیتا ہے۔ اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اور وہی اوّل بھی ہے اور آخر بھی، ظاہر بھی ہے اور باطن بھی۔ اور وہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔

وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ ادوار میں تخلیق کیا ہے اور وہ عرشِ قدرت پر تمکن کئے ہوئے

ہے[2]۔

وہ جانتا ہے اس چیز کو جو زمین میں داخل ہوتی ہے اور جو اس سے نکلتی ہے اور جو آسمان سے اترتی ہے اور جو اس میں چڑھتی ہے[3]۔ اور وہ تمہارے ساتھ ہوتا ہے تم جہاں کہیں بھی ہوتے ہو[4]۔ اور تم جو کچھ بھی کرتے ہو وہ سب کو دیکھتا ہے۔ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اُسی کی ہے اور تمام امور کا مرجع اللہ ہی ہے[5]۔

وہی رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور وہی دن کو رات میں داخل کرتا ہے[6] اور وہ سینوں کے چھپے ہوئے رازوں کا جاننے والا ہے۔

1۔ ''تسبیح''، ''سَبح'' کے مادے سے ہے جس کا بنیادی معنی ہے پانی (یا خلاء) میں تیز حرکت کرنا۔ تسبیح اللہ کی عبادت کی راہ میں حرکتِ سریع ہے (مفردات)۔ اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کو تمام ایسی چیزوں سے پاک اور منزہ سمجھنا جو اس کی شایانِ شان نہیں۔ یعنی ہر عیب، ہر نقص اور ہر کمزوری سے پاک۔

جن چیزوں کو عقل و شعور دیا گیا ہے وہ شعوری طور پر اُس کی تسبیح کرتی ہیں۔ اور جنھیں شعور کی طاقت نہیں دی گئی وہ اپنے ''حال'' اور ''کیفیت'' یعنی فعل و عمل سے اللہ تعالیٰ کے ہر عیب سے پاک ہونے کا اعلان کر رہی ہیں۔ یعنی وہ اللہ تعالیٰ کے قائم کردہ نظام فطرت کے مطابق کاربند ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح کا ''شعور'' ہر مخلوق کو دیا گیا ہو۔ علامہ آلوسی لکھتے ہیں۔

نفس ناطقہ اور ادراک انسان کی ہی خصوصیت نہیں بلکہ حیوانات، اور جمادات کو بھی ان کے حسبِ حال یہ نعمتیں بخشی گئی ہیں۔

(روح المعانی)

2۔اللہ تعالیٰ قادرِ مطلق ہے وہ اس بات پر قادر ہے کہ ساری کائنات کو یک دم، کوئی وقت صرف کئے بغیر(Within no time) خلق کردے لیکن تدریجی تخلیق اُس کی قدرت پر زیادہ واضح اور وسیع دلائل لئے ہوئے ہے۔ جب کوئی چیز تدریجاً بنتی ہے تو ہر ہر لمحے وہ اپنے بنانے والے کی قدرت کے نئے کمال سے متعارف کراتی ہے۔

عرش پر متمکن ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ واقعی کوئی تخت ہے جس پر اللہ تعالیٰ بیٹھا ہے بلکہ ''عرش'' سے مراد ''قدرت اور حکومت'' ''غلبہ'' اور ''تسلط'' (Control and Authority) کا تخت ہے اور اس پر جلوہ فرما ہونے کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کی قدرت اور حاکمیت مطلقہ پوری کائنات کا احاطہ کئے ہوئے اور اس کی تدبیر ہر شے میں نفوذ کئے ہوئے ہے۔ گویا یہ قدرت و طاقت کا کنایہ ہے۔ کائنات اور اس کی ایک ایک چیز کی اللہ تعالیٰ سے وابستگی اس طرح ہے کہ اگر وہ ذات ایک لمحے کے لئے بھی ان سے نظر لطف و کرم دور کردے اور اپنے فیض کو منقطع کرلے تو سب کچھ تباہ ہوجائے اور کوئی چیز قائم نہ رہ سکے۔

3۔جو چیزیں زمین میں داخل ہوتی ہیں: مثلاً بارش کے قطرات، درختوں کی جڑیں جو زمین میں داخل ہوتی ہیں، اسی طرح جاندار چیزیں جب انحطاط پاتی ہیں (یعنی Decay ہوتی ہیں) تو ان کے اجزا مٹی میں مل جاتے ہیں۔ وغیرہ

جو چیزیں زمین سے باہر آتی ہیں: مثلاً زمین سے اگتی ہوئی نباتات، ابلتے ہوئے چشمے، بے جان مادے کا نباتات کے ذریعے نامیاتی مادوں میں تبدیل ہونا، اور وہاں سے انسان (اور دوسرے حیوانوں) کے جسم کا حصہ بننا، آتش فشاں پہاڑوں کے ذریعے لاوا کا باہر آنا، زمین سے نکلنے والی گیس، پٹرولیم اور دوسری معدنیات۔۔

آسمان (فضا، خلاء اور اوپر) کی طرف صعود: مثلاً تبخیر کے ذریعے سمندروں وغیرہ کے پانی کا بخارات میں تبدیل ہونا اور بادل بنانا، درختوں کا بلند ہونا، مائع اور ٹھوس کا گیس حالت میں آنا، گرم ہوکر ہوا (یا گیس) کا بلند ہونا، پرندوں کا ہوا میں پرواز کرنا، ہوائی جہازوں کا فضا میں اُڑنا، خلائی جہازوں اور دوسری مشینوں کا زمین سے نکل کر دور خلاؤں میں جانا وغیرہ۔

آسمان سے نزول: سورج کی روشنی، آسمانی شہابیے (meteorites)، اس کے علاوہ بارش، برف اور اولے وغیرہ۔

4۔اس کی معیت انسان (اور ہر ہر وجود کو) زندگی کے ہر ہر لمحے حاصل رہتی ہے، ہرشے اپنی بقا کے لئے ہر لمحے اُس کی محتاج ہے۔

5۔تمام موجودات کی مراجعت (رجوع کرنا، لوٹنا) اُسی کی طرف ہے، تمام موجود اُسی کی طرف رخ کئے ہوئے چل رہے ہیں اور ایسا ''چلنا'' ہے کہ اس میں کسی مقام پر توقف اور ٹھہراؤ نہیں ہے۔

6۔ رات آہستہ آہستہ دن میں داخل ہوتی ہے اور اسی طرح دن آہستہ آہستہ رات میں داخل ہوتا ہے۔ یہ ایک بہت بڑی نعمت ہے اگر رات اور دن یک لخت تبدیل ہوتے تو انسان اور دوسری مخلوقات کو بڑی پریشانی ہوتی۔

اس کا ایک معنی یہ بھی ہے کہ سال میں دن اور رات کا دورانیہ گھٹتا بڑھتا رہتا ہے کبھی دن بڑے اور راتیں چھوٹی اور کبھی راتیں بڑی اور دن چھوٹے۔ یہ زمین کے اپنے مدار پر 23 درجے کے جھکاؤ کی وجہ سے ہے۔ اسی سے چار موسم بنتے ہیں (تفصیل کے لئے دیکھیں سورہ آلِ عمران 3:27 نوٹ 1۔)

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۧ (57:25)

اور ہم نے رسولوں کو واضح دلائل کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان (نظامِ عدل) نازل کی تاکہ لوگ عدل پر قائم ہوں۔

اور لوہا بھی اتارا جس میں بڑی قوت بھی ہے اور لوگوں کے لئے اس میں دوسرے فائدے بھی ہیں[1]۔اور اس سے اللہ نے یہ بھی چاہا کہ وہ ان لوگوں کو ممیّز کرے جو اس کی اور اس کے رسولوں کی

مدد بن دیکھے کرتے ہیں۔ اور بے شک اللہ بڑا ہی قوی اور غالب ہے۔

1۔لوہا ایک طاقت ور دھات ہے۔ انسان اس سے طرح طرح کی چیزیں بناتا ہے۔انسانی معاشرت اور تہذیب و تمدن میں لوہا بہت اہم کردار کا حامل ہے۔ دور جدید میں لوہے کی صنعت اور دھات کاری (Metallurgy) نے بہت ترقی کرلی ہے، اور لوہے کی کئی قسم کی بھرتیں (Alloys) بنائی جاتی ہیں۔ ان میں بے داغ فولاد (Stainless Steel) کی اہمیت بہت زیادہ ہے جس سے گھریلو برتنوں کے علاوہ طبی اوزار بنائے جاتے ہیں۔
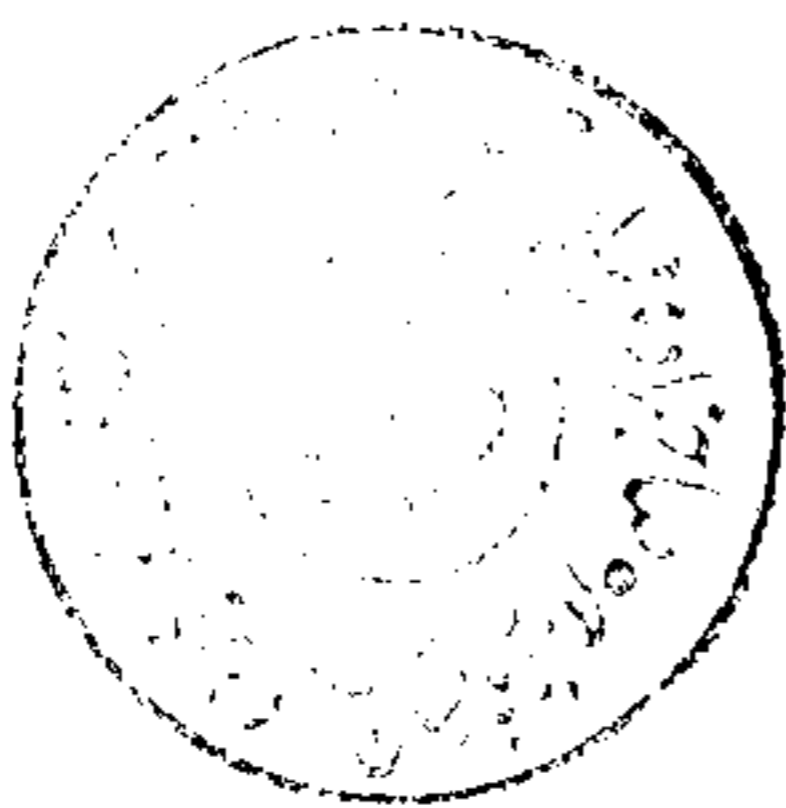
هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَ الشَّهَادَةِ ۚ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ ۝ هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ۝ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی ؕ یُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ وَ هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۝ (59:22-24)

وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی الہ نہیں، غیب و شہادت کا جاننے والا۔ وہ رحمٰن اور رحیم ہے۔

وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی الہ نہیں۔ بادشاہ، نہایت مقدس، سلامت رکھنے والا، امن بخشنے والا، نگہبان، غالب، زور آور (ٹوٹے دلوں کو جوڑنے والا)، صاحبِ کبریائی۔ اللہ پاک ہے اُن چیزوں سے جن کو لوگ اس کا شریک ٹھہراتے ہیں۔

وہی اللہ ہے، نقشہ بنانے والا، وجود میں لانے والا، صورت گری کرنے والا، اس کے لئے ہیں سارے اچھے نام۔ اس کی تسبیح کرتی ہیں سب چیزیں جو آسمانوں اور زمین میں ہیں، اور صاحبِ قوت اور صاحبِ حکمت ہے۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ کے پیارے نام ذکر کیے گئے ہیں۔جن کے ذریعے قرآن مجید انسانوں سے اللہ تعالیٰ کا تعارف کراتا ہے تاکہ انسان اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کر سکے۔

سورہ الطلاق (65)

اَللّٰہُ الَّذِیۡ خَلَقَ سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ وَّ مِنَ الۡاَرۡضِ مِثۡلَہُنَّ ؕ یَتَنَزَّلُ الۡاَمۡرُ بَیۡنَہُنَّ لِتَعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ۬ۙ وَّ اَنَّ اللّٰہَ قَدۡ اَحَاطَ بِکُلِّ شَیۡءٍ عِلۡمًا ﴿۱۲﴾ (65:12)

اللہ وہ ہے جس نے سات آسمان پیدا کیے ہیں اور زمین کی قسم سے بھی اُنہی کے مانند[1]۔ ان کے درمیان (اس کا) حکم نازل ہوتا رہتا ہے[2]۔ (یہ بات تمہیں اس لئے بتائی جارہی ہے) تاکہ تم جان[3] لو کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے اور یہ کہ اللہ نے اپنے علم سے ہر چیز کا احاطہ کررکھا ہے۔

1۔ ''اللہ وہی ہے جس نے سات آسمان خلق کیے اور اُن کے مانند زمین کی قسم سے بھی۔'' کا معنی کیا ہے؟ قرآن مجید میں زمین کا لفظ (ارض) ہمیشہ واحد آیا ہے کہیں بھی جمع کا لفظ (ارضون/ارضین) نہیں آیا۔ یہ واحد جگہ جہاں یہ مفہوم بھی لیا جاسکتا ہے کہ زمینیں بھی سات ہیں۔ راقم کے نزدیک یہاں تعداد کی مثلیت نہیں بیان ہورہی بلکہ یہ بتایا جارہا ہے کہ آسمانوں کا خالق بھی اللہ ہے اور زمین کا بھی وہی ہے۔ یعنی یہاں تخلیق کی مثلیت ہے۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ ''زمین'' (ارض: Earth) نام کا سیارہ (Planet) تو ایک ہے تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ زمین جس قسم کا سماوی جسم ہے اُس قسم کے سماوی اجسام لاتعداد ہیں، یہ وہ اجسام ہیں جنھیں ہم سیارے (Planets) کا نام دیتے ہیں۔

یہ بھی ممکن ہے کہ ایسے سیارے، ذیلی سیارے یا دوسرے سماوی اجسام

بھی موجود ہوں، ہماری کہکشاں میں یا کسی دوسری کہکشاں میں، جن پر حالات مکمل طور پر یا تقریباً زمین کی طرح کے ہوں اور وہاں پر بھی جاندار اور ذی شعور مخلوق موجود ہو۔

آسمانوں کے لئے ''سات'' کا عدد واضح طور استعمال ہوا ہے۔ ممکن ہے یہ عدد تکثیری ہو یعنی کثرت کے معنوں میں۔ اس صورت میں معنی ہوگا بہت سے ''آسمان'' یعنی سماوی اجرام (کہکشائیں اور ستارے وغیرہ)۔

بہرحال یہ آیت کائنات میں زمین کی طرح کے اجرام کی موجودگی کا انکشاف کررہی ہے۔

2۔امر تکوینی (Creational command) جو اگر ایک لمحے کے لئے بھی اس کائنات سے جُدا ہو جائے تو سارا نظامِ ہستی تباہ و برباد ہوجائے اور کائنات قائم نہ رہ سکے۔

3۔ کائنات کا مطالعہ و مشاہدہ اللہ تعالیٰ کی معرفت کا دروازہ ہے تاکہ انسان اللہ تعالیٰ کی قدرت کی معرفت حاصل کرسکے۔

الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ؕ مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ؕ فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ ۝ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَیْنِ یَنْقَلِبْ اِلَیْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِیْرٌ ۝ (67:3-4)

جس نے سات آسمان باہم مطابقت میں بنائے[1]، تم خدائے رحمٰن کی آفرینش میں کوئی خلل نہیں پاؤ گے، پھر نگاہ لوٹاؤ، کیا تمہیں کوئی نقص نظر آتا ہے، پھر بار بار نگاہ دوڑاؤ، تمہاری نگاہ ناکام تھک کر واپس آجائے گی[2]۔

1۔ ''سات آسمان'' کی تشریح کئی بار پہلے گزر چکی ہے جس کے مطابق ''سبع سماوات'' (سات آسمان) کے الفاظ کائنات (Cosmos) کی وسعتوں کے لئے بطورِ استعارہ استعمال کئے گئے ہیں۔

''طباقاً'' کا معنی بعض لوگوں نے ''ایک کے اوپر ایک'' سمجھا ہے لیکن اگر سبع سماوات کا وہ مفہوم صحیح ہے جو ہم نے بیان کیا ہے تو اس کا معنی مطابقت اور ہم آہنگی (Hormony) ہوگا جو کہ اس لفظ کا بنیادی معنی ہے۔ مطلب یہ ہوگا کہ کائنات میں ایک مطابقت، توازن اور توافق پایا جاتا ہے جو پوری کائنات کو اپنے احاطہ میں لئے ہوئے ہے۔ یہی وہ بات ہے جو آیت کے اگلے ٹکڑے اور اس سے اگلی آیت میں زیادہ صراحت کے ساتھ بیان کی جارہی ہے۔

2۔ یعنی کائنات ہر قسم کی کجی اور نقص سے پاک ہے۔ ''بار بار نگاہ دوڑاؤ'' کا مطلب ہے اپنے تمام تر وسائل اور صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے

کائنات کا مشاہدہ و مطالعہ کرنا۔ دورِ جدید میں اسی چیز کو سائنسی طریقۂ کار (Scientific Method) کہا جاتا ہے۔

انسان اپنی پوری صلاحیت کو استعمال کرتے ہوئے بے لاگ طور پر کائنات کا مطالعہ کرے گا تو وہ اس نتیجہ پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکے گا کہ اس میں کسی قسم کا کوئی تخلیقی عیب موجود نہیں ہے۔ یہ بات لازمی طور پر اُسے اس نتیجہ تک پہنچائے گی کہ اس کا ضرور کوئی خالق، رب اور قیوم ہے۔ یہی وہ نتیجہ ہے جس تک قرآنِ مجید انسان کو لانا چاہتا ہے۔

وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ وَجَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ وَاَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابَ السَّعِيْرِ ۝ (67:5)

اور بے شک ہم نے ''آسمانِ دنیا'' کو چراغوں سے مزین کیا، اور انھیں شیطانوں کے لئے مار قرار دیا، اور ان کے لئے ہم نے دہکتی آگ کا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

..........یا..........

اور بے شک ہم نے ''آسمانِ دُنیا''[1] کو چراغوں[2] سے مزین کیا ہے، اور انھیں شیطانوں کے لئے ظنون و گمان کا ایک سبب بنادیا، اور ان کے لئے ہم نے دہکتی آگ کا عذاب تیار کر رکھا ہے[3]۔

1۔آسمانِ دُنیا: ''دنیا'' ''اَدنٰی'' کی مونث ہے۔ اس کا معنی ہے قریب تر۔ آسمانِ دُنیا یعنی وہ آسمان جو زمین کے قریب تر ہے ممکن ہے اس سے مراد وہ کہکشاں ہو جس میں ہماری زمین موجود ہے یعنی ملکی وے گیلیکسی (Milky way galaxy)۔(مزید دیکھیں 37:6-10 نوٹ 1۔)

2۔''مصابیح'': ''مصباح'' کی جمع ہے معنی ہے چراغ۔ اس سے ستارے مراد ہیں۔ اللہ فرماتا ہے کہ ہم نے قریب کے آسمان کو یعنی زمین کے قریب کی کائناتی خلاء کو ستاروں سے آراستہ کیا۔ یعنی یہ ہم ہی ہیں جنھوں نے آسمانِ دُنیا کو چراغوں سے مزین کیا ہے۔

3۔ستاروں سے آسمان کو مزین کیا ہے اب چاہیئے تو یہ کہ ان کے مشاہدے اور مطالعے سے اللہ تعالیٰ کے وجود اور قدرت کی معرفت حاصل کی جائے۔ لیکن شیطان صفت لوگ ان ستاروں کے محلِ وقوع اور حرکت کی بنیاد پر کہانت اور جھوٹی غیب دانی کا کاروبار کرتے اور سادہ لوح عوام کو لُوٹتے اور گمراہ کرتے ہیں۔

شیطان سے مراد شیطان الانس ہیں، انسانی شیطان یعنی شیطان صفت انسان۔ جھوٹی غیب دانی اور کہانت کا دعویٰ کرکے لوگوں کو لوٹنے اور گمراہ کرنے والے۔

''رجوم'' جمع ہے اس کا واحد''رَجْم'' ہے جو کہ مصدر ہے لیکن اس کا اطلاق اُس چیز پر ہوتا ہے جس سے مارا جاتا ہے۔ اسی استعمال کے باعث اس کی جمع رجوم بنی ورنہ مصدر کی جمع نہیں ہوتی۔ 'رجوم' کے ایک معنی اور بھی ہیں اور وہ ہیں اٹکل کے تیر چلانا، ظنون اور گمان سے کوئی بات کہنا، جسے عربی میں رَجماً بالغیب کہتے ہیں یعنی کسی واقعی علم و یقین کے بغیر محض اٹکل سے کوئی بات کہنا۔ اس بنیاد پر آیت کا مفہوم ہوگا کہ شیطان صفت نجومی اور کاہن ستاروں کی بنیاد پر اٹکل کے تکے چلاتے ہیں (تفصیل کے لئے دیکھیں تفسیر کبیر زیرِ نظر آیت)

ان آیات میں ستاروں کے سائنسی علم یعنی Astronomy کی حوصلہ افزائی کی گئی (یہ نتیجہ زینت دینے کے الفاظ سے نکالا جاسکتا ہے) اور ستاروں کی بنیاد پر جھوٹی غیب دانی کے دعویٰ یعنی Astrology کی مذمت کی گئی ہے مزید دیکھیں سورہ الحجر 15:18 اورسورہ الصّٰفّٰت 37:20۔

هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِيْ مَنَاكِبِهَا وَكُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ ؕ وَاِلَيْهِ النُّشُوْرُ ۝

(67:15)

وہی ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو نرم
بنایا ہے، پس اس کے راستوں پر چلو، اور اللہ کے
بخشے ہوئے رزق میں سے کھاؤ۔ اور اُسی کی طرف
اُٹھنا ہے۔

ذلول: نرم، فرماں بردار، قابل انتظام (Manageable)۔
مناکب: 'منکب' کی جمع ہے جو کندھے کو کہتے ہیں، یہاں پہاڑوں
کے وہ کنارے مراد ہیں جہاں قدرتی درے بنے ہوتے ہیں۔
زمین ایسی ہے جس پر انسان سہولت کے ساتھ زندگی بسر کرسکتا ہے۔ یہ
نہ تو اس طرح کی سخت ہے کہ اس پر زندگی ہی بسر نہ کی جاسکے اور نہ اس قدر نرم
ہے کہ انسان اس میں دھنستا چلا جائے۔
زمین ایک تیز رو سواری کی طرح ہے جو کئی قسم کی حرکتوں
(Motions) کی حامل ہے مگر اس کے باوجود ایسی پرسکون ہے کہ گویا مطلقاً
ساکن ہو۔
اس کی قوتِ تجاذب (Gravitational force) نہ اتنی زیادہ ہے
کہ انسان اٹھ تک نہ سکے اور نہ اتنی کم ہے کہ انسان اس پر ٹھہر ہی نہ سکے اور خلاء
میں جا پڑے۔

أَوَلَمْ يَرَوْا إِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ صَافَّاتٍ وَيَقْبِضْنَ ۚ مَا يُمْسِكُهُنَّ إِلَّا الرَّحْمَٰنُ ۚ إِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ بَصِيرٌ ○ (67:19)

کیا انھوں نے اپنے اوپر پرندوں کو نہیں دیکھا! وہ
پروں کو پھیلائے اُڑتے ہیں اور ان کو سمیٹ بھی لیتے
ہیں ان کو سوائے رحمان کے کوئی نہیں تھام سکتا، بے
شک وہی ہر چیز کی نگرانی رکھنے والا ہے۔

پرندوں کا ہوا میں اُڑنے کی صلاحیت کا حامل ہونا اپنے اندر اللہ تعالیٰ کی قدرت، حکمت اور علم کی عظیم نشانی رکھتا ہے۔

پرندے جب فضا میں اڑ رہے ہوتے ہیں تو کبھی پروں کو پھیلائے اڑتے ہیں (صافات) اور کبھی اپنے پروں کو اپنے پہلوؤں کے ساتھ سکیڑ لیتے ہیں (یقبضن)۔

پرندوں کے اڑنے کے لئے ضروری ہے کہ کرہ ہوائی ہو، اور پرندوں کی ساخت اس طرح کی ہو کہ وہ کرہ ہوائی میں اڑسکیں۔ یہ اللہ تعالیٰ ہی ہے جس نے یہ حالات جمع کئے ہیں۔ مزید دیکھیں سورہ النحل 16:79۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ مَآؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ يَّاْتِيْكُمْ بِمَآءٍ مَّعِيْنٍ ۠ (67:30)

ان سے پوچھو کہ بتاؤ اگر تمہارا یہ پانی (زمین کی تہہ میں) نیچے اترجائے تو تمہارے لئے صاف پانی کون لائے گا۔

''غور'' پانی کا زمین میں اتنا گہرا چلا جانا کہ انسان کی اُس تک رسائی نہ ہوسکے۔ پانی کا زمین میں اس طرح جذب ہوجانا کہ انسان اُسے واپس نہ لاسکے۔

معین: مَعْن کے مادے سے ہے۔ یہ پانی کے جاری ہونے کے معنی میں ہے۔

زمین کی سطح کی تہہ نفوذ پذیر ہے، پانی اس میں جذب ہوجاتا ہے لیکن اس سے نیچے کی تہہ غیر نفوذ پذیر ہے جس سے پانی نہیں گزرسکتا۔ ان تہوں کی موجودگی کا یہ فائدہ ہوتا ہے کہ پانی اوپر کی تہہ سے گزر کر نیچے کی تہہ کے اوپر جمع ہوجاتا ہے اور انسان کے لئے ممکن ہوتا ہے کہ وہ کنواں کھود کر اُسے نکال سکے۔ لیکن اگر یہ انتظام نہ ہوتا تو انسان کو بڑی مشکل پیش آتی ۔ اگر اوپر کی تہہ بھی غیر نفوذ پذیر ہوتی تو پانی سطح کے اوپر ہی رکتا۔ ایسی صورت میں بہت جلد گندہ اور

متعفن ہوجاتا اور ساتھ ہی ساتھ تیزی سے بخارات میں تبدیل ہوکر اُڑ جاتا ہے۔
اور اگر نیچے کی تہہ بھی نفوذ پذیر ہی ہوتی تو پانی زمین کی گہرائیوں میں
اتر جاتا تو انسان کے لئے اُسے حاصل کرنا ممکن نہ رہتا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت
کاملہ ہے کہ اس نے یہ انتظام کیا ہے کہ انسان بہ آسانی پانی حاصل کرسکتا ہے۔
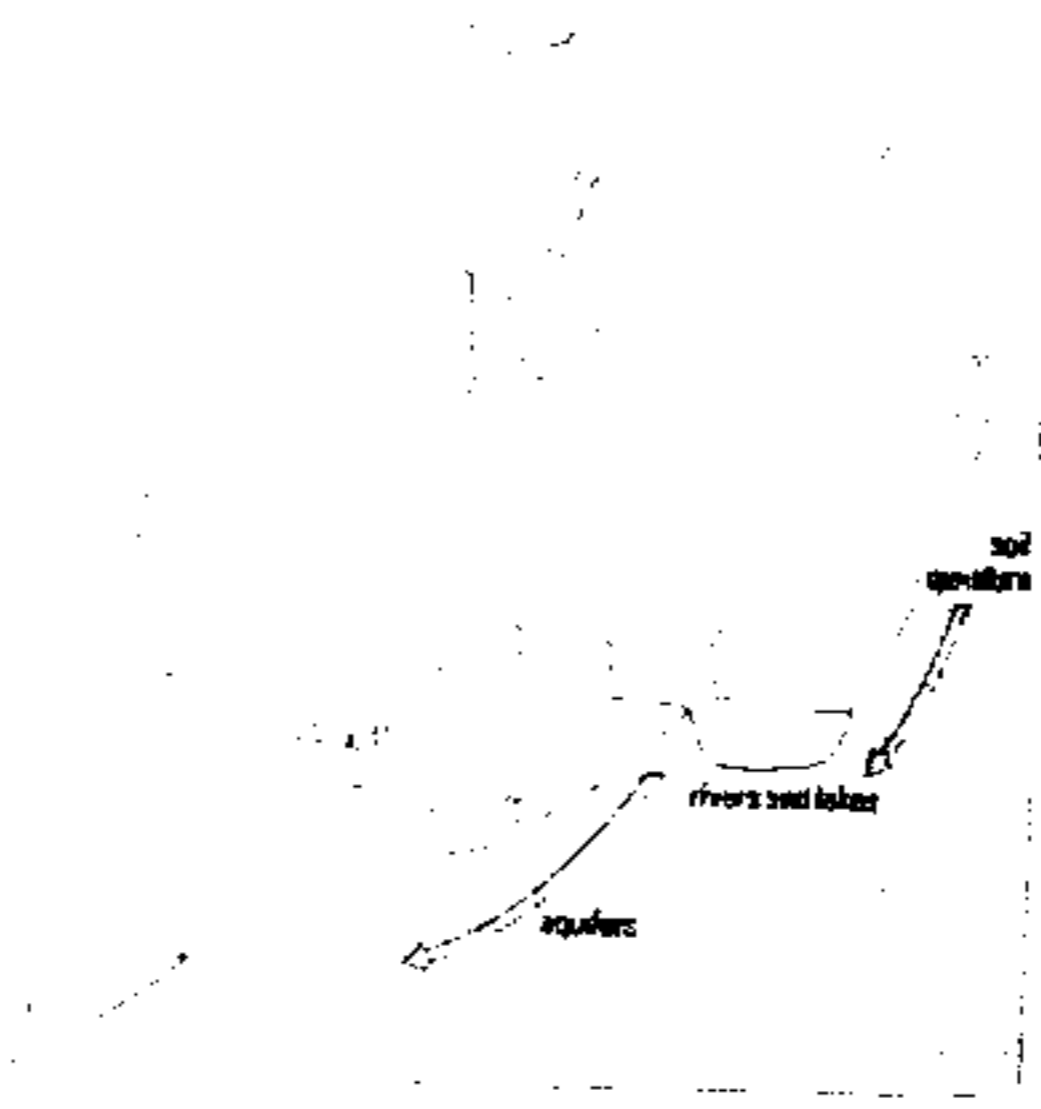
سورہ المعارج (70)

مِّنَ اللّٰهِ ذِى الْمَعَارِجِ ۝ تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ فِىْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ ۝ (70:3-4)

اللہ کی طرف سے ہوگا، جو عروج کے زینوں کا مالک ہے، اس کی طرف ملائکہ اور روح صعود کرتے ہیں ایک ایسے عرصۂ وقت میں جس کی مقدار پچاس ہزار سال کے برابر ہے۔

1۔"معارج"،"عروج" سے ہے، معارج کا معنی ہے زینے، سیڑھیاں، جب اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتو اس سے مراد وہی چیز ہوگی جو اس ذاتِ اقدس کے شایانِ شان ہے۔ سادہ طور پر اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ہر کام ایک طریقے سے ہوتا ہے۔ وہ کسی شے کو اس کی پست حالت سے درجہ بدرجہ ایک نظام کے مطابق عروج کی طرف لے کر جاتا ہے۔

2۔یوم کا لفظ یہاں عرصہ وقت اور دورانیہ کے معنوں میں ہے۔ پچاس ہزار سال کا عدد مقصود نہیں بلکہ محض عرصۂ وقت کی طوالت بیان کرنا مقصود ہے(حضرت ابن عباس سے یہی قول منقول ہے)۔

بعض لوگوں نے "یوم" سے مراد قیامت کا دن لیا ہے۔ لیکن اس کی تشریح میں ایک سے زیادہ آراء پیش کی جاتی ہیں۔ ایک ممکنہ تشریح یہ ہے کہ یوم سے مراد وہ طویل ترین مدتیں ہیں جن میں کائناتی، حیاتیاتی اور انسانی مظاہر وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ (مزید دیکھیں سورہ السجدہ 32:4-6 نوٹ 3۔

سورہ نوح (71)

مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا ۝ وَقَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا ۝ اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ۝ وَّجَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا وَّ جَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا ۝ وَاللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا ۝ ثُمَّ يُعِيْدُكُمْ فِيْهَا وَيُخْرِجُكُمْ اِخْرَاجًا ۝ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ بِسَاطًا ۝ لِّتَسْلُكُوْا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا ۝

(71:13-20)

تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ تم اللہ سے وقار کے آرزومند نہیں ہوتے، حالانکہ اُس نے تمہیں کئی مرحلوں سے گزار کر پیدا کیا ہے[1]۔

کیا تم نے دیکھا نہیں کہ کس طرح اللہ نے سات آسمان باہم مطابقت میں پیدا کئے ہیں۔ اور چاند کو ان میں چمکنے والا قرار دیا اور سورج کو (درخشاں) چراغ بنایا ہے[2]۔

اور اللہ ہی نے تمہیں زمین سے خاص اہتمام سے اُگایا ہے[3]۔ پھر وہ تمہیں اُسی میں لوٹاتا ہے اور وہ تمہیں دوبارہ پیدا کرے گا۔

اور اللہ ہی نے تمہارے لئے زمین کو ہموار بنایا ہے تاکہ تم اس کی کھلی راہوں میں چلو[4]۔

1۔ ''اُس نے تمہیں خلقت کے کئی مراحل سے گزارا ہے۔''اس سے مراد رحم مادر میں مختلف مراحل سے گزر کر جنین کا بتدریج بچہ کی شکل اختیار کرنا ہے۔ (دیکھیں سورہ المومنون 23:12-14)

اگر ارتقاءٗ کا تصور صحیح ہے تو اس سے مراد وہ مرحلے بھی ہوسکتے ہیں جو ابتدائی جاندار خلیہ کی بے جان مادے سے تخلیق سے انسان کے وجود پذیر ہونے تک اربوں سالوں میں طے ہوئے ہیں۔

2۔ طباقاً: چیزوں کا آپس میں ہم آہنگی اور مطابقت میں ہونا۔ ''آسمان'' نظم و ضبط اور خلقت و بناوٹ میں ایک دوسرے سے ہم آہنگ اور باہم مطابقت میں ہیں۔ ''سات آسمانوں'' کی تشریح پہلے کئی بار ہوچکی ہے۔ مثال کے طور پر دیکھیں سورہ البقرہ 2:29 نوٹ 5۔

کائنات میں اربوں ستارے ہیں جو چاروں طور روشنی بکھیرتے ہیں مگر وہ ایک دوسرے سے بہت فاصلے پر ہیں۔ چاند راتوں کو زمین کے لئے روشنی کا ذریعہ بنتا ہے۔ یہاں چاند کے لئے فِیهِنَّ (ان میں) کہا گیا ہے۔ اس لئے کہ بات زمین کی نسبت سے ہورہی ہے۔ ''چاند آسمانوں میں زمین کے لئے روشنی کا ذریعہ ہے'' سورج کے لئے ''سراج'' یعنی چراغ کا لفظ استعمال ہوا ہے کیونکہ سورج کی روشنی اس کی اپنی روشنی ہے جو اس کے اندر ہونے والے مرکزائی تعاملات (Nuclear Reactions) سے خارج ہوتی ہے۔ چاند کی روشنی اُس کی ذاتی روشنی نہیں بلکہ سورج ہی کی روشنی ہے جو اس کی سطح سے منعکس (Reflect) ہوتی ہے۔

3۔انسان کی تخلیق مٹی سے ہوئی ہے یعنی بے جان مادہ سے۔''انسان کو زمین سے نباتات کی طرح خلق کیا گیا ہے'' کا معنی کیا ہے؟

سادہ طور پر اس کا معنی ہے بے جان مادے سے ایک پیچیدہ اور لمبے کیمیائی اور حیاتیاتی عمل کے ذریعے سے انسان کی تخلیق۔

4۔''بِسَاطً''،''بَسَطً'' کے مادے سے کسی چیز کو پھیلانے اور ہموار کرنے کے معنی میں ہے۔ سطِح زمین انسان کے لئے فرش کی طرح بچھی ہوئی ہے ہم جانتے ہیں کہ زمین کے اندر کھولتا ہوا لاوا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے زمین کی سطح کو فرش کی طرح ہموار بنادیا ہے کہ اس کے اوپر انسان سہولت اور آرام کے ساتھ زندگی بسر کرسکتا ہے۔ اسے تمام ضروریاتِ زندگی سے آراستہ کیا گیا ہے۔

''فجاج'' (فج کی جمع): درّے، کشادہ راستے:

اونچے اونچے پہاڑوں کے درمیان درّے اور کشادہ راستے موجود ہیں جن سے گزر کر انسان ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں جا سکتا ہے۔ ممکن ہے اس سے مراد تمام وسائل و ذرائع حیات ہوں۔

سورہ القیامہ (75)

فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ۙ وَخَسَفَ الْقَمَرُ ۙ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۙ يَقُوْلُ الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ اَيْنَ الْمَفَرُّ ۚ (75:7-10)

پس جب نگاہیں خیرہ ہوجائیں گی، اور چاند گہنا جائے گا، اور سورج اور چاند جمع کردیئے جائیں گے[1]۔ تو اس وقت انسان کہے گا کہ کہاں بھاگوں۔

1۔''سورج اور چاند جمع کردیئے جائیں گے'' کا کیا معنی ہے:

ا۔سورج اور چاند دونوں بے نور کردیئے جائیں گے اور یوں بے نوری میں دونوں یکساں ہوجائیں گے۔

۲۔چاند سورج میں جذب ہوجائے گا اور یوں جسمانی طور پر دونوں آپس میں مل جائیں گے۔

سائنسی لحاظ سے اگرچہ یہ دونوں صورتیں ممکن ہیں۔ تاہم جدید دور کے Astronomy اور Cosmology کے انکشافات دوسرے امکان کی تائید کرتے ہیں۔ حسابات بتاتے ہیں کہ آج سے کوئی پانچ ارب سال بعد سورج پھیل کر ایک بہت بڑے وجود کی شکل اختیار کرلے گا اس حالت کو سرخ دیو (Red Giant) کہا جاتا ہے۔ اس حالت میں سورج اتنا بڑا ہوجائے گا کہ وہ چاند کو اپنے اندر جذب کرسکتا ہے۔

سورہ الدھر (76)

هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا ○ اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ ۖ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ○ اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا ○ (76:1-3)

کیا ایسا نہیں ہے کہ انسان پر زمانے میں ایک ایسا وقت گزرا ہے جب وہ کوئی قابل ذکر چیز نہیں تھا[1]۔ بلاشبہ ہم نے انسان کو ایک مخلوط نطفہ سے پیدا کیا[2]، ہم اسے الٹتے پلٹتے رہے[3] یہاں تک کہ اُسے ہم نے سننے والا، دیکھنے والا بنادیا[4]۔ہم نے اُسے راستہ دکھایا دیا ہے اب چاہے شکر گزار بنے چاہے احسان فراموش۔

1۔حین: مطلق وقت کو کہتے ہیں چاہے طویل ہو یا مختصر۔

دھر: وجودِ عالم کی ابتدا سے لے کر انتہا تک کے عرصۂ وقت کو دھر کہا جاتا ہے۔ زمانہ۔

آیت کہتی ہے کہ ''انسان پر زمانے میں ایک ایسا وقت بھی گزرا ہے جب وہ کوئی قابل ذکر چیز نہیں تھا۔'' اس سے کیا مراد ہے؟ آیت کے مفہوم کو سمجھنے کے لئے اس بات کو سمجھنا ضروری ہے کہ یہاں ''انسان'' سے کیا مراد ہے۔ دو احتمالات ہیں:

ا۔ ایک یہ کہ انسان سے مراد انسان بطورِ نوع ہے یعنی نوع انسانی یا

دوسرے لفظوں میں اوّلین انسان۔

۲۔ دوسرے یہ کہ انسان سے مراد ہر فردِ بشر ہے۔

پہلی صورت میں ''وقت'' (حین) سے مراد ہوگا بے جان مادے سے انسانی تخلیق کے عمل کی ابتداء سے لے کر اس حالت تک کا وقت جب کہ انسان مکمل انسانی شکل میں ظاہر ہوا۔ اس میں پھر دو احتمالات ہیں: ایک تدریجی یا ارتقائی تخلیق کا، دوسرا براہ راست تخلیق کا۔

دوسری صورت میں وقت سے مراد وہ وقت ہے جب جنین رحمِ مادر میں بالکل ابتدائی حالت (Zygote) سے نشوونما پاتا ہوا مکمل انسانی بچہ کی شکل میں آتا ہے۔

2۔ ''اِمشَاج'' (مَشج کی جمع): مخلوط، خلط ملط۔

نطفہ: پانی کے وہ چند قطرے یا تھوڑا سا پانی جو خالی کرنے پر ڈول میں باقی رہ جاتا ہے۔ صاف نتھرے ہوئے پانی کو بھی نطفہ کہا جاتا ہے (لسان العرب)، اس کا اطلاق مرد کے مادۂ منویہ پر بھی ہوتا ہے اور عورت کے مادہ تولید پر بھی۔ اور دونوں کے ہم آمیز ہونے پر جو مادہ وجود میں آتا ہے اُس پر بھی۔ یہاں ''نطفہ امشاج'' سے مراد غالبًا وہ نطفہ ہے جو مرد اور عورت کے تولیدی مادوں کے اختلاط اور ملاپ سے بنتا ہے۔ باپ کے مادہ منویہ میں اسپرم (Sperms) ہوتے ہیں جبکہ ماں کے تولیدی مادہ میں بیضہ یا اووَم ہوتا ہے۔

ایک اسپرم اور اووَم کے ملاپ سے ایک واحد خلیہ وجود میں آتا ہے جسے زائی گوٹ (Zygote) کہتے ہیں۔ یہ نشوو نما اور بالیدگی کے مختلف مراحل سے گزرکر بالآخر انسانی بچہ کی شکل اختیار کرتا ہے۔

3۔ ''نبتلیہ'' اس کا معنی دو طرح سے کیا جاتا ہے:

ایک یہ کہ ''تاکہ ہم اُسے آزمائیں''۔ اس صورت میں مفہوم ہوگا کہ ''ہماری منشاء یہ تھی کہ ہم اُسے آزمائیں گے اس لئے ہم نے اُسے سننے اور دیکھنے کی صلاحیت عطا کی۔

دوسرا معنی یہ کیا جاتا ہے'' اُسے الٹتے پلٹتے رہے''۔ اس صورت میں مفہوم ہوگا اُسے مختلف نشوو نمائی مراحل سے گزارتے رہے حتیٰ کہ وہ سننے والا دیکھنے والا بن گیا۔ ہم نے متن میں اسی دوسرے معنی کو ترجیح دی ہے۔''نبتلیہ'' اصل میں ''ابتلا'' کے مادے سے ہے اس کا ایک معنی آزمائش ہے۔ لیکن چونکہ آزمائش میں کسی چیز کو الٹ پلٹ کر مختلف پہلوؤں سے دیکھا جاتا ہے اس لئے

الٹنے پلٹنے ''جانچ پرکھ کرنے'' اور مختلف تبدیلیوں اور مراحل سے گزارنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

4۔ ''اُسے سننے والا اور دیکھنے والا بنادیا''۔ یہاں انسان کی پانچ حسوں (Five senses، حواسِ خمسہ) میں سے دو کا ذکر ہوا ہے یعنی سننے کی حس اور دیکھنے کی حس۔ اگر غور کیا جائے تو ہدایت و راہنمائی کے اعتبار سے سب سے اہم حسیں یہی دو ہیں۔

ایک بات یہاں اور بھی غور طلب ہے وہ یہ کہ یہاں ''سننے والا'' کا لفظ '' دیکھنے والا'' کے لفظ سے پہلے آیا ہے۔ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کے کان پہلے ہی سے کھلے ہوتے ہیں کہ ان پر کوئی پردہ ہی نہیں ہوتا جب کہ آنکھیں بند ہوتی ہیں۔ لہٰذا سننے کا عمل یقیناً دیکھنے سے پہلے شروع ہوتا ہے۔

نَحْنُ خَلَقْنٰهُمْ وَشَدَدْنَآ اَسْرَهُمْ ۚ وَاِذَا شِئْنَا بَدَّلْنَآ اَمْثَالَهُمْ تَبْدِيْلًا ۝ (76:28)

ہم ہی نے ان کو پیدا کیا ہے اور ان کے جوڑ بند مضبوط کیے ہیں[1]۔ اور جب ہم چاہیں گے ٹھیک انہی کے مانند بدل دیں گے۔

آیت میں تین باتیں کہی جارہی ہیں۔

ا۔انسان کی تخلیق:

۲۔جوڑ بند مضبوط کرنا:

۳۔ایک گروہ انسانی کی جگہ ایک دوسرا گروہِ انسانی پیدا کرنا، یا آخرت میں انسان کو دوبارہ پیدا کرنا۔

1۔جوڑ بند مضبوط کرنا: یہاں ''اسر'' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس کا معنی ہے ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ مضبوطی سے باندھنا۔ انسان کے اعضا مضبوطی سے ایک دوسرے کے ساتھ عضلات کے ذریعے بندھے ہوئے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو انسان اپنے قدو قامت پر نہ کھڑا ہوسکتا اور نہ کوئی کام کرسکتا۔

فَاِذَا النُّجُوْمُ طُمِسَتْ ۙ وَاِذَا السَّمَآءُ فُرِجَتْ ۙ وَاِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ ۙ (77:8-10)

پس جب کہ ستارے بے نشان کردیئے جائیں گے، آسمان پھٹ جائے گا، پہاڑ ریزہ ریزہ کردیئے جائیں گے۔

ان آیات میں اگر الفاظ اپنے لغوی معنوں (Literal meaning) میں ہوں تو، قربِ قیامت کے موقع پر کائنات میں ہونے والی تبدیلیوں کی طرف اشارہ ہے۔

طمست: طمس کے مادہ سے کسی چیز کے آثار کو محو اور زائل کرنے کے معنی میں ہے۔ یہاں معنی ہوگا۔

۱۔ ستاروں کی روشنی کا محو ہوجانا ہے۔

۲۔ان کے ریزہ ریزہ ہوکر بکھر جانا۔

ممکن ہے یہ دونوں ہی معنی مراد ہوں۔ قربِ قیامت کے موقع پر ستارے اپنی روشنی کھودیں گے۔ ان کے اندر ہائیڈروجن گیس کے ''جلنے'' (یعنی نیوکلیائی تعاملات : Nuclear Reactions) کا عمل ہورہا ہے ایک وقت آئے گا جب تمام ہائیڈروجن ختم ہوجائے گی اور یوں بالآخر یہ ستارے بے نور ہوجائیں گے۔

بڑے ستاروں کے بارے میں سائنسی تحقیق کہتی ہے کہ وہ زوردار دھماکہ سے پھٹ جاتے ہیں (Supernova اور Nova) اور ان کے ذرات خلاء میں بکھر جاتے ہیں۔

''آسمان پھٹ جائے گا'' سے ممکن ہے اجرامِ سماوی کا درہم برہم ہونا مراد ہو یا ہوسکتا ہے کہ زمین کے کرۂ ہوائی کا تحلیل ہوجانا اور اس میں سوراخوں

(Holes) کا بن جانا مراد ہو۔

پہاڑوں کے ریزہ ریزہ ہونے سے ممکن ہے کہ زمین کی سطح پر بڑے پیمانے پر (Cataclysmic changes) کے ہونے کی طرف اشارہ ہو۔

اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا ۙ اَحْيَآءً وَّاَمْوَاتًا ۙ وَّجَعَلْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ شٰمِخٰتٍ وَّاَسْقَيْنٰكُمْ مَّآءً فُرَاتًا ۙ (77:25-27)

کیا ہم نے زمین کو سمٹنے والی نہیں بنایا۔ زندوں اور مردوں کو[1]۔ اور ہم نے ہی اس میں اونچے اونچے پہاڑ بنائے ہیں اور ہم ہی نے تمہیں میٹھا پانی پلایا ہے[2]۔

1۔ زمین زندوں اور مردوں دونوں کو سمیٹ کر رکھنے والی ہے۔ اس کی تخلیق اس طرح کی گئی ہے کہ ہر زندہ اور مردہ مخلوق اس میں سمائی ہوئی ہے۔

''کفاتا'' جمع کرنے، سمیٹنے اور کسی چیز کو کسی دوسری چیز کے ساتھ ملانے کے معنی میں ہے۔ زمین زندوں کو اپنے اوپر جمع رکھتی ہے جبکہ مردوں کو اپنے اندر جگہ دیتی ہے۔

پرندوں کی سریع اور تیز پرواز کو بھی کفات کہتے ہیں کیونکہ تیز پرواز کے دوران وہ اپنے پروں کو سمیٹ لیتے ہیں تاکہ زیادہ تیزی کے ساتھ ہوا کو چیر کر آگے بڑھ سکیں۔ اس بنیاد پر یہ بھی ممکن ہے کہ ''کفاتا'' یہاں زمین کی حرکت کی طرف اشارہ ہو کہ وہ اپنے تمام تر زندوں اور مردوں کو لئے ہوئے تیزی سے گردش کررہی ہے۔ اس میں آیت کا مفہوم کچھ یوں ہوگا۔

کیا ہم نے زمین کو ایسا نہیں بنایا کہ وہ زندوں اور مردوں کو لئے ہوئے تیز حرکت کررہی ہے۔

2۔ پہاڑوں کی چوٹیاں بلند ہوتی ہیں اور ان کی جڑیں زمین میں اندر تک گئی ہوتی ہیں۔ ان کے بہت سے فائدے ہیں۔ جس پر کئی بار پہلے روشنی ڈالی

جاچکی ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ ان کی چوٹیوں پر جمی ہوئی برف (گلیشیر ز وغیرہ) سے دُنیا کو تازہ پانی فراہم ہوتا ہے۔ اسی کے پگھلنے سے سارا سال دریا بہتے ہیں یہی پانی چشموں وغیرہ کی شکل میں جگہ جگہ سے اُبل پڑتا ہے۔ گویا اونچے پہاڑوں اور میٹھے پانی (Fresh water) میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔

[پہاڑوں کے چند دوسرے فائدے: ان میں طرح طرح کی معدنیات ہوتی ہیں، ان پر قسم قسم کے درخت اور جڑی بوٹیاں اگتی ہیں جو لکڑی کا سامان، دوائیں اور دوسری چیزیں بنانے کے کام آتی ہیں، یہ موسموں کے تغیرات اور بارش کے برسنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ یہ چاند وغیرہ کی کشش سے سطح زمین میں ممکن طور پر پیدا ہونے والے مدّوجز (Tides) کو قابو میں رکھتے ہیں۔ زمین کے اندر (اس کے مینٹل (Mantle) میں پیدا ہونے والی حملی رووَں (Convectional currents) سے ممکنہ طور پر سطح زمین میں پیدا ہونے والی ارتعاشوں کو قابوں میں رکھتے ہیں۔ پہاڑ کرۂ ہوائی میں بلندی تک گئے ہوتے ہیں لہٰذا اس کو اپنے ساتھ گردش میں رکھتے ہیں اس کے علاوہ پہاڑ طوفانوں اور آندھیوں کو کنٹرول کرتے ہیں۔]
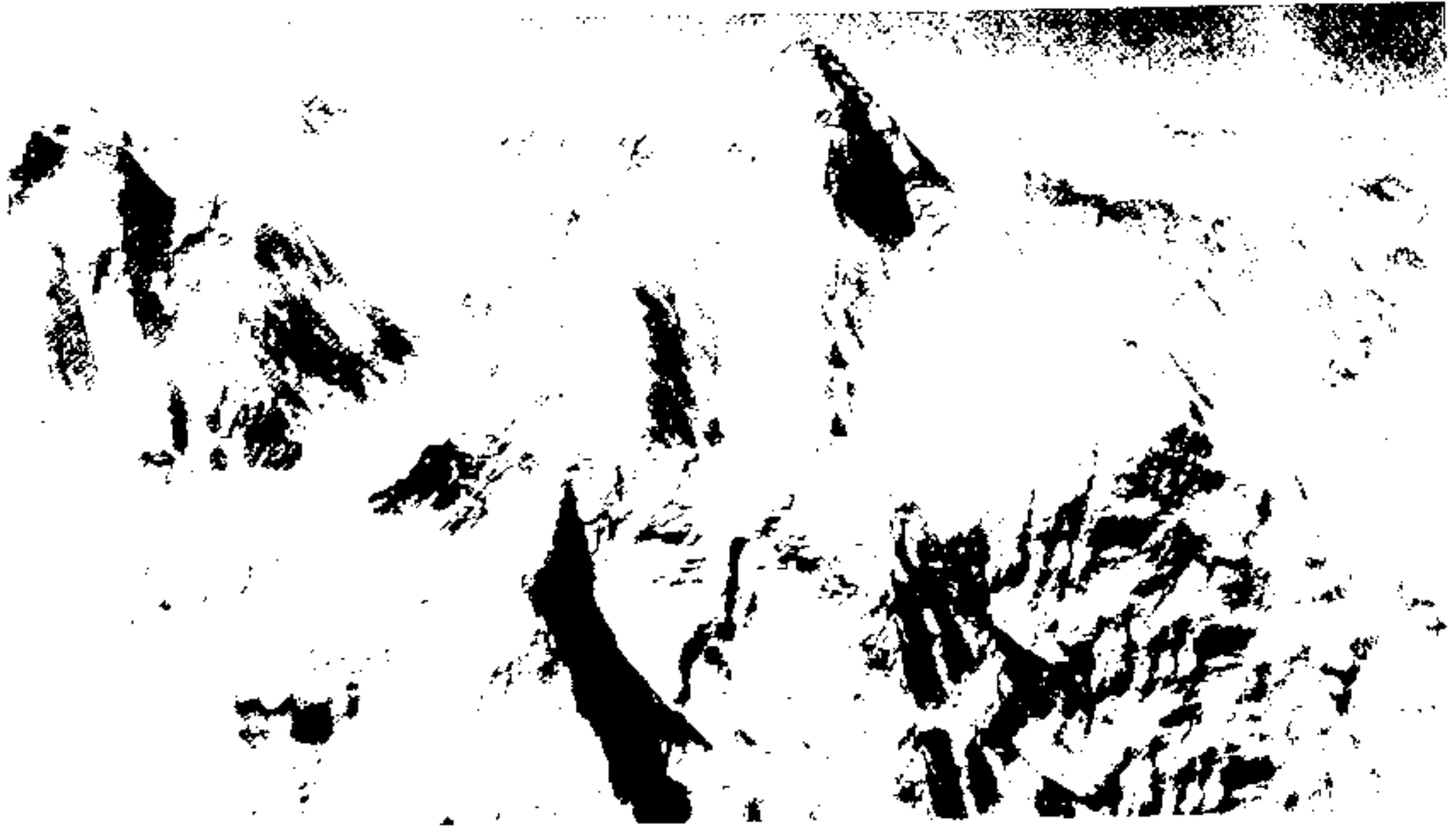
پاکستان کا سب سے بلند پہاڑ کے ٹو۔ پہاڑوں پر جمی ہوئی برف دریاؤں کی شکل میں تازہ پانی فراہم کرتی ہے۔

اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا ۙ وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا ۙ وَّخَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا ۙ وَّجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا ۙ وَّجَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا ۙ وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ۪ وَّبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا ۙ وَّجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا ۪ۙ وَّاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا ۙ لِّنُخْرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّنَبَاتًا ۙ وَّجَنّٰتٍ اَلْفَافًا ؕ (78:6-16)

کیا ہم نے زمین کو گہوارہ[1] نہیں بنایا اور پہاڑوں کو میخیں[2]؟

اور ہم نے تمہیں جوڑا جوڑا پیدا کیا[3]،

اور تمہاری نیند کو آرام کا باعث بنایا[4]

اور رات کو پردہ پوش بنایا[5]

اور دن کو وقتِ معاش بنایا[6]۔

اور تمہارے اوپر سات محکم (آسمان) بنائے[7]

اور ایک روشن چراغ بنایا[8]

اور ہم نے پانی سے بھرے بادلوں سے موسلادھار پانی برسایا تاکہ اس کے ذریعے سے ہم اناج اور (دوسرے) نباتات اُگائیں اور گھنے باغات[9]۔

1۔ ''مہاد'' (مصدر ہے) اور یہاں صاف ستھری، ہموار جگہ یا بچھونا اور فرش کے معنوں میں ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ ''مہد'' کے مفہوم میں ہو، معنی ہوگا گہوارہ اور پنگھوڑا۔

مطلب یہی ہے کہ زمین انسان کے لئے اُسی طرح ہے جیسے کہ بچے کے لئے گہوارہ۔ دوسرے لفظوں میں مطلب ہوگا کہ زمین کو بچھونا بنایا گیا ہے اس پر انسان اس طرح چلتا پھرتا ہے جیسے لوگ بچھونے پر چلتے پھرتے ہیں۔ زمین تمہاری قرار گاہ اور چلنے پھرنے اور رہنے بسنے کی جگہ ہے۔

زمین ایسی ہے کہ انسان اُس پر آرام کے ساتھ اپنے مقصدِ حیات کی جدوجہد کرسکتا ہے۔ ارضیات (Geology) کی جدید دریافتوں کے مطابق زمین کا اندرونی حصہ سخت گرم ہے۔ اس کے اوپر قشرِ ارض (Earth crust) یعنی زمین کی اوپر کی سطح ایک بچھونے کی طرح بچھی ہوئی ہے۔ جس پر انسان آرام سے رہتا ہے۔ اس بات سے بے خبر کہ وہ جس سطح پر کھڑا ہے اس کے نیچے گرم لاوا موجود ہے۔(مزید دیکھیں سور البقرہ 2:22)

2۔ یہاں پہاڑوں کو زمین کی میخیں قرار دیا گیا ہے۔

''اوتاد''،''وتد'' کی جمع ہے، وہ شے جو گاڑی جائے اور اس سے کسی متزلزل اور متحرک شے کو مضبوط کیا جائے۔ پہاڑ کسی میخ کی طرح زمین کے اندر گہرائی تک گئے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور یہ سطحِ زمین کی اضطراری حرکت کو روکتے ہیں۔ ان دو پہلوؤں سے یہ میخ سے مماثلت رکھتے ہیں۔ یعنی اس بنیاد پر کہ ان کی جڑیں زمین میں گہرائی تک پھیلی ہوتی ہیں اور اس بنیاد پر کہ یہ زمین کی سطح کو لرزنے سے روکتے ہیں۔

3۔ انسان کو دو صنفوں یعنی مرد اور عورت کی صورت میں پیدا کیا، جس سے نسلِ انسانی کی بقا کی ضمانت بھی ملتی ہے اور یہ ایک دوسرے کے سکون اور راحت کا سبب بھی ہیں۔

4۔ ''سبات''،''سبت'' کے مادے سے ہے۔ اس کے معنی کاٹنے اور منقطع کرنے کے ہیں۔ نیند کو سبات کہنے کی وجہ یہ ہے کہ سکون حاصل کرنے کا موقع فراہم کرتی ہے جس سے انسان تازہ دم ہوجاتا ہے۔ لہٰذا سبات کا لفظ آرام کی خاطر کام کاج چھوڑ دینے کے مفہوم میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہوا ہے نیند سے انسان کو ذہنی وجسمانی آرام حاصل ہوتا ہے، اس کی توانائی

بحال ہوتی ہے اور اس کی فعالیت کی تجدید ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر انسان کی فعال زندگی میں نیند کے وقفے نہ ہوتے تو زندگی موت سے بدتر ہوجاتی۔

5۔رات کو لباس یا پردہ پوش بنایا۔ جس طرح لباس بدن کو چھپاتا ہے، اسی طرح رات کی تاریکی زمین کو ڈھانپتی اور چھپاتی ہے۔ جس طرح لباس جسم کی حفاظت کرتا ہے، اسی طرح رات کو جب انسان آرام کرتا ہے تو اس کی صحت کی حفاظت ہوتی ہے۔

6۔ دن کو معاش کے حصول کا وقت بنایا۔ مقصد یہ ہے کہ انسان جدوجہد کرے اور محنت سے سامانِ حیات اور وسائلِ زندگی حاصل کرے۔ دن میں روشنی ہوتی ہے جو حرکت و عمل پر برانگیختہ کرتی ہے۔ جس طرح اندھیرے کو آرام سے خصوصی نسبت ہے اسی طرح روشنی کا کام سے خصوصی تعلق ہے۔

7۔ سات محکم اور مضبوط چیزیں کیا ہیں۔ مفسرین نے اس سے ''آسمان'' مراد لئے ہیں۔ اگر ''سات'' عدد تکثیری ہو یعنی کثرت کا معنی دے رہا ہو تو آیت کا مفہوم ہوگا: وسیع کائناتی نظام (Cosmic System) جو بے شمار کہکشاؤں، ستاروں، سیاروں اور دوسرے اجرام سماوی پر مشتمل ہے۔

8۔روشن چراغ سے مراد ہے سورج: یہاں ''وھاج'' کا لفظ توجہ طلب ہے۔ اس کا معنی ہے وہ جو روشنی اور حرارت دونوں کا زبردست منبع ہو۔ سورج میں یہ دونوں چیزیں موجود ہیں۔ جن کے لئے مجموعی طور پر، دورِجدید میں شمسی توانائی (Solar energy) کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔

جدید دور میں اس توانائی کو''قید'' کرنے اور اسے مختلف طریقوں سے انسان کی فلاح و بہبود کے لئے کام میں لانے کی کوشش ہورہی ہے۔ بعض ممالک میں پہلے ہی شمسی توانائی کو مختلف کاموں کے لئے استعمال کیا جارہا ہے۔

9۔یہ اللہ تعالیٰ ہی ہے جس کے قانون کے مطابق بادلوں سے بارش برستی ہے۔ معصرات کا معنی ہے برسنے کے لئے آمادہ اور پانی سے بھرے ہوئے بادل۔ ''معصرات " ، "معصر'' کی جمع ہے یہ عصر کے مادے سے ہے۔ اس کے معنی دبانے اور نچوڑنے کے ہیں بادل چونکہ خود کو دباتے اور نچوڑتے ہیں (Condensation اور Prectpitation، تکثیف اور ترسیب) جس سے بارش ہوتی ہے۔ اس لئے یہ لفظ پانی سے بھرے ہوئے بارش برسانے والے بادلوں

کے لئے استعمال ہوا۔ زندگی کا دارومدار پانی پر ہے پانی جب زمین پڑتا ہے تو بیج
اُگتے اور پودے نشو و نما پاتے ہیں اور فصلیں، دوسری جڑی بوٹیاں اور پھلوں کے
باغات پروان چڑھتے ہیں۔

ءَاَنۡتُمۡ اَشَدُّ خَلۡقًا اَمِ السَّمَآءُ ؕ بَنٰهَا ۟ رَفَعَ سَمۡكَهَا فَسَوّٰىهَا ۙ وَ اَغۡطَشَ لَيۡلَهَا وَ اَخۡرَجَ ضُحٰهَا ۪ وَ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ؕ اَخۡرَجَ مِنۡهَا مَآءَهَا وَ مَرۡعٰىهَا ۪ وَ الۡجِبَالَ اَرۡسٰىهَا ۙ مَتَاعًا لَّكُمۡ وَ لِاَنۡعَامِكُمۡ ؕ (79:27-33)

کیا (تمہاری سمجھ کے مطابق) تمہارا پیدا کرنا مشکل ہے یا آسمان کا، اُس نے اُسے بنایا ہے۔
اس کی بلندی کو خوب اونچا کیا[1]، پھر اُسے بہترین ساخت عطا کی[2]۔ اُس کی رات کو تاریک کیا اور اس کی روشنی کو ظاہر کیا۔
اور اس کے بعد زمین کو ہموار کیا[3]۔ اس سے اُس کا پانی اور سبزہ نکالا۔ اور پہاڑوں کو اس میں گاڑا۔ (یہ سب کچھ کیا) تمہاری اور تمہارے مویشیوں کی نفع رسانی کے لئے۔

1۔ان آیات میں ''آسمان اور زمین'' (کائنات) کی تخلیق پر روشنی پڑتی ہے۔
''آسمان'' سے مراد کائنات بطورِ مجموعی ہے جس کو آج Universe یا Cosmic System یا Cosmos کہتے ہیں۔''سمک'' کے معنی اصل میں بلندی ہی ہیں۔ امام فخرالدین رازی کہتے ہیں کہ کسی چیز کی بلندی کا جب اوپر والی سمت سے نیچے کی طرف اندازہ لگائیں تو اسے عمق (گہرائی) کہتے ہیں جب نیچے

سے اوپر کا اندازہ لگائیں تو اُسے ''سمک'' (بلندی، اونچائی) کہا جاتا ہے،(تفسیر کبیر)۔ آسمان کی ''بلندی'' سے مراد کائنات کی وسعت ہے، اس میں اجرام سماوی کے ایک دوسرے سے بہت طویل فاصلوں کی طرف اشارہ ہے۔

2۔''سویٰ'' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس کا معنیٰ ہے کسی چیز کو ٹھیک ٹھیک ایسا بنانا جیسا کہ اپنے مقصد تخلیق کے اعتبار سے اُسے ہونا چاہیئے۔ اردو میں اس کے مفہوم کو ایک لفظ میں پوری طرح ادا کرنا مشکل ہے۔قریبی معنیٰ درست کرنا، موزوں و مناسب بنانا، یا بہترین ساخت پر بنانا کے لفظوں سے ادا کئے جاسکتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ کائنات اللہ تعالیٰ کی خلاقیت کا مظہر ہے۔ یہ ایک نہایت مستحکم نظام پر قائم ہے اس میں کوئی تخلیقی کجی اور نقص نہیں ہے۔ اسے بہترین ساخت پر پیدا کیا گیا ہے۔

''آسمان'' میں بے شمار ستارے ہیں۔ خود ہماری کہکشاں (یعنی ملکی وے : Milky Way) میں تقریباً ایک سو ارب سے زیادہ ستاروں کا حساب لگایا گیا ہے۔ ہر ستارہ روشنی اور حرارت خارج کررہا ہے لیکن اس کے باوجود کائنات میں اندھیرا پھیلا ہوا ہے جیسا کہ رات کو ہمیں نظر آتا ہے۔ اس کی ایک سادہ وجہ یہ ہے کہ ستارے ایک دوسرے سے بے انتہا دور ہیں۔

یہ بات بھی توجہ طلب ہے کہ ''رات'' اور ''دن'' کے ظہور کی بات یہاں زمین کے حوالے سے کی جارہی ہے۔ لیلھا اور ضحاھا (اس کی رات،اور اس کی روشنی) کی ضمیریں آسمان کی طرف لوٹتی ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ زمین پر ظہور پذیر ہونے والے دن اور رات کا تعلق ایک آسمانی جرم (Heavenly body) یعنی سورج سے ہے۔ زمین کے جس حصے کو سورج چمکاتا ہے وہاں دن ہوتا ہے اور جہاں اُس کی روشنی نہیں پہنچ رہی ہوتی وہاں رات ہوتی ہے۔

اگر یہ بات درست ہے کہ زمین ابتدا میں ''آگ'' کا ایک گولا تھی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ابتدا میں اس پر''رات اور دن کا نظام'' موجود نہیں تھا، پھر جب اس کی سطح ٹھنڈی ہوگئی اور اس کی اپنی روشنی ختم ہوگی تو اس پر رات اور دن کا نظام قائم ہوا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ اس آیت کریمہ میں جو یہ کہا جارہا ہے کہ اُس کی رات کو تاریک کیا اور اُس کی روشنی کو (یا دن کو) ظاہر کیا، اس کا تعلق اُسی زمانے سے ہے۔

اس میں بالواسطہ طور پر زمین کی ''محوری گردش'' (Spin) کی طرف بھی اشارہ ہوسکتا ہے کیونکہ رات دن کا نظام جو کہ زمین پر موجود ہے اُسی سے پیدا ہوتا ہے۔

3۔ اس کے بعد زمین کا ''تدحیہ'' کیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ''دحٰھا'' کا کیا معنی ہے۔ اس کے معنی ہیں: بچھانا، ہموار بنانا، پھیلانا، گولائی دینا، دور پھینکنا، وغیرہ۔ یہ ایک لفظ اصل میں اُس سارے ارضیاتی سلسلۂ عمل کی طرف اشارہ کررہا ہے جس کے نتیجے میں زمین نے وہ شکل اختیار کی جس میں آج وہ ہمیں نظر آتی ہے۔

آگے ذکر ہے ''اُس سے اُس کا پانی نکالا''۔ زمین کا سارا پانی ابتدا میں زمین کے اندر تھا جو بعدازاں آتش فشانی عمل کے ذریعے اُبل کر زمین کے اوپر آیا۔

پھر زمین اس قابل ہوئی کہ اس میں زندگی نمودار ہوسکے جس سے آگے چل کر نباتات پیدا ہوئے۔

اسی دوران اس میں پہاڑ وجود میں آئے، جن کے طرح طرح کے فائدے ہیں۔

فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖٓ ۙ اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ۙ ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا ۙ فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا ۙ وَّعِنَبًا وَّقَضْبًا ۙ وَّزَيْتُوْنًا وَّنَخْلًا ۙ وَّحَدَآئِقَ غُلْبًا ۙ وَّفَاكِهَةً وَّاَبًّا ۙ مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ۭ (80:24-32)

پس انسان کو چاہئے کہ اپنی غذا پر نظر ڈالے[1]:

ہم نے خوب پانی برسایا[2] پھر زمین کو خوب پھاڑا[3]

اور اس میں اگایا اناج، اور انگور اور ترکاریاں، اور زیتون اور کھجور، اور گھنے باغات، اور میوے اور سبزہ......

سامانِ حیات تمہارے لئے اور تمہارے مویشیوں کے لئے[4]۔

1۔انسان ''نظر ڈالے'' (فلینظر) سے مراد محض ظاہری طور پر دیکھنا نہیں۔ بلکہ غور و فکر کرنا اور حقیقت کو سمجھنا ہے۔ سائنسی اعتبار سے اس کا معنی ہے اس کی ترکیب (Composition)، اس کے وجود میں آنے اور تشکیل پانے کا عمل جس میں بے جان مادہ (عناصر اور مرکبات) نامیاتی مرکبات اور زندہ مادے (Living matter) میں تبدیل ہوتا ہے (نباتات، اناج، پھلوں اور ترکاریوں کی شکل میں)۔ اس کا دوبارہ بے جان مادی اشیاء میں تبدیل ہونا مثلاً جب اُسے پکاتے ہیں، یا جب وہ ہضم ہوتی ہے پھر اس کے اجزاء کا انسان کا جزوِ بدن بننا (Assimilation)۔ اور یوں ایک بار پھر زندہ مادے میں

تبدیل ہوجانا وغیرہ، یہ غذا کے وہ سب پہلو ہیں جو انسان سے اللہ تعالیٰ کی خلاقیت کا تعارف کراتے ہیں۔

غذائی علم (Food Science) دورِ جدید میں بہت تیزی سے ترقی کررہا ہے۔ جس میں غذا کی نوعیت، اس کے اجزاء، اس کے اثرات اور افعال اور غذائی اہمیت (Food value) سب زیرِ بحث آتے ہیں۔

2۔غذائی حوالے سے سب سے پہلے ذکر بارش کا ہورہا ہے۔ پانی زندگی کا لازمی جزو ہے۔ زمین پر تازہ پانی (Fresh water) کا بنیادی منبع بارش ہی ہے۔ دریا، نہریں، چشمے اور کنویں وغیرہ اپنا پانی بالآخر بارش ہی سے حاصل کرتے ہیں۔

3۔زمین کو پھاڑنے یا چیرنے کی تعبیر وسیع ہے۔

پانی جب زمین میں پڑتا ہے تو پودے اُسے اور اس میں حل شدہ مادی اجزا کو جذب کرتے ہیں۔ جس سے وہ اُگتے، نشوونما پاتے، اور پھلتے پھولتے ہیں۔ بیج سے جب پودا نشو و نما پاتا ہے تو اس کی ننھی سی کونپل زمین کو پھاڑتی ہوئی باہر آجاتی ہے۔ یوں اُگنے والا ہر پودا زمین کو پھاڑتا ہے۔

انسان ہل کے ذریعے زمین کو پھاڑتا ہے، اس کے علاوہ جب وہ کوئی بیج بوتا اور کوئی پودا اگاتا ہے تو زمین کو کھودتا ہے۔

بہت سے کیڑے مثلاً کیچوا (Earth worm) بھی زمین کو پھاڑنے اور نرم و ہموار کرتے ہیں۔

زمین کے پھٹنے میں چٹانوں اور پتھروں کا ریزہ ریزہ ہونا اور زراعت کے قابل مٹی میں تبدیل ہونا بھی شامل ہے۔ اسے کٹاؤ (Erosion) کہا جاتا ہے۔ یہ ایک ارضیاتی عمل (Geological Process) ہے۔ جو کروڑوں سالوں سے زمین کی سطح پر ہورہا ہے اور بہت سے عوامل(Factors) ہیں جو زمین کو پھاڑتے، اور چٹانوں کو مٹی میں تبدیل کرتے ہیں، اور دوسری تبدیلیاں لاتے ہیں۔

4۔آٹھ قسم کی اُگنے والی اشیاء کا خاص طور پر ذکر ہوا ہے:

۱۔اناج، ۲۔انگور، ۳۔سبزیاں، ۴۔زیتون، ۵۔کھجور، ۶۔گھنے باغات (پھلوں اور سبزیوں کے)، ۷۔میوے اور پھل، ۸۔چارہ (جیسے خود رو گھاس)۔

یہ اشیاء وہ ہیں جن میں سے اکثر سے انسان اپنی غذا حاصل کرتا ہے اور بعض سے مویشی چارہ حاصل کرتے ہیں۔

سورہ تکویر (81)

إِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ۝ وَإِذَا النُّجُومُ انكَدَرَتْ ۝ وَإِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ ۝ (81:1-3)

جب سورج لپیٹ دیا جائے گا[1]، اور جب ستارے بے نور کردیئے جائیں گے[2]۔ اور جب پہاڑ رواں کردیئے جائیں گے[3]۔

1۔اگر یہ الفاظ اپنے لغوی معنی میں ہیں تو یہ قربِ قیامت کے موقع پر کائنات جسے ہم جانتے میں ہونے والی تبدیلیوں کی طرف اشارہ ہے۔

''کوّرت'' تکویر کے مادے سے ہے۔ جب کوئی شخص اپنی لمبی دستار کو سر کے گرد لپیٹتا ہے تو اس کے لئے عرب یہ لفظ استعمال کرتے ہیں۔

سورج کے لپیٹے جانے سے کیا مراد ہے۔ جدید سائنس یہ کہتی ہے کہ سورج میں زبردست نیوکلیائی تعاملات (Nuclear Reactions) ہورہے ہیں جس میں ہائیڈروجن گیس ہیلیئم گیس میں تبدیل ہورہی ہے۔ تقریباً پانچ ارب سال بعد ساری ہائیڈروجن ہیلیئم میں تبدیل ہوچکی ہوگی۔ اس طرح سورج کا سارا ''ایندھن'' ختم ہو جائے گا جس کے نتیجے میں سورج بجھ جائے گا۔(اس کے بعد سورج میں کئی اور تبدیلیاں آئیں گی وہ Red Giant (سرخ دیو) بنے گا، اس کے بعد White Dwarf (سفید بونا) کی شکل اختیار کرے گا وغیرہ) (تفصیل کے لئے دیکھیں راقم کی کتاب ''کائنات قرآن اور سائنس'')

بہرحال! سائنسی سطح پر اب یہ بات ایک تسلیم شدہ امر ہے کہ ایک مدت کے بعد سورج بجھ جائے گا اور اپنے اختتام کو پہنچ جائے گا۔

2۔ سورج ایک اوسط درجے کا ستارہ ہے۔ ہر ستارے میں یہی نیوکلیائی تعامل ہورہا ہے۔ بالآخر تمام ستارے بے نور ہوجائیں گے۔ ستاروں کے ختم ہونے

کے ایک سے زیادہ طریقے ہیں کوئی ستارہ کس طریقے سے ختم ہوگا اس کا دارومدار بنیادی طور پر اُس کی کمیت (مقدارِ مادہ Mass) پر ہے۔

3۔ جب سورج تباہ ہوجائے اور ستارے بکھر جائیں گے تو صاف ظاہر ہے کہ زمین بھی اپنی موجودہ حالت اور مدار پر نہ رہ سکے گی۔ اور اس کا کیا انجام ہوگا، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ پہاڑ ریزہ ریزہ ہوکر بکھر جائیں گے۔ پہاڑ جو کہ زمین کے مضبوط ترین اجسام ہیں جب ان کا یہ حال ہوگا باقی چیزوں کے انجام کے بارے میں آسانی سے پیش گوئی کی جاسکتی ہے۔
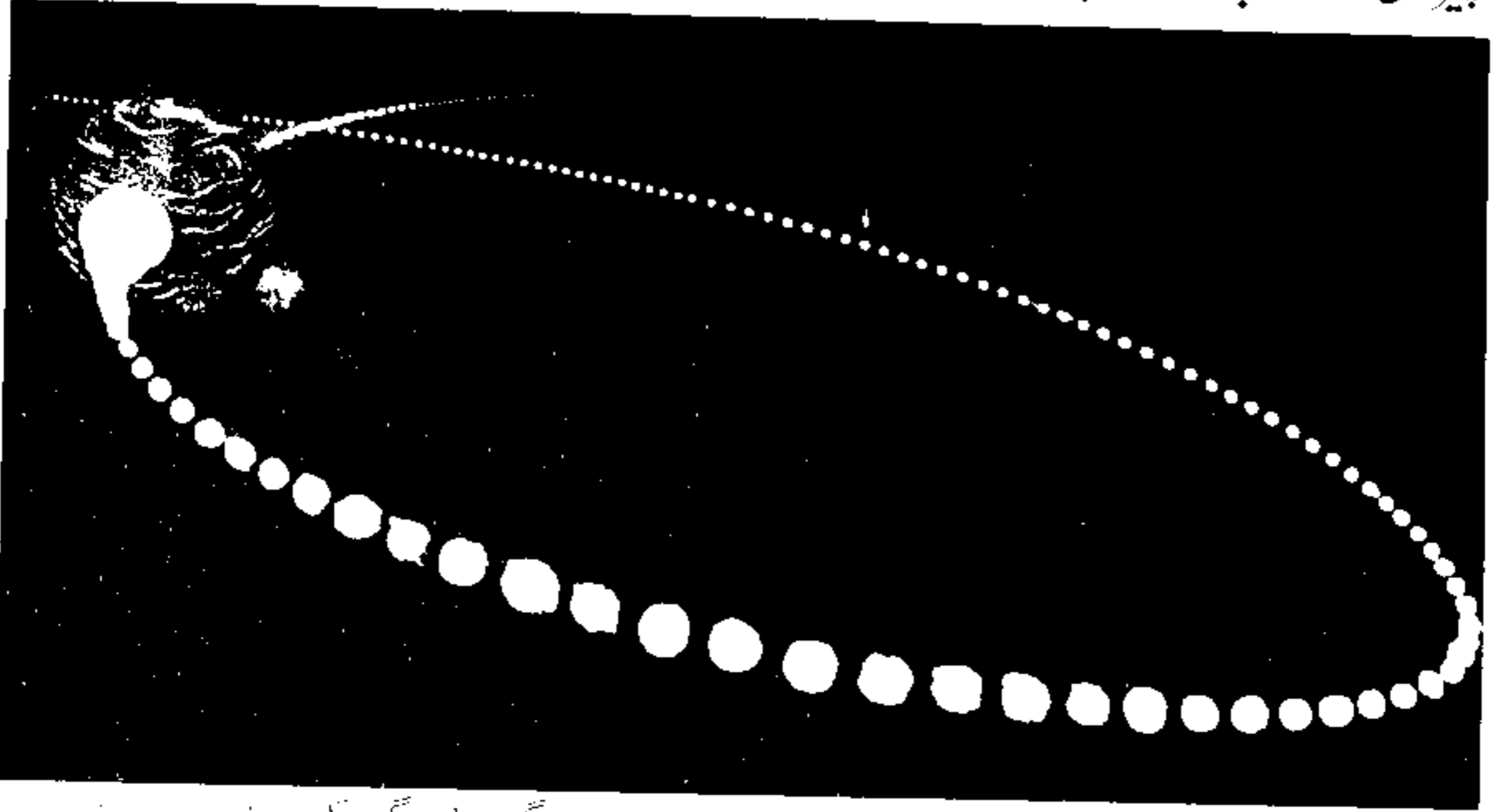
سورج کی تخلیق اور انجام۔ کوئی پانچ ارب سال قبل سورج گیس اور گرد کے بادل سے بنا۔ ہمارے سورج کی موجودہ حالت کو ظاہر کرتا ہے۔ آج سے پانچ ارب سال بعد سورج پھیل کر بہت بڑی شکل اختیار کر لے گا جسے Redgiant کہا جاتا ہے۔ ممکن ہے یہ اس وقت زمین تک پہنچ جائے۔ اس کے دو ارب سال بعد سورج دوبارہ سکڑنے لگے گا اور سفید بونے کی شکل اختیار کرے گا۔ کوئی پچاس ارب سال بعد یہ بجھ کر ختم ہو جائے گا۔

وَاِذَاالْبِحَارُ سُجِّرَتْ۝ (81:6)

اور جب سمندر ابل پڑیں گے۔

قربِ قیامت کے موقع پر سمندروں میں یہ تبدیلی آئے گی۔ وہ اپنی حدود سے باہر نکل پڑیں گے۔ سجرت کے معنی تنور میں ایندھن بھر کر بھڑکا دینے کے ہیں اس سے یہ سمندروں کے اپنی حدود سے باہر نکل پڑنے کے لئے استعمال ہوا

ہے۔ ''سجرت'' کا ایک معنی پُر ہونا بھی کیا گیا ہے۔ ممکن ہے کہ زلزلوں اور دوسری زمینی تبدیلیوں یا آسمانی پتھروں کے گرنے سے سمندر پُر ہوجائیں اور ان کا متلاطم پانی خشکیوں کی سطح پر جاری ہوجائے۔

دورِ جدید میں ایک اور چیز بھی سامنے آرہی ہے وہ یہ ہے کہ زمین کا درجہ حرارت آہستہ آہستہ بڑھ رہا ہے جس سے گلیشیرز زیادہ تیزی سے پگھل رہے ہیں۔ اس کے نتیجے میں سمندروں کے حجم میں اضافہ ہورہا ہے۔ آئندہ سو پچاس سالوں میں دنیا کے بہت سے ساحل پانی میں ڈوب جائیں گے۔

سائنسی سطح پر یہ بھی اندازہ ہے کہ آگے چل کر (سورج میں تبدیلیوں کی وجہ سے) زمین کا درجہ حرارت بہت بڑھ جائے گا جس کی وجہ سے زمین کا سارا پانی بخارات بن کر اڑ جائے گا۔ مزید دیکھیں سورہ الانفطار 82:3۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ ۙ الْجَوَارِ الْكُنَّسِ ۙ وَالَّيْلِ اِذَا عَسْعَسَ ۙ وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ ۙ

(81:15-18)

پس نہیں، قسم ہے مجھے! پیچھے ہٹنے والے، سیدھے چلنے والے اور چھپ جانے والے (آسمانی کرّوں کی) اور رات کی جب وہ جانے لگتی ہے اور صبح کی جب وہ سانس لیتی ہے۔

''خُنّس'' یہ خانِس کی جمع ہے جو خنس کے مادے سے ہے خنس کا معنی ہے پیچھے ہٹنا، لوٹنا، پلٹنا وغیرہ۔

''جوار'' جاریہ کی جمع ہے اس کا معنی ہے: تیزی سے گزرنے والے، سیدھا چلنے والے۔

''کُنّس'' یہ کانس کی جمع ہے جو کَنس کے مادے سے ہے۔ اس کا معنی ہے چھپ جانا، اپنے ٹھکانے میں داخل ہونا۔

ان آیات کی تشریح میں کئی آرا ملتی ہیں تاہم سب سے قوی رائے یہ

معلوم ہوتی ہے کہ ان آیات میں جن چیزوں کی قسم فرمائی گئی ہے وہ سیارے (Planets) ہیں خاص طور پر وہ پانچ سیارے جو دوربین کے بغیر خالی آنکھ سے بھی نظر آتے ہیں یعنی عطارد (Mercury)، زہرہ (Venus)، مریخ (Mars)، مشتری (Jupiter)، اور زحل (Saturn)۔

آج سائنسی طور پر ہمیں معلوم ہے کہ آسمان کے تمام ستارے (Stars) اور سیارے (Planets) اور دیگر اجرام سب حرکت میں ہیں لیکن ستارے ہم سے بہت دور ہیں جس کی وجہ سے اُن کی ایک دوسرے کے لحاظ سے حرکت ہمیں محسوس نہیں ہوتی اور ان کے باہمی فاصلے ہمیشہ یکساں ہی معلوم ہوتے ہیں لیکن سیارے چونکہ ہمارے بہت قریب ہیں لہٰذا یہ حرکت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مذکورہ بالا پانچ سیارے بشمول دوسرے چار سیاروں (زمین، یورینس، نیپچون اور پلوٹو) کے سورج کے گرد تقریباً گول مداروں پر گردش کرتے ہیں تاہم زمین سے مشاہدہ کرنے پر ان کی حرکت کے راستے بڑے دلچسپ نظر آتے ہیں ان کی تفصیل فلکیات (Astonomy) کی کسی کتاب میں پڑھی جاسکتی ہے مختصر یہ کہ ایک وقت تک سیدھے چلتے ہیں پھر واپس پلٹ آتے ہیں اور پھر دوبارہ آگے کی طرف حرکت شروع کردیتے ہیں۔

ان آیات میں ممکن ہے اس طرف اشارہ ہوکہ یہ سیارے سیدھا حرکت کرتے ہیں (**الجوار**)، اور پھر اپنی حرکت میں پیچھے لوٹ کر آتے ہیں (**الخنس**) اور پھر سورج کے طلوع کے وقت نظروں سے اوجھل ہوجاتے ہیں (**الکنس**)۔ یہ بھی ممکن ہے کہ **الکنس** سے مراد ان سیاروں کا سورج کی روشنی میں چھپ جانا ہو۔ سورج کے گرد گردش کرتے ہوئے کبھی وہ اس نقطہ پر پہنچ جاتے ہیں جہاں زمین سے وہ نظر نہیں آتے۔

''**الجوار**'' (تیزی سے حرکت کرنے والے) اُن جہازوں اور کشتیوں کو بھی کہتے ہیں جو سمندر میں چل رہی ہو۔ لہٰذا یہاں ان سیاروں کو جو خلائے بسیط میں حرکت کررہے ہیں، کو کشتیوں کے سمندروں میں چلنے سے تشبیہ دی گئی ہے۔

سورہ الانفطار (82)

إِذَا السَّمَاءُ انفَطَرَتْ ۝ وَإِذَا الْكَوَاكِبُ انتَثَرَتْ ۝ وَإِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ ۝ (82:1-3)

جب آسمان پھٹ جائے گا، اور جب ستارے بکھر جائیں گے اور جب سمندر بہادیئے جائیں گے۔

''آسمان پھٹ جائے گا'' سے ممکن ہے کرۂ ہوائی کا پھٹ جانا، بکھر جانا اور ختم ہوجانا مراد ہو ''ستاروں کے انجام'' کے لئے دیکھیں۔ ''کائنات قرآن اور سائنس''۔

''سمندر بہا دیئے جائیں گے'' کی تشریح کے لئے دیکھیں سورہ تکویر 81:6، یہاں اتنا کہنا کافی ہوگا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ سمندر اپنی حدود سے باہر نکل آئیں گے۔ آیات کا سادہ مطلب یہ ہے کہ قربِ قیامت کے موقع پر کائنات میں بڑے پیمانہ پر ایسی تبدیلیاں آئیں گی جن کے نتیجے میں یہ کائنات اپنے انجام کو پہنچ جائے گی۔

يَا أَيُّهَا الْإِنسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ ۝ الَّذِي خَلَقَكَ فَسَوَّاكَ فَعَدَلَكَ ۝ فِي أَيِّ صُورَةٍ مَّا شَاءَ رَكَّبَكَ ۝ (82:6-8)

اے انسان! تجھے تیرے ربِ کریم کے بارے میں کس چیز نے دھوکے میں ڈال رکھا ہے! جس نے تیری تخلیق کی، اور تجھے بہترین ساخت عطا کی، پھر تجھے اعتدال بخشا، جس شکل میں چاہا تجھے ترکیب دیا۔

یہاں انسانی خلقت کے چار اہم نکات بیان ہوئے ہیں:

۱۔تخلیق یا وجود میں لانا۔ ۲۔تسویہ (تناسب، تنظیم اور تکمیل تک پہنچانا)۔

۳۔اعتدال و توازن۔اور ۴۔ترکیب بندی (انسانی شکل میں لانا، صورت پذیری)۔

انسان کی ابتدا اُس خلیہ سے ہوتی ہے جسے زائی گوٹ (Zygote) کہتے ہیں اور جو باپ کی طرف سے آئے ہوئے اسپرم اور ماں کی طرف سے آئے ہوئے بیضہ کے رحم مادر میں ملاپ سے بنتا ہے۔ زائی گوٹ میں نشوونما ہوتی ہے اور یہ مختلف مراحل سے گزرتا ہوا بالآخر پوری انسانی شکل میں آجاتا ہے۔

''سوّیٰ'' (تسویہ کے مادے سے ہے) اس کا معنی ہے کسی چیز کو ٹھیک ٹھیک ایسا بنانا جیسا کہ اُسے اُس کے مقصد تخلیق کے اعتبار سے ہونا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہترین ذہنی اور جسمانی صلاحیتیں عطا فرمائی ہیں۔

جسمانی اعضا میں بہترین اعتدال، توازن اور تشاکل (Symmetry) ہے۔ مثلاً یہ نہیں کہ ایک آنکھ بڑی اور ایک چھوٹی ہو، یا ایک ہاتھ میں پانچ انگلیاں اور دوسرے میں کم یا زیادہ ہوں۔

تمام اعضا آپس میں ہم آہنگ اور مربوط ہیں۔ خلیئے مل کر بافت (Tissue) بناتے ہیں۔ بافتیں مل کر اعضاء (Organs) بناتے ہیں۔ اعضاکے ملنے سے نظام (System) بنتا ہے۔ اور تمام نظاموں کے ملنے سے جسم تشکیل پاتا ہے۔

مختلف نظام مثلاً نظام تنفس، نظامِ دورانِ خون، عصبی نظام، ہضمی نظام، اخراجی نظام سب ایک دوسرے کے ساتھ ہم ربط اور ایک دوسرے کے معاون ہیں۔

سورہ الانشقاق (84)

اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ ۙ وَ اَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَ حُقَّتْ ۙ وَ اِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ ۙ وَ اَلْقَتْ مَا فِیْهَا وَ تَخَلَّتْ ۙ وَ اَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَ حُقَّتْ ؕ (84:1-5)

جب آسمان پھٹ جائے گا اور اپنے رب کے حکم کی تعمیل کرے گا اور اس کے لئے یہی زیبا ہے[1]۔

اور جب زمین پھیلادی جائے گی اور وہ باہر پھینک دے گی جو کچھ اس کے اندر ہے، اور خالی ہوجائے گی۔ اور وہ اپنے رب کے حکم کی تعمیل کرے گی اور اُسے یہی چاہئے[2]۔

1۔ ان آیات میں اُن تبدیلیوں کی طرف اشارہ ہے جو قربِ قیامت کے موقع پر برپا ہوں گی۔ ان کا ٹھیک ٹھیک نقشہ کھینچنا انسانی علم کی موجودہ سطح پر ممکن نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ مستقبل میں انسان کسی مرحلہ پر اس کے قابل ہوجائے۔ ''آسمان کے پھٹنے'' سے ہوسکتا ہے کہ کائناتی نظام کا درہم برہم ہونا مراد ہو۔ اس سے زمین کے کرۂ ہوائی کا شق ہونا اور اس میں سوراخ اور درازیں بن جانا بھی مراد لیا جاسکتا ہے۔

2۔ ممکن ہے اس سے یہ مراد ہو کہ زمین سے اس کے معدنیات بڑے پیمانے پر نکال لئے جائیں گے۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ ۙ وَ الَّیْلِ وَ مَا وَسَقَ ۙ وَ الْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ ۙ لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ؕ
(84:16-19)

پس نہیں! میں قسم کھاتا ہوں شفق کی، اور رات کی
اور ان چیزوں کی جنھیں وہ اپنے اندر سمیٹ لیتی ہے۔
اور چاند کی جب وہ ماہِ کامل بن جائے تم کو لازماً
طبق در طبق اوپر چڑھنا ہے۔

یہاں چار چیزوں کی قسم فرمائی گئی ہے: شفق، رات، وہ چیزیں جنھیں رات اپنے اندر سمیٹتی اور جمع کرتی ہے، اور چاند کی جب وہ ماہِ کامل بن جائے۔

شفق غروبِ آفتاب کے بعد مغرب کی طرف نظر آنے والی سرخی کو کہا جاتا ہے۔ یہ دن کے جانے اور رات کے آنے کا اعلان کرتی ہے۔

رات کی قسم ان بہت سے اسرار اور آثار کی وجہ سے ہے جو اس میں پوشیدہ ہوتے ہیں۔

وسق کا معنی ہے بکھری ہوئی چیزوں کو جمع کرنا، جب رات آتی ہے تو انسان (پرندے اور دوسرے جاندار) اپنے گھروں کو لوٹتے ہیں۔ دن لوگوں کو بکھیرتا ہے جب کہ رات جمع کرتی اور واپس گھروں میں لاتی ہے۔

پہلی تاریخ کو چاند ہلال کی شکل میں نظر آتا ہے پھر آہستہ آہستہ بڑھتا اور چودہویں شب کو اپنی پوری شکل میں نظر آتا ہے۔

ان چار چیزوں کو گواہ کے طور پر پیش کر کے اس حقیقت کو بیان کیا گیا ہے کہ انسان طبق در طبق اوپر چڑھے گا۔

''طبق در طبق اوپر چڑھنے'' کا کیا مفہوم ہے؟ ممکن ہے کہ یہ انسان کی علمی، ذہنی اور شعوری ترقی کی طرف اشارہ ہو۔ انسان علم و شعور کے میدان میں درجہ بدرجہ ترقی کرتا ہوا آگے بڑھتا جائے گا۔ اس کا ایک مظہر (Manifestation) خلائی سفر ہے۔ اور چاند کی قسم کے ساتھ اس کی ایک طرح کی مطابقت بھی ہے۔ خلائی سفر کے پہلے مرحلے کے طور پر انسان چاند پر قدم رکھ چکا ہے۔ اور دوسرے سیاروں پر اُس کے خلائی مشن (Space Missions) اور Probes تحقیق میں مصروف ہیں۔ زمین پر قائم تحقیقی آلات کی مدد سے بھی انسان دور دراز کی کہکشاؤں اور دوسرے اجرامِ سماوی کے متعلق تحقیق کر رہا ہے۔

آیت کی تشریح کے کچھ دوسرے احتمالات بھی ہیں:

۱۔وہ مراحل جن سے ہر انسان گزرتا ہے: دُنیا، برزخ، آخرت وغیرہ۔

۲۔انسان کی دُنیا کی زندگی کے مراحل جیسے جنینی حالت، بچپن، لڑکپن، جوانی، بڑھاپا وغیرہ۔

۳۔مختلف کیفیات جن سے انسان دنیا کی زندگی میں گزرتا ہے مثلاً صحت، بیماری، غم، خوشی امن اور جنگ وغیرہ۔

بظاہر وہی تشریح زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے جو ہم نے اوپر کی ہے۔
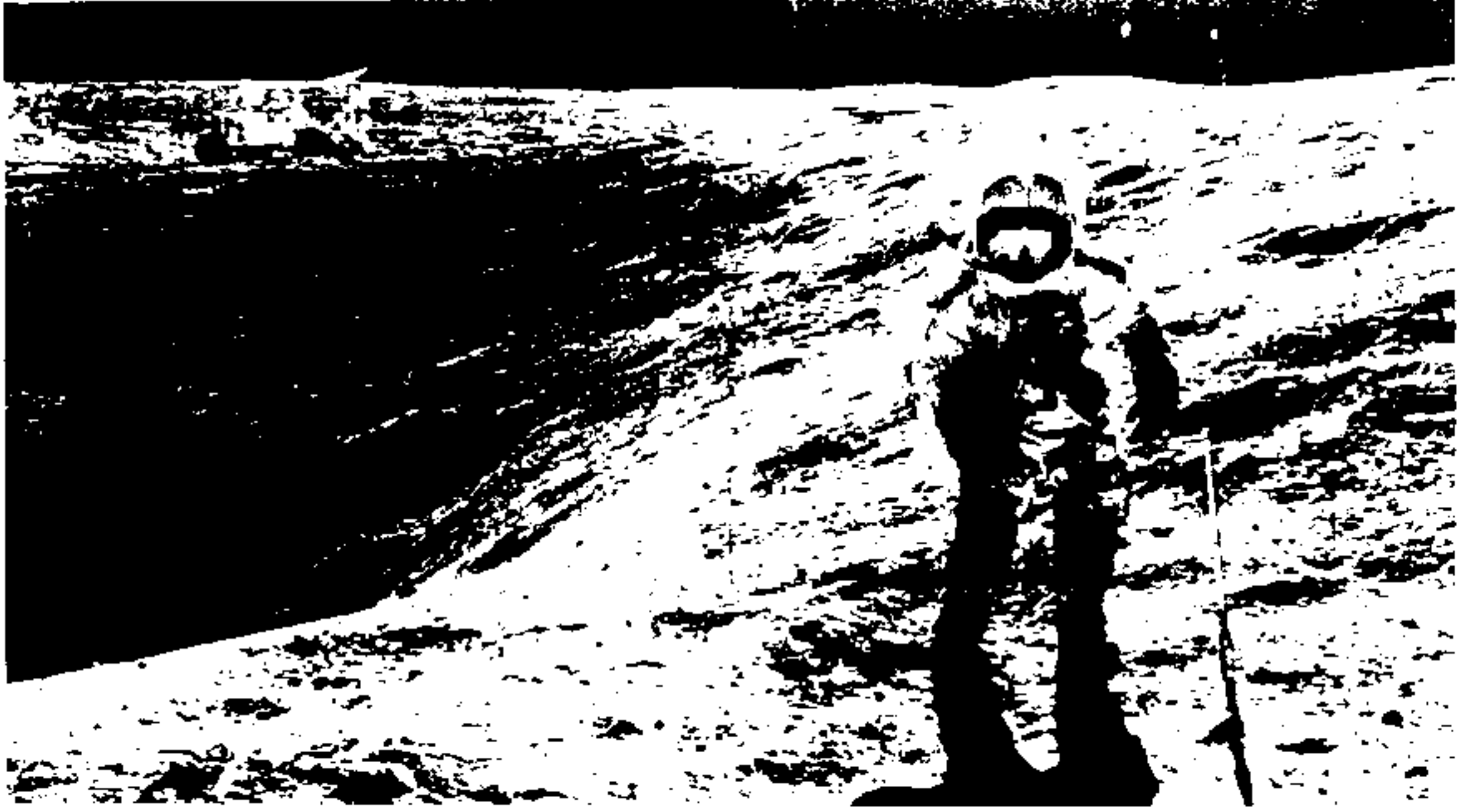
انسان خلا کے سفر پر۔ اپالو 11 کا ایک خلا باز چاند سے مٹی کا نمونہ جمع کررہا ہے۔

سورہ الطارق (86)

فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ۝ خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ۝ يَّخْرُجُ مِنْۢ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَآئِبِ۝
(86:5-7)

پس غور کرے انسان کہ اس کی تخلیق کس چیز سے کی گئی ہے۔وہ پانی سے پیدا کیا گیا ہے جو پشت اور سینے کے درمیان سے نکلتا ہے۔

Let man, then,observe out of what he has been created: he has been created out of a seminal fluid issuing from between the loins (of man) and the pelvic arch (of woman). (Asad)

''ماء دافق'' یعنی ماء مصبوب (بہایا گیا یا گرایا گیا پانی)۔ مراد ہے تولیدی پانی جو رحم میں مرد اور عورت کے پانیوں (Fluids) کے ملاپ سے بنتا ہے۔

''صُلب'' کے اصل معنی سخت کے ہیں، اسی صلابت (سختی) کی وجہ سے پشت کو بھی صلب کہتے ہیں۔(مفردات) (صلب واحد ہے، اس کی جمع اصلاب ہے۔)

''ترائب'' تربیه کی جمع ہے۔ تربیه کے کئی معنی بیان کئے گئے ہیں مثلاً تفسیر ابن کثیر میں ہے:

''تربیه کہتے ہیں ہار کی جگہ کو، کندھوں سے لے کر سینے تک کو بھی کہا گیا ہے، اور نرخرے سے نیچے کو بھی کہا گیا ہے، اور چھاتیوں سے اوپر کے حصہ کو بھی کہا گیا ہے اور نیچے کی طرف چار پسلیوں کو بھی کہا گیا ہے، اور دونوں چھاتیوں اور دونوں پیروں اور دونوں آنکھوں کے درمیان کو بھی کہا گیا ہے۔ دل کے نچوڑ کو بھی کہا گیا ہے، سینہ اور پیٹھ کے درمیان کو بھی کہا جاتا ہے۔'' (زیرنظر آیت)

چنانچہ اس آیت کی تشریح میں کئی آرا کا اظہار کیا گیا ہے۔ غالباً وہ مفہوم زیادہ بہتر ہے جو موریس بکیلے (Maurice Bucaille نے ڈاکٹر اے کے غراد، فیکلٹی آف میڈسن، بیروت کے سابق پروفیسر

(Dr A.K.Giraud, Former Professor at the Faculty of Medicine, Beirut).

کی معاونت سے بیان کیا ہے، جس کے مطابق:

"(Man) was fashioned from a liquid poured out. It issued (as a result) of the conjunction of the sexual area of the man and the sexual area of the woman.

''انسان کو ایک بہائے گئے مائع سے پیدا کیا گیا ہے۔ جو مرد کے جنسی علاقہ اور عورت کے جنسی علاقہ کے ملاپ کے نتیجے میں خارج ہوتا ہے۔''

یعنی صلب سے مراد مرد کا جنسی علاقہ یا جنسی عضو ہے اور ترائب سے مراد عورت کا جنسی علاقہ یا جنسی اعضاء ہیں۔ ملاحظہ کریں کہ صلب کا لفظ واحد اور ترائب کا لفظ جمع استعمال ہوا ہے۔ یہ بھی ملاحظہ کریں کے حافظ ابن کثیر نے ترائب کے جو معنی لکھیں ہیں ان میں ایک ''پیروں کے درمیان'' کا علاقہ بھی ہے۔ جبکہ علامہ محمد اسد نے ترائب کا معنی Pelvic arch کیا ہے۔

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجۡعِ ۙ﴿۱۱﴾ وَالۡاَرۡضِ ذَاتِ الصَّدۡعِ ۙ﴿۱۲﴾

(86:11-12)

فضائے آسمانی کی قسم! جس سے بارش برستی ہے۔
اور زمین کی جو (نباتات اُگتے وقت) پھٹ جاتی ہے۔

''رجع''، ''رجوع'' کے مادے سے ہے، اس کا معنی ہے لوٹانا۔
عرب بارش کے لئے بھی یہ لفظ استعمال کرتے تھے کیونکہ بارش میں اصل میں وہ پانی زمین کی طرف واپس لوٹتا ہے جو بخارات کی شکل میں زمین سے اُٹھا تھا۔ اس اعتبار سے معنی ہوگا:

قسم ہے آسمان کی جو بارش کی شکل میں پانی زمین کو واپس لوٹاتا ہے۔

"صدع" شگاف پڑنا، پھٹنا۔ زمین بارش کے پانی کو جذب کرتی ہے تو اس سے طرح طرح کے نباتات اُگتے ہیں۔ چونکہ نباتات زمین کی سطح کو پھوڑ کر باہر آتے ہیں اس لئے اسے اس لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے معنی ہوگا:

قسم ہے زمین کی جو پانی جذب کرکے نباتات اُگاتی ہے جو اس کی سطح کو پھوڑتے ہوئے باہر آتے ہیں۔

"آسمان" سے مراد ظاہر ہے کہ ہمارے سروں کے اوپر کی وہ فضائے آسمانی ہے جہاں بادل اُڑتے ہیں اور جہاں سے بارش ہوتی ہے۔

ان آیت میں ضمنی طور پر واٹر سائیکل (آبی چکر) کے ایک اہم مرحلے (زمین سے پانی کا بخارات کی شکل میں اُڑنا (Evaporation) اور بادل بننا) کی طرف اشارہ بھی موجود ہے۔
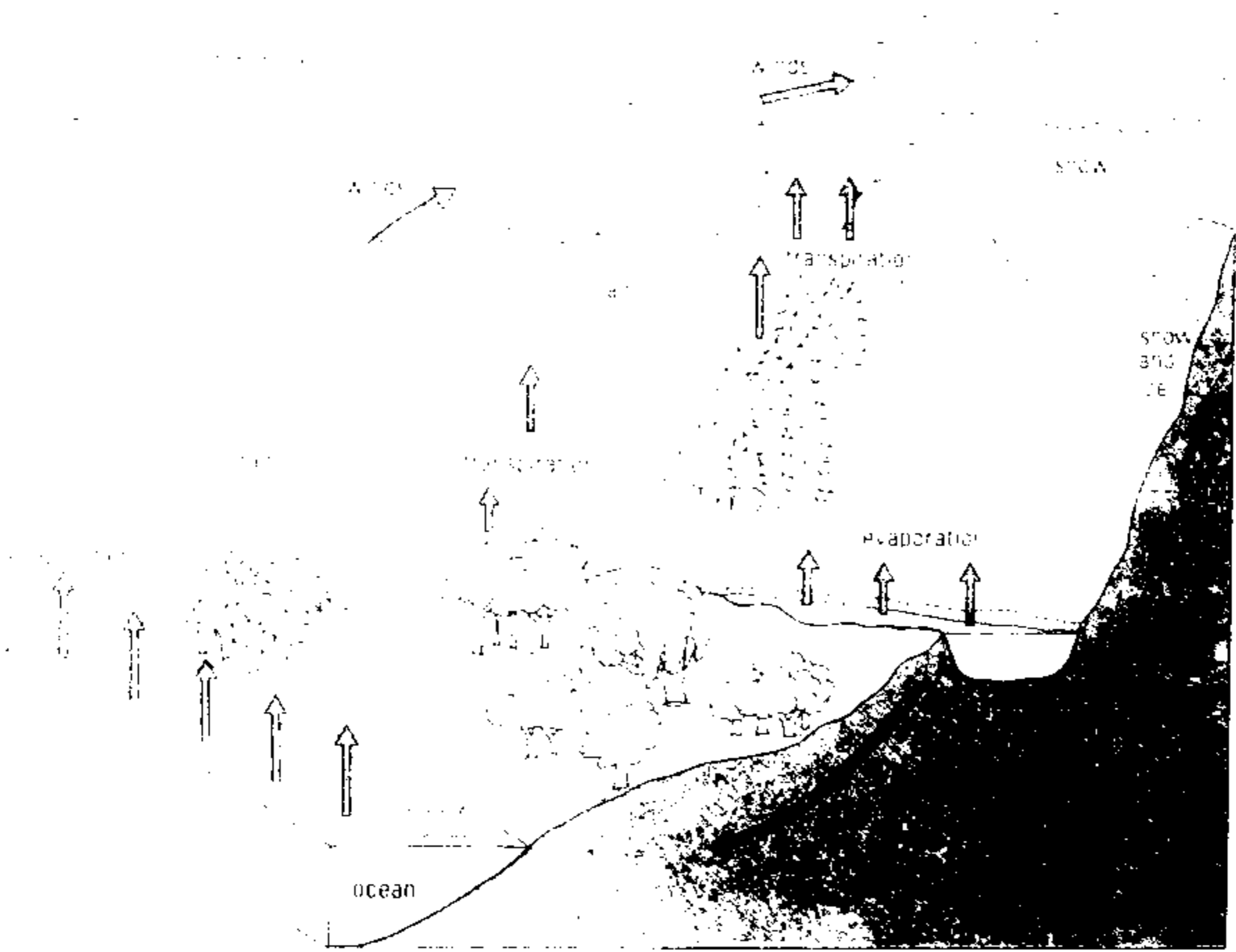
آبی چکر (واٹر سائیکل)

سورہ الاعلیٰ (87)

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى ۙ الَّذِي خَلَقَ فَسَوَّىٰ ۙ وَالَّذِي قَدَّرَ فَهَدَىٰ ۙ (87:1-3)

اپنے رب کے نام کی تسبیح کرو جو بلند و برتر ہے۔
جس نے تخلیق کی اور تسویہ کیا اور جس نے تقدیر ٹھہرائی
اور ہدایت عطا کی۔

یہاں کسی شے کی خلقت کے لئے چار اہم الفاظ استعمال ہوئے ہیں: تخلیق، تسویہ تقدیر اور ہدایت۔

تخلیق: اللہ تعالیٰ چیزوں کو ''خلق'' کرتا۔ یعنی اُن کا منصوبہ اور نقشہ بناتا ہے، ان کے مادۂ تخلیق کو وجود میں لاتا ہے اور اس مادۂ تخلیق سے انھیں پیدا کرتا ہے۔

تسویہ: کسی چیز کو ٹھیک ٹھیک ایسا بنانا جیسا کہ اُس کے مقصدِ تخلیق کے اعتبار سے اُسے ہونا چاہیے۔ بہترین ساخت پر بنانا۔

اللہ تعالیٰ ہر شے کو اُس کے مادہ تخلیق سے بہترین شکل میں ظہور پذیر کرتا ہے۔

تقدیر: تقدیر کا معنی ہے کسی چیز کے لئے ایک خاص طرح کی حالت ٹھہرا دینا خواہ یہ ٹھہراؤ کمیت میں ہو یا کیفیت میں۔

اللہ تعالیٰ نے ہر شے کے لئے ایک خاص اندازہ و حساب اور منصوبہ ٹھہرایا ہوا ہے جس سے وہ باہر نہیں جاسکتی۔ مثال کے طور پر ہر چیز اپنے ماحول کے ساتھ مکمل مطابقت میں ہوتی ہے۔ پرندے ہوا میں اُڑنے کے ساتھ، چوپائے زمین پر چلنے کے ساتھ اور مچھلیاں پانی میں تیرنے کے ساتھ مکمل سازگاری رکھتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مچھلی کو ایسا بنایا ہے کہ وہ پانی میں تیر سکتی ہے۔ مچھلی کو تیرنے والا وجود دیا تو اُس کے تیرنے کے لئے پانی بھی بنایا۔ پرندے کو ہوا میں اُڑنے

والا وجود عطا کیا تو اس کے اُڑنے کے لئے ہوا بھی تخلیق کی وغیرہ۔

ھدایت: ہدایت کے معنی ہیں راہ دکھانا اور راہ پر لگانا۔ ہدایت کی ابتدائی سطح وہ فطری ہدایت ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہر شے کی خلقت اور جبلت میں ودیعت کی ہے۔ یہ ہدایت ہر شے پر اُس کی زندگی کی راہیں کھولتی ہے۔

پرندہ جانتا ہے کہ اُسے ہوا میں اڑنا ہے اور کس طریقے سے اڑنا ہے۔ مچھلی کو پتا ہے کہ اُسے پانی میں کس طریقے سے اپنی زندگی بسر کرنی ہے۔ اس کی ایک نمایاں مثال شہد کی مکھی کی زندگی ہے۔ مثلاً وہ اپنے چھتے سے چاہے کتنی دور چلی جائے راستہ بھولے بغیر واپس آجاتی ہے۔

ہجرت کرنے والے پرندے جو سمندروں، جنگلوں اور بیابانوں کا ہزارہا کلومیٹرز کا فاصلہ طے کرکے ایک مقام سے دوسرے مقام پر جاتے ہیں، واپسی پر بغیر راستہ بھولے اپنے وطن پہنچ جاتے ہیں۔

چنانچہ اللہ ہی ہے جو چیزوں کو وجود میں لاتا ہے، انھیں بہترین ساخت عطا کرتا ہے، ان کے لئے زندہ رہنے کا راستہ طے کرتا ہے اور اس راستے پر چلنے کی انھیں راہنمائی عطا فرماتا ہے۔

سورہ الغاشیہ (88)

اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ۝ وَاِلَى السَّمَآءِ كَيْفَ رُفِعَتْ ۝ وَاِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ ۝ وَاِلَى الْاَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ ۝

(88:17-20)

کیا وہ نہیں دیکھتے[1] اونٹوں کی طرف، انھیں کیسے بنایا گیا ہے[2] اور آسمان کی طرف کہ کیسے بلند کیا گیا ہے[3]، اور پہاڑوں کی طرف کہ کیسے نصب کئے گئے ہیں[4] اور زمین کی طرف کہ کیسے بچھائی گئی ہے[5]۔

1۔ افلا ینظرون (کیا وہ دیکھتے نہیں) میں دیکھنے سے مراد سرسری اور محض ظاہری طور پر دیکھنا نہیں بلکہ بغور دیکھنا اور غور و فکر کرنا مراد ہے۔

2۔اونٹ کئی اعتبار سے ایک منفرد جانور ہے۔ یہ سواری اور بار برداری کے کام بھی آتا ہے، اس کا گوشت بھی کھایا جاتا ہے اور اس کا دودھ بھی پیا جاتا ہے۔ یہ مقابلتًا ایک بڑے قد و قامت کا جانور ہے لہٰذا زیادہ بوجھ اُٹھا سکتا ہے۔ یہ کئی روز تک پیاسا رہ سکتا ہے۔ علاوہ ازیں اس میں بھوک برداشت کرنے کی بھی صلاحیت ہے۔ یہ مشکل ریگستانی علاقوں میں بہ آسانی چل سکتا ہے، دورِ جدید میں بھی صحراؤں میں سواری اور بار برداری کا بہترین ذریعہ ہے۔ اسی لئے یہ ''صحرا کا جہاز'' کہلاتا ہے۔

ایک بڑا اور طاقتور جانور ہونے کے باوجود نہایت مطیع اور فرمانبردار ہوتا ہے۔

3۔ کائنات کی وسعتوں اور اس کے نظم و توازن کی طرف اشارہ ہے۔ کائنات میں اربوں کہکشائیں ہیں، اور ہر کہکشاں میں اربوں ستارے اور دوسرے

اجرام ہیں۔ کائنات وسیع اور عظیم ہونے کے باوجود ایک ہمہ گیر نظام کے تابع ہے۔

4۔ پہاڑ اپنی عظمت اور بلندی کے اعتبار سے خالق کائنات کی قدرت کا ایک ایسا مظہر ہیں جن کا اندازہ ایک عام آدمی بھی بہ آسانی کرسکتا ہے۔ پہاڑوں کے ''نصب'' کیے جانے کے الفاظ میں ممکن ہے اُن کی مضبوطی اور پائیداری کی طرف اشارہ ہو، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان کے وجود میں آنے کے عمل کی طرف اشارہ ہو۔

5۔ زمین کا پھیلایا یا بچھایا جانا اس ارضیاتی عمل (Geological Process) کا نتیجہ ہے اور جو اربوں سالوں سے زمین کی سطح پر جاری ہے۔

سورہ البلد (90)

اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِۙ وَلِسَانًا وَّشَفَتَيْنِۙ وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِۚ (90:8-10)

کیا ہم نے اسے دو آنکھیں نہیں دیں[1] اور ایک زبان[2] اور دو ہونٹ[3] اور اسے دونوں راہیں نہیں سمجھا دیں[4]!

1۔انسان کا بیرونی دنیا سے رابطہ حواس (Senses) کے ذریعے ہوتا ہے اور آنکھ سب سے اہم حس ہے۔ یہ ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ آنکھ کی بناوٹ اور اس کے دیکھنے کا عمل اپنے اندر غوروفکر کا گہرا سامان رکھتا ہے۔ دور بینوں اور خورد بینوں کی ایجاد نے آنکھ کے دائرہ کو بہت وسعت دے دی ہے۔

2۔زبان ذائقہ چکھنے اور بولنے میں استعمال ہوتی ہے۔ انسان اس کے ذریعے تبادلۂ خیالات کرتا اور اپنی بات دوسروں تک پہنچاتا ہے۔

بولی جانے والی زبان(Language) کو بھی عربی میں لسان کہتے ہیں۔ اس کے ذریعے علم اور اطلاعات ایک فرد سے دوسرے فرد، ایک قوم سے دوسری قوم اور ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتی ہیں۔

3۔ہونٹ بولنے میں اہم کردار ادا کرتے بعض حروف تو براہ راست ہونٹوں ہی سے ادا ہوتے ہیں۔ ہونٹ منہ کی رطوبت کو منہ سے باہر خارج ہوتے رہنے سے روکتے ہیں۔ اگر خدا نہ خواستہ ہونٹ نہ ہوتے تو نہ صرف یہ کہ انسان صحیح طور پر بول نہ سکتا بلکہ اس کا لعابِ دھن مسلسل منہ سے خارج ہوتا رہتا، جس سے منہ اندر سے سوکھ جاتا۔ پانی پینے اور کھانا کانے میں دشواری ہوتی اور چہرہ بدنما ہوجاتا۔

4۔''نجد'' اصل میں بلند مقام کو کہتے ہیں یہاں ''نجدین'' سے مراد

خیر اور شر کے راستے ہیں، مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو خیر اور شر کے دونوں راستے دکھا دیئے ہیں۔

یہ ہدایت فطری اور خلقی طور بھی ہوتی ہے۔ اس کو وجدانی ہدایت کہہ سکتے ہیں۔

یہ عقل و شعور سے بھی حاصل ہوتی ہے اسے عقلی ہدایت کہہ سکتے ہیں۔

اور یہ رسولوں (علیہم السلام) کے ذریعے سے بھی انسان کو پہنچی ہے اسے ہدایت بالوحی کا نام دے سکتے ہیں۔

سورہ الشمس (91)

وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا ۝ وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا ۝ وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰهَا ۝ وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰهَا ۝ وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰهَا ۝ وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰهَا ۝ وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا ۝ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا ۝
(91:1-10)

قسم ہے سورج کی اور اس کی روشنی کی[1] اور چاند کی جب وہ اس کی پیروی کرے[2] اور دن کی جب وہ اُسے روشن کرے[3] اور رات کی جب وہ اُسے ڈھانپ لے[4] اور آسمان کی اور جیسا اُسے بنایا[5] اور زمین کی اور جیسا اُسے بچھایا[6] اور قسم ہے نفس کی اور جیسا اُسے سنوارا۔ پس الہام کیا اُسے اُس کے فجور کا اور اس کے تقویٰ کا۔ یقیناً فلاح پا گیا وہ جس نے اُسے پاک رکھا اور یقیناً نامراد ہوا وہ جس نے اُسے آلودہ کیا۔

1۔قسم کا مطلب یہ ہے کہ انسان اُن چیزوں پر غور کرے جن کی قسم فرمائی جارہی ہے اور ان سے اس بات کے لئے شہادت اور گواہی کا کام لے جو آگے بیان ہونے والی ہے۔
''ضحیٰ'' کا بنیادی معنی ہے روشنی، اس کا اطلاق اس وقت پر بھی ہوتا

ہے جب سورج چڑھتا ہے اور اس کی روشنی پھیلتی ہے۔

2۔ چاند سورج کی روشنی کو منعکس کرتا ہے، اس طرح وہ سورج کی پیروی کرتا ہے یعنی سورج سے روشنی لے کر بکھیرتا اور راتوں کو منور کرتا ہے۔

3۔دن زمین کے ایک حصہ کو روشن کرتا ہے۔ دن کا تعلق سورج کی روشنی سے ہے لہٰذا یہ ممکن ہے کہ بطور کنایہ یہ کہا گیا ہو کہ دن سورج کو چمکاتا اور روشن کرتا ہے یعنی یہ دنیا والوں کے لئے سورج کے چمکنے کا وقت ہے۔

4۔ رات زمین کے ایک حصہ کو ڈھانپ لیتی ہے، وہ جگہ جہاں پہلے دن ہوتا ہے غروبِ آفتاب کے ساتھ ہی وہاں رات پھیل جاتی ہے۔

5۔''آسمان'' یعنی کائنات کو اللہ تعالیٰ نے حیرت انگیز وسعت عطا فرمائی ہے۔

6۔زمین کو ایسا بنا ہے کہ اس پر انسان اپنے مقصد حیات کی جد و جہد بہ آسانی کرسکتا ہے۔ ''طحا''،''طحو'' کے مادے سے بچھانے اور پھیلانے اور ہموار کرنے کے معنی میں آیا ہے۔ اس کا ایک معنی دھکیلنا بھی ہے اس لئے ہوسکتا ہے کہ زمین کی سورج سے علیحدگی اور سورج کے گرد گردش کرنے کی طرف اشارہ ہو۔

7۔یہاں ''نفس'' سے مراد انسان کی پوری شخصیت ہے۔ (Human personality)۔ اسے وجودِ انسانی یا ذاتِ انسانی یا اقبال کی زبان میں خودی کا نام دے سکتے ہیں۔ آیت کہتی ہے کہ نفسِ انسانی کو بہترین ساخت پر بنایا گیا ہے۔(سوّٰھا)۔ پھر فرمایا کہ اس کا فجور اور تقویٰ اس کے اندر الھام کردیا گیا ہے۔ ممکن ہے اس سے یہ مراد ہو کہ انسان کے بننے سنورنے، نشوونما پانے اور معرفت رب کے مقام تک پہنچنے اور ٹوٹنے، بکھرنے، زوال پانے اور روحانی پستیوں میں گرنے دونوں کی صلاحیت انسان کے اندر رکھی ہوئی ہے۔ جو اپنے نفس کو پاک و صاف رکھتا ہے۔ وہ اپنے مقصد حیات (معرفت رب/ تکامل ہستی) تک پہنچ جاتا ہے اور جو اپنے نفس کو آلودہ رکھتا ہے وہ منزلِ مقصود سے دور چلا جاتا ہے۔

سورہ العلق (96)

اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّکَ الَّذِیۡ خَلَقَ ۚ خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ مِنۡ عَلَقٍ ۚ اِقۡرَاۡ وَ رَبُّکَ الۡاَکۡرَمُ ۙ الَّذِیۡ عَلَّمَ بِالۡقَلَمِ ۙ عَلَّمَ الۡاِنۡسَانَ مَا لَمۡ یَعۡلَمۡ ؕ
(96:1-5)

پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔
پیدا کیا انسان کو علق سے، پڑھ اور تیرا رب بڑا ہی
کریم ہے جس نے تعلیم دی قلم کے ذریعے سے، اس
نے سکھایا انسان کو وہ کچھ جو وہ نہیں جانتا تھا۔

یہ پہلی وحی ہے۔ ان آیات میں حصول علم اور قلم کے استعمال پر جو زور دیا گیا ہے وہ بالکل ظاہر ہے۔

اس میں فرمایا گیا ہے کہ انسان کو ''علق'' سے تخلیق کیا گیا ہے۔ اس سے کیا مراد ہے؟ علق، علقۃ کی جمع ہے (جیسے ثمر ثمرہ کی جمع ہے) علقہ کے معنی کے لئے دیکھیں سورہ المومنون (23)۔

یہاں علق سے جنین کی وہ ابتدائی حالت مراد ہے جب وہ پہلے پہل خود کو رحم کی دیوار کے ساتھ چسپاں کرتا ہے۔ ہم اس کا معنی ''معلق وجود'' کر سکتے ہیں۔

سورہ الفلق (113)
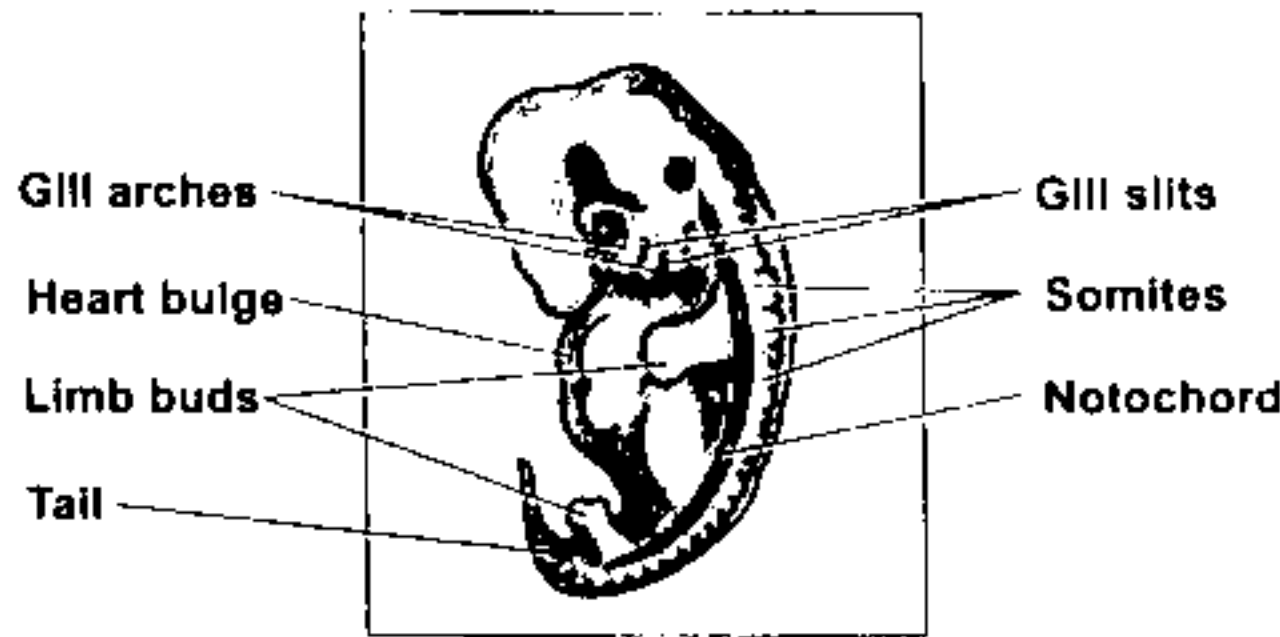
قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ۙ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ۙ
(113:1-2)

کہو! میں پناہ مانگتا ہوں شگافتہ کرکے پیدا کرنے والے رب کی ہر اُس چیز کے شر سے جو اس نے پیدا کی ہے۔

آیت نمبر 1 کا عام طور پر ترجمہ کچھ یوں کیا جاتا ہے:

''کہو! میں پناہ مانگتا ہوں صبح کے رب کی''۔

یہاں جس لفظ کا معنی ''صبح'' کیا گیا ہے وہ ''فلق'' ہے جو کہ زیادہ گہرے غور و فکر کا متقاضی ہے۔ فلق کا معنی کسی چیز کو پھاڑنا اور اس کے ایک ٹکڑے کو دوسرے سے الگ کرنا ہیں (مفردات)۔

صبح کو بھی فلق اسی لئے کہا گیا ہے کہ وہ رات کے اندھیرے کو پھاڑ کر نمودار ہوتی ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

''الفلق'' کا ترجمہ عام طور پر لوگوں نے صبح کیا ہے لیکن اس کا اصل معنی پھاڑنے کے ہیں۔ صبح چونکہ شب کے پردے کو چاک کرکے نمودار ہوتی ہے اس وجہ سے اس پر بھی اس کا اطلاق ہوا۔ لیکن پھاڑ کر نمودار ہونے والی چیز صرف صبح ہی نہیں ہے، ہر چیز کسی نہ کسی چیز کے اندر سے اُس کو چاک کرکے ہی نمودار ہوتی ہے......'' (تدبر القرآن زیر نظر آیت)۔

مولانا نے خود آیت کا یہ ترجمہ کیا ہے:

''کہہ! میں پناہ مانگتا ہوں نمودار کرنے والے خدا کی'' (ایضاً)

امام فخر الدین رازی نے بڑی اہم بحث کے بعد شگافتہ کرکے پیدا کرنے کے معنی ہی کو زیادہ صحیح (اقرب) کہا ہے۔ (تفسیر کبیر زیر نظر آیت)

اس مفہوم کی تائید بعد والی آیت سے بھی ہوتی ہے جس میں ہے:

مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ (113:2)

جو کچھ اُس نے پیدا کیا اُس کے شر سے
(ہر اُس چیز کے شر سے جو اس نے پیدا کی ہے)

گویا لفظ "فلق" تخلیقی عمل (Process of Creation) اور تخلیق کے طریقہ (Mechanism of Creation) کو بیان کررہا ہے اور بعد والی آیت تخلیقی عمل کے نتیجے کے اُن پہلوؤں کی طرف اشارہ کررہی ہے جو انسان کے لئے شر اور نقصان کا باعث بن سکتے ہیں۔ دونوں آیتوں کا مجموعی مفہوم کچھ یوں ہوگا:

کہو! میں پناہ مانگتا ہوں شگافتہ کرکے پیدا کرنے والے رب کی، ہر اُس چیز کے شر سے جو اُس نے پیدا کی ہے۔

ممکن ہے کہ ان آیات میں کائنات کی تخلیق کے طریقہ کی طرف اشارہ ہو جسے عظیم دھماکہ یا عظیم انفجار کا نظریہ (Big Bang Theory) کہا جاتا ہے۔

اشاریہ

الف

ب

پ

ت

ج

چ، ح، خ

د، ذ

ر

ز

س، ش، ص، ض

ع، غ

ف، ق

ک، گ

م، ن

و، ہ، ی

قرآن مجید میں کثرت سے کائنات اور اس کے عجائبات کو خالق کائنات کے وجود اور قدرت کی نشانیوں کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اس کا منشاء یہ ہے کہ انسان ان میں غور و فکر کرے اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچے کہ کوئی ہے جو اس کارخانہ قدرت کے پیچھے کارفرما ہے۔

''قرآن کے سائنسی معجزے'' میں اسی نوعیت کی تقریبا 350 آیات کی سائنسی تعبیر و تشریح کی گئی ہے۔

قرآن وہ کتاب ہے جس کی تفسیر خود وقت اور زمانہ کرتا ہے۔ ہر عہد یہ تقاضا کرتا ہے کہ قرآن پاک کو اس عہد کے مسائل و افکار کے تناظر میں سمجھا جائے اور اس کے علوم و معارف کو وقت کی بلند ترین علمی و فکری سطح پر دنیا کے سامنے پیش کیا جائے۔ ''قرآن کے سائنسی معجزے'' میں یہی کام سائنسی اعتبار سے پیش کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر دلدار احمد قادری کیمیا کے پی ایچ ڈی اور معروف اسلامی اسکالر ہیں۔ قرآن و جدید سائنس آپ کی دلچسپی کا موضوع ہے۔ آپ درجن سے زائد کتابیں لکھ چکے ہیں۔ جن میں گیارہویں اور بارہویں جماعتوں کی تھیوری اور پریکٹیکل کی کتب کے علاوہ مندرجہ ذیل کتب شامل ہیں:

- کائنات قرآن اور سائنس
- قرآن اور مظاہر کائنات
- علم جدید اور مذہب
- *The Quran and The Universe*
- *The Quran and Human Evolution*
- *The Quran and Human Embryology*

ڈاکٹر دلدار احمد قادری کے کئی تحقیقی مقالے بین الاقوامی سائنسی مجلوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ آپ کے علمی اور تحقیقی مضامین اخبارات و رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔

Paramount Publishing Enterprise

152/O, Block-2, P. E. C. H. S., Karachi-75400.
Tel: 4310030 Fax: 4553772 E-mail: paramount@cyber.net.pk

Retail Price Rs.300 **ISBN: 969-494-122-9**